گڑیا گھر
ممتاز مفتی

گڑیا گھر

ممتاز مفتی

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بار اوّل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۹۳ء

سویرا
نیلو
نقش
اپنی تین بیٹیوں، جنہوں نے میری تحریروں پر مان کیا،
یُوں مجھے حوصلہ بخشا
اور اپنی بیوی
اقبال بیگم
کے نام
جس نے ہمیشہ مجھے سمجھایا
کہ دیکھ جھوٹی کہانیاں لکھ کر
اپنی عاقبت خراب نہ کر۔

مطبع ۔۔۔ فیروز سنز
مجلد ۔۔۔ 969 0 01112 x

گڑیا گھر

فہرست

کہنے کی باتیں

کچھ اس کتاب، کچھ صاحبِ کتاب کے بارے میں

از مسعود قریشی

تیس سال پہلے چھپنے والی اس کتاب کی بار دگر اشاعت کا ۱۹۹۲ء کے مناظر میں جائزہ لینا ایک عجیب اور الجھا ہوا تجربہ ہے۔

تیس سال تک ممتاز مفتی کی صحبت اور اس کے فن کے سفر کا قریبی مشاہدہ اس پس بینی کو ایک نادر جہت دیتا ہے۔

اس جائزے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ لمحہ حاضر کے تناظر سے مفتی کے بارے میں موجودہ ادراک کی روشنی میں ان افسانوں پر ایک نظر ڈالی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تیس سال کے مشاہدات، ادراک اور مطالعہ کو ذہن سے محو کر کے مراجعتِ زمانی کرتے ہوئے ۱۹۶۱ء کے ذہن سے ان کو دیکھا جائے۔ دوسری صورت طبعی طور پر ناممکن ہے اور پہلی صورت میں بہت الجھاؤ، بہت دشواریاں ہیں۔ ٹھوکریں کھانے کے بہت امکانات ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ صورت موجودہ قارئین کے لئے بہت دلچسپ ہو گی اور ان کے اپنے اندازِ نظر سے ہم آہنگ بھی۔

ممتاز مفتی کا تخلیقی سفر مشاہدے کی سفاک سچائی اور اظہار کی بے باک صداقت کا سفر ہے۔ یہ سفر زندگی کی طرح متنوع ہے۔ اس سفر کی پہلے سے طے شدہ کوئی منزل نہیں۔ پیشگی منزل کا تعین "ازموں" کا جبر ہوتا ہے، ادب کا تقاضا نہیں۔ اس

منزل کا تعین خود ادیب کی بجائے کوئی دوسرا کرے تو یہ سیاسی جبر بن جاتا ہے جسے ادب قبول نہیں کرتا ___ چاہے اسے رہنمائی کا دلفریب نام ہی کیوں نہ دیا جائے۔ ادب کی تخلیق میں ادیب کا نقطۂ نظر تو ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ضمیر کو کسی مسلک کے مبلغ کے حضور گرو نہیں کرتا۔

ممتاز مفتی نے دشنام والزام اور مدح و ستائش سے بے نیاز ہو کر اپنا ادبی سفر طے کیا ہے۔ اس نے صرف اپنے جذبے کی سچائی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ مفتی کے اس ادبی سفر میں ایک مرحلہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ہے قدرت اللہ شہاب سے ملاقات اور قربت جو نیاز مندی بلکہ عقیدت کی حد تک پہنچی۔

ممتاز مفتی کی شہاب سے ملاقات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔ مفتی کی سوچ اور فن پر شہاب سے نیاز مندی کا کیا اثر پڑا، یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس پر بہت رنگ آمیزیاں کی ہیں اور سلسلۂ شہابیہ کی ترکیب ایجاد کی جس میں مفتی اور اشفاق احمد کو نرغے میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں کو کافی قریب سے دیکھنے جانچنے کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے حوالے سے اس نظریئے میں زیبِ داستاں زیادہ ہے، حقیقت کم۔ میری اس بات کا تصوف اور روحانیت کے شعبے سے کوئی تعلق نہیں۔ بعد از ملاقاتِ شہاب ممتاز مفتی نے جو کچھ لکھا، وہ اس کی قبل از ملاقاتِ شہاب کی تخلیقات سے کچھ مختلف نہیں۔ وہی کاٹ دار فقرے، وہی نادر پیرایہ اظہار، وہی حجابوں میں ڈھکی چھپی حقیقتوں کا بیان، وہی ظاہر داری کے نقابوں کی پردہ دری۔

جو باتیں لوگ شہاب کے اثر کے طور پر مفتی کے رویوں میں ڈھونڈتے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ سے موجود تھیں۔ "لبیک" میں بھی منطقی حاجی ہر بات خرد کی کسوٹی پر پرکھتا ہے لیکن بارش شروع ہوتے ہی دیوانہ وار میزابِ رحمت کے نیچے لوگوں کو دھکے دیتا پہنچ جاتا ہے۔ ایک حاجی وہاں بھی کھڑکیوں میں سے تانک جھانک کرتا ہے اور دوسرے کو کسی کھڑکی کا احساس ہی نہیں۔ ہاں شہاب کی ذات سے عقیدت اس کی

ذاتی زندگی کا ایک اہم باب ہے۔ شہاب کے بارے میں مفتی نے اب تک جو کچھ لکھا ہے یا اپنی آنے والی کتاب "الکھ نگری" میں لکھ رہا ہے، وہ اس عقیدت کا رنگ ضرور لئے ہوئے ہے۔ یہ تحریریں اس کی ادبی تخلیقات کا حصہ ضرور ہیں لیکن اس کے عمومی ادبی رویوں پر اثر انداز ہیں۔ یہ ایک الگ باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں قبل از شہاب اور بعد از شہاب کی بحث مفتی کی ادبی زندگی سے لاتعلق ہے۔

زیر نظر مجموعے میں ۱۴ افسانے شامل ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ دولت، اقتدار، اختیار، رسوم اور تہذیب کا غازہ کھرچ کر انسانوں کی بنیادی فطرت کو اپنے اصلی روپ میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں طبقاتی تقسیم سے قطع نظر مرد کی مردانہ خصوصیات اور عورت کی نسوانیت کو اجاگر کیا گیا ہے، دوسرے تمام نمائشی تکلّفات کا ملمع اتار کر۔

مفتی کسی خاص فلسفۂ حیات کا پرچار نہیں کرتا۔ اس کا فن "اچھے" اور "برے" یا نیک اور بد کے فتوؤں سے ماورا ہے۔ وہ صرف مشاہدہ کرتا ہے اور اپنے مشاہدے کے نتائج کو خلوص سے کرداروں کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اسے لیبلوں سے نہیں، حقیقتوں سے غرض ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات سے اس نے یہ سیکھا ہے کہ انسان اپنی فطرت اور اصلیت سے جتنا دور ہو جائے گا، اتنا ہی وہ جوہرِ انسانیت سے عاری ہوتا جائے گا۔

اس مجموعے کے پہلے افسانے "گڑیا گھر" میں فرخ اور اس کے ڈرائیور نوازش کا تقابل مردانہ صفات کی رو سے کیا گیا ہے جس میں جیت نوازش کی ہوتی ہے۔ "چار گوٹ" میں نمائشی تہذیب کے ہاتھوں زار و زبوں طبقے اور اپنی غربت میں مست قہقہے لگاتے اور الابلا کھا کر بھی تندرست و توانا رہنے والے طبقوں کا انسانیت کے حوالے سے موازنہ کیا گیا ہے۔

ممتاز مفتی کے افسانوں کا موضوع جنس ہے، جنسی لذتیت اور ہوس کاری

نہیں۔ وہ جنسی کشش کا تجزیہ کرتا ہے، جنسی اختلاط کی تفصیلات و جزئیات بیان نہیں کرتا۔ اس کے کردار جوہرِ مردانگی یا جوہرِ نسوانیت سے متاثر ہوتے ہیں لیکن وہ ان کے ملاپ کی عریاں تصویریں نہیں کھینچتا۔ یہ بات اسے منٹو اور عصمت سے ممیّز کرتی ہے۔

اس کا دوسرا محبوب موضوع انسانی فطرت کا تضاد ہے۔ وہ مختلف اشخاص کے متضاد عناصر کا تقابل بھی کرتا ہے۔ اس کے افسانوں میں کرائسس اور نقطہ عروج کہانی کے پلاٹ نہیں بلکہ کرداروں کے تضادات کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کی ایسی رنگارنگی اس کے کرداروں میں جھلکتی ہے اور ان کو ٹائپ بنانے کے بجائے انہیں زندہ اور منفرد افراد بناتی ہے۔

"بابا کھونٹ والا" میں خالد کا باپ آغا عظیم اللہ کھونٹ والے بابا سے ملنے جاتا ہے تو راستے میں پیلی بائی کے چوبارے کے سامنے اپنے بیٹے کی کار کھڑی دیکھ کر طیش کے عالم میں چوبارے میں چلا جاتا ہے۔ خالد تو وہاں سے ہمیشہ کے لئے بھاگ نکلتا ہے لیکن بڑے میاں اب روز بائی جی کے چوبارے پر جاتے ہیں اور اس سے تقاضہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے بیٹے سے قطع تعلق کر لے حالانکہ اب خالد کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ قطع تعلقی کے اس انوکھے تعلق پر کھونٹ والا بابا قہقہے لگاتا ہے۔

"گھر کی عزت" میں ریحانہ جب اپنی والدہ کی محبت میں ریحانہ سے محبت کرنے والے کھاتے پیتے گھرانے کے ایک نوجوان کے ساتھ فرار ہونے سے انکار کر دیتی ہے تو ماں پر غم کی بجلی ٹوٹ پڑتی ہے۔

مفتی کے افسانوں کی ایک خصوصیت اس کا انوکھا اندازِ نگارش ہے۔ وہ نادر تشبیہات کا رسیا ہے۔ انوکھے انداز میں بات کہنے کا دلدادہ ہے۔ کہانی کا پلاٹ قاری کو اپنی گرفت میں لے، نہ لے، لیکن وہ اس کے پیرایۂ تحریر کے طلسم سے نہیں نکل سکتا۔ مثلاً "گھر کی عزت" میں جب پہلی دفعہ ریحانہ کو محبت نامہ ملا تو وہ اس میں درج مضحکہ خیز باتوں پر ہنس پڑی۔ اس سلسلے میں مفتی لکھتا ہے:

"محبت بھرے خطوں کو آپ جانتے ہی ہیں۔ چاہے ان پر کوئی ہنسے یا غصے سے آگ بگولا ہو جائے، ان کے سحر سے بچ نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ محبت بھرے خطوط مکڑی کی طرح جال بنتے رہتے ہیں۔ پھر جب ان کا جال مضبوط ہو جاتا ہے تو وہ رسی کھینچ لیتے ہیں اور ہنسی آنسوؤں میں بدل جاتی ہے۔"

مفتی کا بیان بصری خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ نہ صرف کرداروں کی حرکات و سکنات بلکہ ان کی سوچ کی تصویریں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ وہ شعوری سوچ اور لاشعوری جذبات و احساسات کی چابک دستی سے عکاسی کرتا ہے۔
۱۹۹۲ء میں ۵۵ ــ ۱۹۵۱ء کے ممتاز مفتی کے فن کی یہ جھلکیاں قارئین کے لئے بہت دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

مسعود قریشی
اسلام آباد
جولائی ۱۹۹۲ء

پیش لفظ

گڑیا گھر میرے افسانوں کا پانچواں مجموعہ ہے۔

پہلی بار اسے داستان گو پبلشرز نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اشفاق احمد کو طباعت کا شوق چرایا تھا۔ اشفاق احمد نے پہلے ایک مصوّر ماہنامہ داستان گو شائع کرنا شروع کیا۔

اس پرچے میں اشفاق احمد نے رنگ چھاپنے کے نئے نئے تجربات کئے۔

اشفاق احمد کی عادت ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالے، اس کے اندر گھس جاتا ہے اور جب تک اس میں پوری دسترس حاصل نہ کر لے، چھوڑتا نہیں۔

طباعت کے شوق کی تکمیل کے لئے اشفاق احمد نے چھپائی کی مشینیں امپورٹ کیں اور انہیں اپنے گھر میں لگوا لیا۔

جہاں تک طباعت کے فن کا تعلق ہے، اشفاق احمد نے اس میں بڑی کامیابی حاصل کی لیکن اشفاق احمد کاروباری صلاحیت میں کورا ہے، اس لئے وہ کامیاب پبلشر نہ بن سکا۔

۱۹۶۱ء میں اشفاق احمد نے علی پور کا ایلی شائع کیا۔ ۱۹۶۲ء میں اس نے گڑیا گھر شائع کیا لیکن وہ اپنی مطبوعات بیچ نہ سکا۔ لہٰذا پبلشنگ کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ مشینیں بک گئیں۔

دیر تک یہ مجموعہ پریشان اوراق کی شکل میں اشفاق کے گھر پڑا رہا۔

اشفاق احمد نے رائیٹرز گلڈ سے معاہدہ کر کے گڑیا گھر کو بوریوں میں بند کر کے

کراچی بھجوا دیا۔ دو ایک سال یہ مجموعہ کراچی رائیٹرز گلڈ کے سٹور روم میں پڑا رہا۔ پھر جب طفیل احمد گلڈ کے سیکرٹری جنرل بنے تو انہوں نے اس مجموعے کو بوریوں سے نکالا۔ کتاب کی شکل دی اور گلڈ کی پرنٹ لائن دے کر ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا۔ بہر حال اس مجموعے کی تقسیم ادھوری رہی۔

اب ۲۷ سال کے بعد فیروز سنز لاہور اس مجموعے کی دوسری ایڈیشن پیش کر رہے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، میری افسانہ نگاری کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک چلا۔ اس دوران میں میرے تین مجموعے شائع ہوئے۔ ان مجموعوں کی اشاعت صرف چودھری برکت علی کی وجہ سے عمل میں آئی۔

تقسیم کے بعد چودھری برکت علی ایک طویل بیماری کے بعد انتقال کر گئے۔

تقسیم کے بعد میں بمبئی سے لاہور آ گیا اور چار ایک سال تلاشِ روزگار میں سرگرداں رہا۔

۱۹۵۵ء میں مَیں ایک ناقابلِ فراموش روحانی مشاہدے سے دوچار ہوا۔ اس مشاہدے نے میرے ذہن کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔ ۵۰ سال کے عرصے میں مَیں نے جو ذہنی سپر سٹرکچر بنا رکھا تھا، وہ ریت کے گھروندے کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ میرے مفروضے، فلسفے، نظریئے جن کے زور پر مَیں لکھا کرتا تھا، صابون کے بلبلوں کی طرح اڑ گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طویل عرصے تک افسانہ نویسی کا شغل بند رہا۔ یہ میری افسانہ نویسی کا دوسرا دور تھا جس میں دو مجموعے شائع ہوئے، اسمارائیں جسے مکتبۂ جدید کے چودھری رشید احمد نے شائع کیا اور گڑیا گھر۔

۱۹۷۴ء میں مَیں نے از سرِ نو افسانہ نویسی کی طرف رجوع کیا۔

ممتاز مفتی

جولائی ۱۹۹۲ء

گُڑیا گھر

سفید بنگلے پر ہُو کا عالم طاری ہے بنگلے کے نفیس سازوسامان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا ۔ ریشمیں پردے جوں کے توں لٹکے ہوئے ہیں ۔ غالیچے ویسے ہی شوخ رنگ ہیں بنگلے کے افراد حسبِ معمول اس شو کیس میں کلدار گڑیوں کی طرح چلتے پھرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی حرکات میں وہ روانی نہیں رہی ان کی مسکراہٹوں میں وہ نمائشی چمک نہیں رہی ۔ ان کے جملے تو وہی ہیں وہی چمکدار جملے۔لیکن ان میں وہ شوخی نہیں رہی ۔ ایسے معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے کوئی افتاد آپڑی ہو جیسے سفید بنگلہ شیش محل کے محرابوں سے لڑھک کر غلام گردش میں آگرا ہو ۔

شام ہوتے ہی سفید بنگلے کے مکینوں پر تشویش کا عالم چھا جاتا ہے ۔ رات کو وہ ہر آہٹ پر گھبرا کر اٹھ بیٹھتے ہیں ۔ اور ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں ۔ لیکن اگر آپ ان میں سے کسی سے پوچھئے تو وہ حیرانی سے آپ کی طرف دیکھے گا اور بس ۔

فوضیہ سے پوچھئے تو اس کی آنکھیں دھندلا جائیں گی اور وہ دیوانوں کی طرح آپ کی طرف دیکھنے لگے گی ۔ فوضیہ بیچاری بتائے بھی کیا ۔ اسے کچھ معلوم بھی ہو ۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو نوبت اس حد تک نہ پہنچتی ۔ اسے تو ابتدا ہی سے ایسے ریشمیں ماحول میں پالا گیا تھا جہاں بات معلوم ہی نہیں ہو سکتی ۔ اس سے کیا پوچھنا اور پھر وہ بے چاری تو بستر پر پڑی رہتی ہے نقاہت کی وجہ سے رنگ زرد ہو چکا ہے ۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے ہیں اور گویا وہ اپنے آپ سے جا چکی ہے ۔

نوازش سے پوچھئے تو وہ مونچھ مروڑنے لگے گا۔ اس کی آنکھ میں میلی سی چمک لہرائے گی ۔ دفعتاً اپنی حیثیت بھول کر اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے

لگے گا ۔ لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی بات کا جواب نہیں دے گا اور جواب میں کچھ کہے گا بھی تو اسے اصل بات سے کوئی تعلق نہ ہو گا ۔ "پھر کیا ہوا" وہ مسکرائے گا "رات کو جاگنا پڑتا ہے تو کیا ہوا ۔ اپنے لئے کچھ مشکل نہیں ۔ ہم نے تو راتیں آنکھوں میں گزاردی ہیں ۔ ہاں کیا پوچھتے ہو اپنی بات ۔ یہ بھی کوئی بات ہے ۔ ہُنہ"

فوضیہ کی ماں بڑی بیگم سے پوچھئے تو وہ یوں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی جیسے کوئی گرا ہوا شخص فوراً اٹھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ پائے ۔ "بات کیا ہے" بڑی بیگم درشتی سے کہے گی "شکر ہے اس کی جان بچ گئی" ۔

ڈاکٹر سے پوچھئے تو وہ جواب دے گا "ول ول شی از آل رائٹ معمولی شاک کا کیس ہے ، ٹھیک ہو جائے گا" ۔ اور سفید بنگلے کے نوکروں سے پوچھئے ۔ مگر ان سے کیا پوچھنا وہ تو نوکر ٹھہرے ۔ بیچارے خواہ مخواہ سہمے ہوئے ہیں ۔ خواہ مخواہ ۔

آدھی رات کے وقت سفید بنگلے کا وہ پُروقار سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور بیگم کی خواب گاہ سے چیخوں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں ۔ ننگی چیخیں ۔ جیسے ریشم میں ملبوس گڑیا کپڑے پھاڑ کر مخملی کیس سے باہر نکل آئی ہو ۔ اوّل تو شریف گھرانے کی بیگم کی خواب گاہ سے آدھی رات کے وقت چیخوں کا سنائی دینا اور پھر بیگم کا نوازش کو پکارنا ۔ نوازش ایک معمولی موٹر ڈرائیور ۔ "نوازش ، بیگم کی آواز بنگلے میں یوں گونجتی ہے جیسے وہ پکار رہی ہو ، منتیں کر رہی ہو ۔

فوضیہ کی چیخیں سن کر بڑی بیگم جاگ پڑی ہے "آج پھر" اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور دل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے نوازش سامنے کھڑا مونچھ مروڑ رہا ہو ۔ نوازش ایک معمولی خدمت گزار اس کے روبرو کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے ۔ اف آپا کی چیخوں کی آواز سن کر آسیہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ گھبرا کر پھر سے آنکھیں بند کر کے پڑ جاتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو ۔ جیسے کوئی چیخ

ہی نہ رہا ہو ۔

نرس بیگم کی چیخ سن کر ایک نظر اس کی طرف دیکھتی ہے اور پھر احتیاط سے کاغذ کی سلپ کی نشانی رکھ کر ناول کو بند کر دیتی ہے ۔ پھر پنجوں کے بل چل کر خوابگاہ کے دروازے کی چٹخنی کھول کر واپس کرسی پر آبیٹھتی ہے اور یوں مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہے جیسے بیگم کی چیخ بھری پکار ایک معمولی سی بات ہو ۔

بیگم کی چیخوں کی آواز سن کر نوازش پہلے تو گھبرا کر جاگ پڑتا ہے ۔ پھر آنکھیں ملے بغیر مسکرانا شروع کر دیتا ہے ۔ پھر وہ اپنا اوورکوٹ کھونٹی سے اتار کر اپنے چوڑے شانوں پر ڈال لیتا ہے اور مونچھ مروڑتا ہوا بیگم کی خواب گاہ کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چل پڑتا ہے ۔

خواب گاہ میں داخل ہو کر وہ شانِ استغنا سے بیگم کی چار پائی کے قریب کھڑا ہو کر کھرج آواز میں کہتا ہے "بیگم صاحبہ کچھ فکر نہ کرو ۔ نوازش تمہارے پاس ہے' یہ کہتے ہوئے وہ مونچھ مروڑنے لگتا ہے اور اس کی آنکھوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے ہیں ۔ نوازش کی آواز سن کر بیگم کی چیخیں بند ہو جاتی ہیں ۔ آواز بیٹھ جاتی ہے اور وہ زیر لب کہتی ہے ۔ "نوازش وہ آرہے ہیں ۔ وہ نوازش وہ" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے "پڑی رہو بیگم پڑی رہو" نوازش تحکمانہ انداز سے کہتا ہے 'جب نوازش یہاں موجود ہے کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔' "نوازش نوازش' بیگم کی آواز مدہم پڑجاتی ہے جیسے کوئی پرائیویٹ بات کہہ رہی ہو ۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور سفید بنگلے پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے ۔

نوازش ایک نظر بیگم کی طرف دیکھتا ہے اس وقت اس کی آنکھوں میں دو شعلے روشن ہوتے ہیں ۔ پھر وہ پر وقار انداز سے کمرے سے باہر نکل جاتا ہے اور نرس چٹخنی بند کر کے پھر سے "فارایور ایمبر" کے مطالعے میں کھو جاتی ہے ۔

ساتھ والے کمرے میں آسیہ زور سے آنکھیں بند کر لیتی ہے اور پہلو بدلنے لگتی ہے اور بڑی بیگم ایک لمبی آہ بھر کر نہ جانے کس سوچ میں پڑ جاتی ہے ۔ اور دور کتے رونے لگتے ہیں جیسے وہ واقعہ کی اہمیّت سے واقف ہوں ۔ اور نوازش

اپنے کمرے میں پہنچ کر لحاف میں بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیتا ہے اور اسے مٹھی میں دبا کر حقّے کی طرح کش بھرنے لگتا ہے بار بار چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے ان جانے میں گنگناتا ہے ۔ 'اب کون تجھے سمجھائے'۔

نوازش نے کبھی نہیں سوچا کہ بیگم صاحبہ رات کو ڈر کر چیخیں کیوں مارتی ہے اور خاص طور پر اس کا نام لے کر کیوں پکارتی ہے اور پھر جب وہ بیگم صاحبہ کی خواب گاہ میں جاکر اسے تسلی دیتا ہے تو اسکی آواز سن کر کیوں مطمئن ہو کر سو جاتی ہے ۔ وہ اس واقعہ کو خصوصی اہمیّت نہیں دیتا بلکہ اب تو وہ اسے ایک دلچسپ کھیل سمجھنے لگا ہے اگر چہ اس کھیل میں وہ اپنے پارٹ کو بے حد اہم سمجھتا ہے ۔ اہم تو سمجھنا ہی ہوا کیونکہ بیگم صاحبہ پر کسی اور کی آواز کا اثر نہیں ہوتا بلکہ اس کی دیوانگی اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ البتہ جب پہلی مرتبہ رات کو بیگم نے چیخیں ماری تھیں تو وہ گھبرا گیا تھا اور یوں بے تحاشا خواب گاہ کی طرف بھاگا تھا جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو ۔ لیکن اب اسے معلوم ہے کہ اس کی آواز سن کر بیگم کا ڈر دور ہو جائے گا ۔ جبھی تو بیگم کے سامنے جا کر اس کی آواز میں تحکمانہ لہجہ پیدا ہو جاتا ہے اور خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ ان جانے میں مونچھ مروڑنے لگتا ہے ۔

اس بات کے متعلق سفید بنگلے کے کسی فرد نے بھی نہیں سوچا ۔ وہ سب تو گھبرائے ہوئے ہیں ۔ البتہ ڈاکٹر نے اس بات پر بہت غور کیا تھا ۔ اور غور خوض کرنے کے بعد اعلان کر دیا تھا کہ اس سانحہ سے بیگم کے ذہن کو جھٹکا لگا ہے اور ابھی وہ شاک کی حالت میں ہے ۔ آپ جانتے ہیں ایک بار ڈاکٹر کچھ سوچ لے تو اس کے لئے مزید سوچنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب روزانہ آکر مریضہ کو دیکھتے ہیں ۔ اس کی نبض ٹٹولتے ہیں زبان کا رنگ دیکھتے ہیں ۔ ٹوٹیاں لگاتے ہیں ۔ وہ ایک سوال پوچھتے ہیں اور پھر ٹیکہ لگا کر نرس کو ہدایات دینے کے بعد اپنا بکس اٹھا کر باہر نکل جاتے ہیں ۔

باہر برآمدے میں بڑی بیگم ، آسیہ اور امجد ان کے انتظار میں کھڑے ہوتے ہیں 'ڈاکٹر صاحب' بڑی بیگم انہیں دیکھ کر کہتی ہیں "آج پھر ڈاکٹر صاحب" اور آسیہ

خوف سے آنکھیں جھپکنے لگتی ہے ۔

'ہوں' ڈاکٹر صاحب یوں سوچ میں پڑ جاتے ہیں جیسے اس واقعہ کا پھر سے جائزہ لے رہے ہوں ۔ ایک ساعت کے بعد وہ سر اٹھاتے ہیں ۔ 'ٹھیک ہو جائیگا ۔ ٹھیک ہو جائے گا ۔ گھبرائیے نہیں ۔ ابھی شاک کا اثر نہیں گیا ۔ میں کل پھر آؤں گا۔ خدا حافظ'۔

صرف تین کردار اس واقعہ سے متعلق اہم تھے ۔ پاؤڈر سے تھپی ہوئی ایک معصوم گڑیا ایک بے جان کلدار گڈّا اور بالآخر ایک جیتا جاگتا نوکیلی مونچھ والا میلا سا ڈرائیور ۔

گڑیا بالکل ویسی ہی تھی جیسے مال روڈ پر چلتی پھرتی ہوئی پائی جاتی ہیں ۔ وہ پاؤڈر سے اس حد تک تھپی ہوئی تھی جیسے مال روڈ کی گڑیاں ہوتی ہیں ۔ اس کے ہونٹوں پر بھی سرخی کی ایک تہ چڑھی رہتی تاکہ آتے جاتے لوگ انہیں نظر انداز نہ کر سکیں اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ہونٹوں کو سرخ کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے اور راہ چلتے لوگ کیوں اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں ۔ وہ چپ چاپ موٹر سے باہر نکلتی ۔ ایک وقار بھرے انداز سے اِدھر اُدھر دیکھتی راہ چلتوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس کی ناک نفرت سے سکڑتی اور پھر وہ چپ چاپ شاپنگ میں مصروف ہو جاتی اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ سفید چہرے کے پس منظر پر اس کے ہونٹ خطرے کا سرخ نشان بنے ہوئے ہیں اور راہ گیروں کو عورت اور خطرہ دونوں سے دلچسپی ہوتی ہے ۔ وہ سوچتی بھی کیوں ۔ سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی شوہر ، صاحبِ جائداد تھے ۔ بنگلہ تھا ۔ سازوسامان تھا ۔ موٹر تھی ۔ میز پر کھانا خود بخود لگ جاتا تھا ۔ پرس یوں روپے اگلتا جیسے الہ دین کا جن تابع فرمان ہو ۔ اسے تو صرف یہی تکلیف تھی کہ راہ چلتے لوگ اور وہ بھی عام سے لوگ اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتے تھے ۔ پاؤڈر تو وہ صرف اس لئے لگاتی تھی کہ جلد نرم رہے ۔ کاجل کی دہار اس لئے کھینچتی تھی کہ بینائی تیز ہو ۔ اور ہونٹوں پر سُرخی ۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر بات کی وجہ بیان کی جائے ۔ چاہے کسی وجہ سے لگاتی تھی ۔ بس لگاتی تھی ۔ یہ اس کا ذاتی معاملہ

تھا ۔ جس میں دوسروں کو دخل دینے کا حق نہ تھا ۔ مال روڈ کی اس گڑیا کے
دل میں کسی کے خلاف بغض یا نفرت نہیں تھی ۔ الٹا اسے تو ان پر ترس آتا
تھا ۔ اور بازاروں میں گھومنے والے عوام کی حالت پر اسے سچے دل سے افسوس
ہوتا تھا کہ دیکھنے کے علاوہ انہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ۔ کپڑے پہننے کا
ڈھنگ نہیں اور چلنے پھرنے میں ان کی حرکات کس قدر بھدی ہوتی ہیں ۔

سماجی گڑیا ہونے کے علاوہ فطری طور پر بھی ایک گڑیا تھی ۔ سماجی زندگی
نے تو اس پر صرف رنگ و روغن کیا تھا اور جیتے جاگتے میلے عوام سے محفوظ رکھا
تھا ۔ وہ خوبصورت تھی جیسے کہ فطری گڑیاں ہوتی ہیں ۔ مگر وہ خوبصورتی صرف
دیکھنے تک ہی محدود تھی ۔ گڑیا خانے نے اس کے جذبات منجمد کر رکھے تھے ۔
اور اسے ایسی حسین ساکن جھیل بنا دیا تھا جس میں سطحی لہروں کے علاوہ کوئی
مدوجزر پیدا نہیں ہوتی ۔

وہ ایک ایسے شریف گھرانے میں پیدا ہوئی تھی جہاں بہت سی گڑیاں مخملی
کیسوں میں رہتی تھیں ۔ وہ سب مقررہ وقت پر چلتی پھرتیں ۔ مقررہ وقت
پر موزوں باتیں کرتیں مقررہ وقت پر باہر جاتیں ۔ اور مقررہ وقت پر اپنے اپنے
کیسوں میں پڑ کر سو جاتی تھیں ان کی ہر بات مناسب طور پر عمل میں آتی تھی ۔
مناسب اور موزوں فقرے انہیں ازبر کرا دیئے جاتے تھے ۔ اور مناسب اور
موزوں حالات میں وہ انہیں دہرا دیتی تھیں۔

اس گڑیا گھر سے چند قدموں کے فاصلے پر جیتے جاگتے انسان بھی رہتے تھے ۔
مگر اصول کے مطابق ان کی طرف غور سے دیکھنا مناسب نہ تھا ۔ بیرا لوگ ۔
چوکیدار لوگ اور خدمت گار کیا اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں غور سے دیکھا
جائے ۔ ان سے تو صرف خدمت کروائی جا سکتی ہے ۔ نوکروں کو چھوڑیئے وہاں
تو عزیز و اقارب کو بھی غور سے دیکھنا گناہ تھا ۔ غور سے دیکھنا تو ایک غیر مہذبانہ
فعل ہے جو دخل درمعقولات کے مترادف ہے ۔ گڑیا گھر میں تو دیکھنے کی بجائے
دکھائی دینے کو زیادہ اہمیّت حاصل تھی اور وہ سب اس کوشش میں لگے رہتے
تھے کہ اچھے اور پیارے نظر آئیں ۔

بچپن ہی سے فوضیہ کو گڑیا گھر کے اصولوں کی پوری تعلیم دی گئی تھی ۔
صبح سویرے ہی اسے نہلایا دھلایا جاتا ۔ اور اس کے بال بنا کر ربن لگا کر منہ پر
پاؤڈر سرخی جما کر تیار کر دیا جاتا ۔ پھر وہ اپنے جیسی ایک گلابی گڑیا بغل میں دبا کر
باغ میں جا بیٹھتی۔ زمین پر نہیں بچّہ گاڑی میں ۔ یا بید کی اس کرسی پر جو اس
کے لئے بنائی گئی تھی ۔ زمین پر تو خدمت گاروں کے بچے کھیلا کرتے تھے ۔
پھر اس زمین پر وہ کیسے بیٹھ سکتی تھی ۔ البتہ تیتری کی طرح وہ باغ میں اِدھر
اُدھر دوڑ سکتی تھی ۔ یا مہمانوں کے آنے پر ڈرائینگ روم میں مور کی طرح چل
پھر سکتی تھی ۔

ڈرائینگ روم کے لئے اسے چند ایک خوبصورت جملے سکھادئے گئے تھے
مزاج اچھے ہیں ۔ تھینکیو ۔ آپ کو نظم سناؤں ۔ کیسے اچھے ہیں آپ ۔ ڈیڈی ۔
ممی اور شب بخیر ۔ جیسے خوبصورت جملے ۔ ڈرائینگ روم پر ہی کیا موقوف تھا ۔
ان کا تو سارا گھر ایک ڈرائینگ روم تھا ۔ سارا دن وہ ڈرائنگ روم میں رہتی اور
پھر رات پڑتی تو وہیں ایک کونے میں اسے ایک ریشمیں کیس میں احتیاط سے رکھ
دیا جاتا ۔

پھر وہ جوان ہو گئی ۔ لیکن اس کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق پیدا نہ ہوا ۔
اگرچہ جسم میں عجیب و غریب قسم کے اضافے ہو گئے ۔ سیدھے خطوط گھوم کر
گولائیاں اختیار کر گئے ۔ اعضا پھول گئے ۔ گندمی رنگ پر سفیدی نے یورش
کر دی اور سفیدی میں سرخی کی جھلک پیدا ہو گئی ۔ بال بنانے کا سٹائل بدل
گیا ۔ کپڑوں کی قطع وضع بالکل تبدیل ہو گئی ۔ ان سکّہ بند جملوں میں اضافہ ہو
گیا جو گفتگو میں استعمال کئے جاتے تھے ۔ وہ ڈرائینگ روم بہت وسیع ہو گیا
اور اس میں بہت سے اور گھرانے بھی شامل ہو گئے اور بہت سے نئے اُجلے
گڈے اس کے حلقے میں داخل ہو گئے اس کی مسکراہٹوں میں بے پناہ اضافہ
ہوگیا ۔ اس کی حرکات میں لَے پیدا ہو گئی ۔ لیکن ان تمام فروعی باتوں کے
باوجود اس کی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوئی ۔ خوشنما کنول کے
پھولوں کے علاوہ جو اس نیلی جھیل میں اگ آئے تھے اس کی زندگی وہی ساکن

جھیل ہی رہی ۔ گویا وہ کسی رنگدار کلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر ہو ۔

پھر جلد ہی ایک نیا کلدار گڈّا ان کے ڈرائینگ روم میں آپہنچا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا ۔ اس کی نگاہوں سے فوضیہ کو ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذّت بھی محسوس ہوتی ۔ پھر اس گڈے نے تنہائی میں اس سے عجیب باتیں کرنی شروع کیں ۔ ایسے جملے فوضیہ نے ڈرائینگ روم میں کبھی نہ سنے تھے ۔ اور اُس نے محسوس کیا جیسے اس کلدار گڈے کے آنے سے ایک نئی انوکھی کھڑکی کھل گئی ہو جس سے ایک انوکھی دنیا کی جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں ۔

اگر چند ماہ کے اندر اندر فوضیہ کی فرخ سے شادی نہ ہو جاتی اور اسے مزید کلدار گڈوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ نہ تو فرخ کی باتوں میں کوئی انوکھی خصوصیت تھی اور نہ اس کی نگاہوں میں کوئی انفرادیت ۔ اس کے وہ جملے بظاہر نئے ہونے کے باوجود بے حد پرانے اور سکّہ بند تھے اور اس کی نگاہیں بھی صرف دکھانے کی تھیں ۔ دیکھنے کی نہیں ۔ جنہیں فرخ نے مسلسل مشق سے اپنا رکھا تھا ۔ لیکن فوضیہ کو ان تفصیلات کے متعلق کچھ معلوم نہ ہوا ۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ انوکھے پن کا وہ سراب درحقیقت اس لیے تھا کہ اس کی اپنی زندگی میں نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی ۔ لہروں کی سی وہ حرکت جو وہ محسوس کرنے لگی تھی ۔ محض سطحی تھی ۔ اگر فرخ کی جگہ کوئی اور گڈا ان دنوں اس سے آملتا تو بھی فوضیہ کے احساسات وہی ہوتے ۔

شادی کے بعد بھی فوضیہ کی زندگی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا کیونکہ وہ ایک گڑیا گھر سے نکل کر دوسرے میں چلی گئی ۔ جہاں ویسے ہی ریشمیں پردے لٹک رہے تھے ۔ ویسے ہی شوکیس رکھے ہوئے تھے ۔ ویسا ہی باغیچہ تھا اور ویسے ہی لوگ تھے بلکہ شادی کے بعد تو وہ بالکل ہی گڑیا بن کر رہ گئی ۔ اس کے رکھوالوں میں فرخ کا اضافہ ہو گیا جو صبح شام اس کے لئے دروازے کھولتا ۔ کرسیاں کھینچتا ۔ جگہ بناتا ، کوٹ پہناتا ، اس کا پرس اٹھاتا ۔ اور مسکرا کر ڈارلنگ کہنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ۔ اس کے علاوہ اب وہ بیگم فوضیہ بن گئی تھی ۔ گو فرخ اُسے فِزی کہا کرتا تھا اور وہ اپنی فِزی کو یوں رکھتا جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی

ہو اور اگر احتیاط نہ کی تو ٹوٹ جائے گی ۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زیادہ احتیاط سے ٹوٹنے کی صلاحیت اور بڑھ جاتی ہے ۔

فرخ کے گھر میں پہلی مرتبہ فوضیہ نے نوازش کو دیکھا ۔ لیکن اس کے لئے تو وہ محض شوفر تھا نوازش نہیں ۔ اس نے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا اور اسے اس بات کا علم نہ ہوا تھا کہ وہ جسم کا دبلا پتلا ہے اس کا قد بے حد موزوں ہے ، چھاتی چوڑی ہے اور اس کی نوکیلی مونچھیں اور متبسّم آنکھیں بے حد شریر ہیں ۔

عام طور پر فوضیہ کو نوازش سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی ۔ کیونکہ ہر وقت فرخ خود وہاں موجود ہوتا تھا البتہ جب کبھی اسے جائداد کے انتظامات کے سلسلے میں کراچی جانا پڑتا اور فوضیہ سفید بنگلے میں اکیلی رہ جاتی تو اسے نوازش کو بلانا پڑتا تھا ۔ باہر 'پورچ' میں پنجوں کے بل کھڑے اسے چلّاتے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا جیسے کوئی پالتو کوئل توہو توہو کی رٹ لگا رہی ہو ۔

نوازش اس کی آواز سن کر اطمینان سے سگریٹ کے چند آخری کش لگاتا اور پھر اوور کوٹ شانوں پر ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا بیگم صاحبہ کی طرف دیکھے بغیر سیدھا گیراج کی طرف چل دیتا ۔ اس نے کبھی بیگم سے پوچھنے کی تکلیف نہ کی تھی ۔ "کیا حکم ہے حضور" نہ ہی کبھی اس نے اسے حضور کہا تھا ۔ گیراج سے گاڑی نکال کر وہ 'پورچ' میں لا کھڑا کرتا اور پھر چپ چاپ سگریٹ پیتے ہوئے انتظار کرتا ۔

نوازش فطری طور پر موٹر ڈرائیور تھا اس کے کردار میں استغنا کا عنصر حاوی تھا ۔ چلتا یوں تھا جیسے بادلوں کا دیوتا زمین پر آگیا ہو یوں موٹر چلاتا تھا جیسے وہ اس کے ہاتھوں کا ایک کھلونا ہے حرکت اور رفتار کے سلسلے میں اس کی ذہنیت خانہ بدوش کی سی تھی ۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ وہ بیگم یا صاحب کا ڈرائیور ہے اس کے بر عکس وہ سمجھتا تھا کہ وہ موٹر کا ڈرائیور ہے جو اس کے اشاروں پر چلتی ہے ۔

جبھی تو نوازش کی شخصیت میں "جی حضوری" جھلک تک نہ تھی ۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت چمک لہراتی ۔ ہونٹوں پر ایک فلمی دھن کھیلتی ۔ اور گردن کے زاویے سے لاپروائی نمایاں رہتی ۔ اس نے کبھی بیگم کو غور سے نہ دیکھا تھا

اور نہ اسے اہمیّت دی تھی ۔ اس کے نزدیک وہ عورت نہیں بلکہ صرف صاحبہ تھی ۔ اس کی طرف دیکھ کر اس کی آنکھوں میں کبھی وہ مسکراہٹ نہ چمکی تھی جو عورتوں کو دیکھ کر آپ ہی آپ اس کی آنکھوں میں جھلک آتی تھی ۔

ممکن ہے فوضیہ نے دل میں شعوری طور پر اس کا اعتراف کئے بغیر نوازش کی بے پروائی کو محسوس کیا ہو ۔ مگر اس نے کبھی اس کا اظہار نہ کیا تھا ۔ ایک نوکر کے متعلق سوچنا اس کے نزدیک مناسب نہ تھا ۔ صرف ایک بار اس نے نوازش کے خلاف غصّہ محسوس کیا تھا ۔ اس روز اس کے احساسات مجروح ہو گئے تھے ۔ جیسے اس کی توہین ہوگئی ہو اور وہ آدھ گھنٹے تک بیٹھی بل کھاتی رہی تھی ۔

ان دنوں فوضیہ نے موٹر چلانے کی مشق شروع کر رکھی تھی ۔ اس روز ایک ویران سڑک پر خود موٹر چلارہی تھی ۔ ساتھ والی سیٹ پر نوازش بیٹھا اپنی ہی دھن میں مونچھ مروڑ رہا تھا ۔ موڑ پر ایک تانگے کے آ جانے سے دفعتاً فوضیہ کے ہاتھ کانپے موٹر نے جھٹکا کھایا ۔ فوراً دو بھورے بھدّے بازو اس کے گرد حائل ہو گئے اور اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر نوازش کے بازوؤں کا بوجھ پڑگیا اور اس کا جسم گرفت میں آگیا ۔ "بیگم صاحبہ" نوازش نے اسے ڈانٹا ۔ اور دھکا دے کر فوضیہ کو پرے دروازے میں دھکیل دیا اور خود اس کی جگہ لے لی اور بات کئے بغیر موٹر چلانا شروع کر دیا ۔ پھر یہی نہیں وہ یوں بے پروائی سے ایک فلمی دھن گنگنانے لگا ۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہی نہ ہو ۔

وہ پہلا روز تھا جب فوضیہ نے محسوس کیا کہ وہ بیگم صاحبہ نہ تھی بلکہ ایک گڑیا تھی جسے ایک بد تمیز نوکر نے زمین پر پھینک دیا تھا ۔

اس کے بعد فوضیہ نے پہلی مرتبہ غور سے نوازش کی طرف دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ وہ نوازش تھا شوفر نہیں "کتنا بد تہذیب ہے" اس نے دل میں کہا تھا اس کے بعد فوضیہ اس واقعہ کو بھولنے کی کوشش میں کھو گئی تھی ۔

انہیں دنوں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے ۔ ہجوم جلوس کی صورت میں سڑکوں پر گشت لگاتا تھا اور ایک مخصوص فرقے کے خلاف نعرے لگائے جاتے

تھے رات کے وقت دفعتاً شوروغل بلند ہوتا ۔ اشتعال انگیز نعروں کی آوازیں آتیں اور پھر پکڑ لو پکڑ لو کا ہنگامہ برپا ہو جاتا ۔ اگرچہ نہ تو فرخ اس مخصوص فرقے سے تعلق رکھتا تھا اور نہ فوضیہ اور انہیں اس سلسلے میں کوئی خدشہ نہ تھا ۔ پھر بھی ان دونوں کو عوام کی اس بد تمیزی پر غصہ آتا تھا ۔ فرخ شوروغل سن کر غصّے سے بُھوت بن جاتا "جنگلی" وہ دانت بھینچ کر کہتا "انہیں گولی سے ختم کر دینا چاہیئے ۔ بد تمیز دیوانے ۔" لیکن رات کے وقت جب کبھی آوازیں بہت قریب آجاتیں تو وہ غصّے کا اظہار کرنا بھول جاتا اور خوف سے کانپنے لگتا ۔ "یہ کیا حماقت ہے ۔ فزی ادھر آجاؤ ، اور ادھر دیکھو اگر یہ لوگ بنگلے کی طرف آجائیں تو ہم ادھر سے نوکروں کے کوارٹرز میں چلے جائیں گے ۔ وہ جگہ محفوظ ہے سمجھیں بیگم ۔ ان فسادیوں کا کوئی اعتبار نہیں ۔ ان کا مطلب تو لوٹنا ہے لوٹنا ۔ مذہب تو محض دکھلاوا ہے ۔ کمینے" وہ زیرِ لب کہتا کہ کوئی سُن نہ لے فوضیہ حیران ہوتی تھی کہ صبح کے وقت تو فرخ اس قدر غصّہ دکھاتا ہے لیکن رات کو چھپنے کے لئے کونے تلاش کرتا ہے ۔ بہر حال وہ معمولی سی حیرانی محسوس کرتی اور اسے بھول جاتی ۔ کیونکہ اسے خود فسادیوں کے خلاف غصّہ آتا تھا ۔ اس لئے کہ وہ ان اصولوں سے منحرف ہو رہے تھے جن کے تحت فوضیہ کو تربیّت دی گئی تھی ۔

پھر فرخ کو کراچی سے ایک ضروری بلاوا آگیا ۔ جانے سے پہلے اس نے فوضیہ کو ہدایات دیں "فزی ان شر پسندوں کی قطعی پروا نہ کرنا ۔ یہ ذلیل لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ سمجھیں ۔ اگر ضرورت پڑے تو پولیس کو فون کر دینا اور اگر وہ بنگلے میں آداخل ہوں ۔ اوّل تو ان کی جرأت نہیں ہو سکتی ۔ لیکن ایسا ہو ہی جائے تو تم نوکروں کے کوارٹروں میں چلی جانا ۔ میں انہیں ہدایات دے جاؤں گا اور چوکیدار اور شوفر یہیں بنگلے میں کونے والے کمرے میں سوئیں گے ۔ سمجھیں ڈارلنگ۔"

فرخ کے جانے کے بعد اسی رات ہجوم کا شوروغوغا سن کر فوضیہ جاگ پڑی اور گھبرا کر اس نے چلّانا شروع کردیا ۔ 'چوکیدار ، چوکیدار' ہجوم کا شور قریب آتا جا رہا تھا ۔ وہ گھبرا گئی ۔ اس حد تک گھبرا گئی کہ وہ تمام اصول بھول گئی 'نوازش ،

نوازش' اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لے کر اسے پکارا ۔

شانوں پر بے پروائی سے کوٹ ڈالے نوازش ایک شانِ استغنا سے اس کی خوابگاہ میں داخل ہوا ۔ "نوازش ، نوازش" وہ چلّانے لگی "وہ ۔ وہ ۔ وہ آرہے ہیں ۔ وہ" "چلاّؤ نہیں بیگم صاحبہ" اس نے درشتی سے اسے ڈانٹا "اگر انہوں نے آواز سن لی تو' اس کی ڈانٹ سے وہ بوکھلا گئی لیکن ہجوم کا شور قریب تر آچکا تھا ۔ اس لئے اس کا غصّہ ڈر میں تبدیل ہوگیا ۔ "وہ آرہے ہیں ۔ وہ آرہے ہیں" ۔ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی ۔ 'میں پولیس کو فون کرتی ہوں"۔ وہ ٹیلیفون کی طرف بھاگی ۔ نوازش اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا ۔ "کوئی ضرورت نہیں ۔ فون کرنے کی ۔ "لیکن ۔" فوضیہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "چپ کرو بیگم صاحبہ وہ سن لیں گے" ۔ وہ غرّایا ۔ اس ساکن نیلی جھیل میں پہلی مرتبہ ایک طوفان ابل آیا ۔ گویا ایک بہت بڑی بلونی ساکن نیلے پانی کو بلونے لگی تھی ۔

غصّے میں اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑالئے ۔ اورساتھ والی کرسی پر جا بیٹھی ۔ نوازش نے ایک شانِ استغنا سے سگریٹ سلگایا ۔ اسے مٹھی میں تھام کر حقّے کی طرح دو کش لگائے اور پھر کھلے دروازے میں جا کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔

ہجوم سفید بنگلے میں داخل ہوگیا ۔ ان کے نعروں سے خواب گاہ میں رکھی ہوئی چیزیں لرزنے لگیں ۔ نوازش کو دروازے میں بے خبری سے کھڑے دیکھ کر بیگم نے ایک جست عقبی دروازے کی طرف بھری "میں نوکروں کے کوارٹروں میں" ۔ ابھی اس کے منہ سے پورا جملہ نہ نکلا تھا کہ نوازش نے لپک کر اسے بچّے کی طرح اٹھالیا اور دھم سے بستر پر دے مارا ۔ "چپکے سے پڑی رہو بیگم" وہ غصّے میں بولا کہا جو ہے جب تک نوازش موجود ہے کسی میں جرأت نہیں ہے کہ ۔ ۔ ۔ "

نوازش کی اس گرفت نے نہ جانے کیا کر دیا ۔ کسی انجانے شعلے سے بھڑک کر انگارے اڑے اور پھر سون کر کے پانی میں جا گرے ۔

بستر پر گرتے ہی وہ نقاہت محسوس کرنے لگی جیسے صدیوں کی بیمار ہو ۔

نیلی جھیل کا وہ طوفان ختم ہو چکا تھا اور گویا ایک لاش کنارے پرآلگی تھی ۔ اب اسے خوف و خطر کا کوئی احساس نہیں رہا تھا ۔ باہر ہجوم چلّا رہا تھا ۔ لیکن وہ یوں نوازش کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ہجوم سینما کے پردے کا ہجوم ہو ۔ نوازش اطمینان سے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا ۔ پھر دفعتاً وہ چلّایا ۔ "اب، او بنگلے سے باہر نکل جاؤ ۔ میں کہتا ہوں نکل جاؤ ۔ کوئی نہیں ہے یہاں ۔ جاؤ"۔

ہجوم باہر نکل گیا ۔ بنگلے پر موت کی سی خاموشی چھاگئی ۔ نوازش نے ایک نیا سگریٹ سلگایا ۔ اور پھر فوضیہ کی طرف دیکھے بغیر بولا ۔ "تم سے جو کہا ہے ۔ "کہ جب تک میں یہاں ہوں کوئی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا بے فکر ہو کر سو جاؤ ۔ ضرورت ہو تو مجھے بلا لینا ۔ کنڈی لگالو ۔" اس کی آواز میں تحکم تھا ۔ انداز میں استغنا تھا ۔ فوضیہ اس کی بات سن کر یوں کنڈی لگانے کے لئے اٹھی جیسے دفعتاً بیگم سے باندی بن گئی ہو ۔ پھر دیر تک وہ چارپائی پر پڑی رہی ۔ جیسے پتوار کے بغیر ناؤ ساکن سمندر پر بہے جارہی ہو ۔ بہے جا رہی ہو۔

صبح سویرے جب وہ بیدار ہوئی تو اس کے ارد گرد ایک عجیب لُٹا پٹا جہان بکھرا پڑا تھا ۔ نیلی جھیل میں ادھر اُدھر گڑیا گھر کے ٹکڑے بہہ رہے تھے ۔ اصولوں اور قاعدوں کے بُت بے جان پڑے تھے ۔ تہذیب وتمدّن کے دیوتا اوندھے منہ پڑے تھے دیر تک وہ اس ویرانی کو دیکھتی رہی محسوس کرتی رہی ۔ پھر دفعتاً اسے یاد آیا کہ وہ فوضیہ ہے ۔ اور ایک تہذیب یافتہ سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے ۔ خوفناک عزم سے وہ اٹھ بیٹھی ۔ ایک شدید کوشش سے اس نے اپنے ذہن سے اس ویرانے کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ۔ اور اس شب کے واقعات کو اپنے ذہن کی گہرائیوں میں دفن کرکے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ۔ اور معاً وہی گڑیا گھر اس کے اردگرد معلّق ہوگیا ۔ اصولوں کے بت پھر سے قائم ہوگئے ۔ تہذیب و تمدّن کے دیوتا مسکرانے لگے ۔

فرخ کی واپسی پر فوضیہ کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ اس شب کیا واقعہ ہوا تھا ۔ اس لئے فرخ کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ باقی رہا نوازش ۔ لیکن وہ

کسی نوازش کو نہیں جانتی تھی ۔ البتہ وہ شوفر ؟ مگر اب اسے موٹر میں بیٹھنے سے کوئی دلچسپی ہی نہ رہی تھی ۔ پھر شوفر کون ۔ کیسا شوفر ۔

چھ ماہ گذر گئے ۔ اصول اور قاعدوں کے بت اپنی اپنی جگہوں پر براجمان رہے جیسے کبھی گرے ہی نہ ہوں ۔ تمدن کے دیوتا کی روغنی مسکراہٹیں اور بھی دل آویز ہوگئیں ۔ جیسے وہ کبھی دھندلی پڑی ہی نہ ہوں ۔ کلدار گڈا دروازے کھولتا رہا معصوم گڑیا خوبصورت اور ساکن نیلی جھیل میں رنگدار مچھلی کی طرح تیرتی رہی ۔ چھ ماہ گذر گئے ۔

پھر ایک روز فرخ نے آکر فوضیہ سے کہا "ہم کراچی جارہے ہیں ۔ تم ساتھ چلوگی ڈارلنگ ہم کل میل میں روانہ ہوں گے شوفر کو ساتھ لے جائیں گے"۔ فرخ کا آخری جملہ فوضیہ نے نہ سنا۔ وہ اسے سننا چاہتی ہی نہ تھی ۔

اگلے روز وہ اس میل میں سوار ہو گئے جسے جھمپیر پر اس تباہ کن حادثے سے دو چار ہونا تھا ۔ سیکنڈ کلاس کے چھوٹے ڈبے میں سارا دن کلدار گڈے کی نگاہیں گڑیا کے گرد گھومتی رہیں ۔ اور روغنی گڑیا کا تبسم چلتا رہا ۔ پھر وہ لیٹ گئے سیکنڈ کلاس کے سپرنگ انہیں تھپکنے لگے ۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکا ہوا وہ جاگ پڑی ۔ سامنے سرخ شعلے لپک رہے تھے ۔ ان شعلوں نے فرخ کو لپیٹ میں لے رکھا تھا ۔ اس کا چہرہ موت کی گرفت میں بھیانک ہورہا تھا ۔ فوضیہ نے کوشش کی کہ وہ چیخ مار کر جاگ پڑے ۔ وہ اسے خواب سمجھتی تھی ۔ مگر اس کے حلق میں گویا آواز نہ تھی ۔ شعلے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے پھر دفعتاً دھڑام سے گاڑی کا دروازہ کھل گیا اور نوازش اس کی طرف لپکا ۔ 'نوازش' اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی ۔

چھ ماہ بعد وہ پہلا دن تھا جب اُس نے نوازش کو دیکھا تھا ۔ نوازش نے اُسے اٹھالیا اور دیوانہ وار بھاگا ۔ جب اسے ہوش آیا تو نوازش مونچھ مروڑتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا "تم فکر نہ کرو بیگم ، جب تک میں تمہارے پاس ہوں" ۔ وہ پھر بے ہوش ہوگئی ۔ دوسری دفعہ جب اسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھی اور نوازش دروازے میں نرس کے پاس کھڑا مونچھ مروڑ رہا تھا ۔

ماں ، بھائی ، بہن اور نرس کی موجودگی کے باوجود اب وہ اکیلی اس سفید بنگلے میں سارا دن بستر پر پڑی رہتی ہے ۔ سارا دن وہ گڑیا گھر اس کے گرد قائم رہتا ہے ۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت بے بسی سے اس کی طرف یوں دیکھتے ہیں گویا منتیں کر رہے ہوں ۔ تہذیب و تمدن کے دیوتا انگلیاں اٹھائے اسے خبردار کرتے رہتے ہیں ۔ مگر جب رات پڑتی ہے تو وہ چیخ کر جاگ اٹھتی ہے ۔ اس کی نگاہوں تلے ایک لٹا پٹا جہاں بکھرا ہوتا ہے ۔ گڑیا گھر کے ٹکڑے نیلی جھیل کے خوفناک طوفان میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجتے ہیں ۔ اصولوں اور قاعدوں کے بت اوندھے پڑے ہوتے ہیں ۔ اور تہذیب و تمدن کے دیوتا شرم سے منہ ڈھانپ لیتے ہیں ۔ اور وہ چیخ کر پکارتی ہے ۔ 'نوازش ، نوازش' اس کی پکار سن کر بڑی بیگم کا دل ڈوب جاتا ہے اور وہ محسوس کرتی ہے جیسے سفید بنگلہ محل کے محرابوں سے گر کر غلام گردش میں آپڑا ہو اور آسیہ گھبرا کر آنکھ بند کرلیتی ہے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ جیسے گڑیا گھر جوں کا توں قائم ہو ۔

کھونٹ والا بابا

روز بلاناغہ وہ اسی راستے سے آتا ہے ہر روز ۔ اس کی شلوار سفید اور مکلّف اور سیاہ اچکن سلوٹ یا گرد سے پاک ہوتی ہے ۔ اس کے کلین شیو چہرے سے سنجیدگی اور سکون و اطمینان کا اظہار ہوتا ہے جیسے اسے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو ۔ ہاتھ کی سیاہ چمکیلی چھڑی اس نے بڑے وقار سے تھامی ہوتی ہے اور چھڑی کے دستے پر اس کے ہاتھ کی گرفت سے ضبط و بُردباری کا احساس ہوتا ہے ۔ اس کے چہرے کی جھریوں سے جوانی کی لغزشوں یا ادھیڑ عمر کی عیش پرستی ظاہر نہیں ہوتی اور اس کی چال سے معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے کبھی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن لوگ حیران ہوتے ہیں کہ بیسن بازار میں پہنچنے کے لئے وہ اتنا لمبا چکّر کیوں کاٹتا ہے ۔

کون نہیں جانتا کہ ایڈورڈ روڈ سے کانچ منڈی کو سیدھا راستہ بھنڈی بازار سے جاتا ہے ۔ پھر وہ ایڈورڈ روڈ سے جارج سکوئر اور وہاں سے ملتانی مسجد اور ملتانی مسجد سے سرکلر روڈ پر گھوم کر واٹر ورکس کے ٹینک سے گوٹا بازار ہوتا ہوا کانچ منڈی کیوں پہنچتا ہے ۔ اتنا لمبا چکّر لگانے سے آخر اس کا مقصد کیا ہے ۔ اگر اسے شام کے وقت سیر کرنے سے دلچسپی ہے تو وہ سول لائن کے پر فضا علاقے کو چھوڑ کر شہر کی طرف کیوں جاتا ہے ۔ اگر اس کا مقصد شہر کی زندگی سے محظوظ ہونا ہے تو ۔ نہیں اس بوڑھے زاہدِ خشک مزاج کو رنگینی سے کیا واسطہ ۔

کانچ منڈی کے بڑے چوک میں پہنچکر ایک ساعت کے لئے وہ رک جائیگا اور گھبرائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھے گا ۔ سوٹی پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی ۔ پھر اس کے چہرے کی جھریوں میں ایک تناؤ سا جھلکے گا ۔ اور ایک خفیف سی لغزش کے بعد وہ ایک عزم سے بیسن بازار کی طرف مڑ جائے گا ۔ اگرچہ

بیسن بازار کے ڈُولا حلوائی کے سموسے شہر بھر میں مشہور تھے ۔ پھر بھی کہیں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اس بازار کو بیسن سے کوئی تعلق ہے ۔ درحقیقت اس بازار کا نام بے سِن بازار تھا جو بگڑ کر بیسن بازار بن گیا ۔

بیسن بازار کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ سرگرم خرید و فروخت کے باوجود جو وہاں شام کے وقت دیکھنے میں آتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خریدار کو خرید سے دلچسپی نہیں اور دوکاندار فروخت کی تگ و دو سے بے نیاز ہے ۔ وہاں کے دوکانداروں کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بذات خود خریدار ہوں اور گاہک کی توجہ اس طرف مرکوز نہیں ہوتی جسے وہ خرید رہا ہوتا ہے ۔ وہاں کے بھکاریوں میں بھی ایک احساس فراغت ہوتا ہے ۔ وہاں کے مزدور کی پھٹی ہوئی ٹوپی سر پر اس انداز سے دھری ہوتی ہے جیسے کسی نواب کا کلاہ ہو ۔ وہاں کے کمسن آوارہ لڑکوں کی آنکھ میں بلوغت کی چمک ہوتی ہے ۔ چلتے پھرتے سپاہیوں کی چال ڈھال سے فرائض نہیں بلکہ حقوق کی جھلک مترشح ہوتی ہے ۔ وہاں نوجوان آرزو کرتے ہیں کہ وہ پختہ کار ہوتے اور پختہ کار خواہش کرتے ہیں کہ وہ جوان ہوتے ۔ بوڑھے وہاں لاحول پڑھنے کے لئے آتے ہیں ۔۔۔۔ وہ بیسن بازار ۔

بیسن بازار میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر وہ یوں اپنی ہی دھن میں چلا جاتا ہے جیسے وہ بیسن بازار نہیں بلکہ صراطِ مستقیم ہو ۔ اسے مطلقاً اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ دوکاندار اس کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ آوارہ بچّے اس پر آوازے کس رہے ہیں ۔ اور دوکانوں سے باہر کرسیوں پر بیٹھے لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں ۔

ڈُولا حلوائی اور اجّو کبابیے کی دوکان کے سامنے پہنچکر اس کے چہرے کی جھریوں میں تناؤ کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور ہاتھ کی سوٹی پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ۔ ڈُولا حلوائی اور اجّو کبابیے کی دوکانیں بیسن بازار کے عین درمیان میں واقعہ ہیں جہاں بازار پُر ہجوم رہتا ہے ۔

ڈُولا حلوائی ایک احساسِ فراغت سے تخت پوش پر بیٹھا رہتا ہے اس کی نگاہیں اپنے سموسوں اور مٹھائیوں سے بے نیاز رہتی ہیں ۔ سالہا سال کی مشق

سے وہ ہاتھوں سے ٹٹول کر سودا اٹھاتا ہے اور تولتے ہوئے ترازو کی ڈنڈی کی طرف نہیں دیکھتا۔

اجّو کبابیے کے کباب تکّے اور چانپ شہر میں اپنی لذّت کے باعث مشہور ہیں۔ بشرطیکہ وہ دوکان پر کھڑے ہو کر کھائے جائیں اس کے باوجود اجّو کو سیخوں کو احتیاط سے پلٹنے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ جل بھی جائیں تو بھی ان کی لذّت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

ڈولا حلوائی اور اجّو کبابیے کی دوکانوں کے قریب پہنچکر وہ ایک ساعت کے لئے رک جاتا ہے۔ اسے فضا سے ایک ہلکا سا قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ جس میں کھرج آوازوں کے علاوہ پنچم اور کومل سرُوں کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ اس قہقہے کو سن کر اس کا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس کی کنپٹیاں تھرکنے لگتی ہیں۔ اور وہ غصّے بھری نگاہ اس ہجوم پر ڈالتا ہے۔ جو ان دوکانوں پر جمع ہوتا ہے اور پھر ایک نفرت بھرے انداز سے ناک چڑھا کر آگے نکل جاتا ہے حتّٰی کہ وہ اس موڑ پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے ایک ویران سڑک بائیں ہاتھ کو نکل گئی ہے اور جہاں نکڑ پر وہ ننگا مست بابا بیٹھا رہتا ہے۔ جسے سب بابا کھونٹ والا کہتے ہیں۔

اسے دور سے آتا دیکھ کر بابا کی نگاہیں قہر آلود ہو جاتی ہیں اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا کھونٹ سنبھال کر غصّے میں کانپتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر بار بار اپنا عصا اوپر کو اٹھاتا ہے جیسے پیٹنے کی دھمکی دے رہا ہو۔

وہ کھونٹ والے بابا کو اس عالم میں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور پھر قدم تیز کر دیتا ہے۔ اس کے گزر جانے کے بعد بابا کا غصّہ کا فور ہو جاتا ہے۔ اس کا کھونٹ نیچے کی طرف گر جاتا ہے۔ پھر بابا قہقہے لگاتا ہے۔ مسرّت بھرے قہقہے جیسے اسے ایک ساتھی مل گیا ہو۔ اس کا قہقہہ بازار میں گونجتا ہے۔ ڈولا حلوائی سودا دیتے ہوئے رک جاتا ہے۔ اجّو کبابیہ سر اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے بازار کے آوارہ لڑکے نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں اور سبز کھڑکیوں کے چوبارے میں سازوں کی لَے چڑھنے لگتی ہے۔ گیت کے بول چاروں طرف سے بازار کے اس ویران

حصّے کو گھیر کر اس پر مسلّط ہو جاتے ہیں۔

اب کون تجھے سمجھائے۔ بلماں جا۔۔۔ آخری جست بھر کر وہ سبز کھڑکیوں والے چوبارے میں جانے کی بجائے جہاں بائی میراثیوں اور سامعین کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے۔ وہ ساتھ والے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور غصّہ سے بھری ہوئی آواز میں چلاتا ہے "اے اِدھر آؤ۔ اے میاں" کچھ دیر کے بعد ایک میراثی اس کے قریب آکر پوچھتا ہے "جی کیا ہے؟" جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔

"بائی کو بلاؤ" وہ چیختا ہے۔

"وہ کام کر رہی ہیں آپ اِدھر آجائیں"۔

"نہیں بائی کو یہاں بلاؤ"۔

میراثی چلا جاتا ہے۔ گیت کی لَے اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ اور تیز۔۔ اور تیز اور پھر دفعتاً خاموشی چھا جاتی ہے۔ اوراس خاموشی کے پس منظر پر ننھے ننھے گھنگرو بجتے ہیں اور پھر بائی اس کے قریب آکر پوچھتی ہے "اے صاحب مجھے بلایا آپ نے جی"۔

"ہاں" وہ تحکمانہ انداز سے کہتا ہے اور چھڑی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر جُھلاتا ہے۔

"جی" زرد ہونٹوں کے معصوم خم پر دو آنکھیں طلوع ہو جاتی ہیں "کہیئے"۔

"میں پوچھتا ہوں"۔۔ وہ کھرج میں بولتا ہے۔ "تم اس سے قطع تعلق کرو گی یا نہیں"۔

"کس سے" وہ معصومانہ انداز میں پوچھتی ہے۔

"خالد سے"۔

"خالد" وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ "کون خالد؟"

وہ غصّے میں چلّاتا ہے "بہتر ہوگا کہ تم اس سے قطع تعلق کرلو"۔

"اے کیوں" وہ معصوم سیاہ آنکھیں پھر طلوع ہو جاتی ہیں۔

"میں کہتا ہوں۔۔ میں۔۔" اس کے ہاتھ کی چھڑی یوں بلند ہو جاتی ہے جیسے وہ ایک دھمکی ہو۔ "میں"

"اوہ ۔ آپ ،، آپ کہتے ہیں" وہ یوں زیرِ لب گنگناتی جیسے سب کچھ سمجھ گئی ہو ۔

"تو تم اس سے قطع تعلق کر لو گی؟"

"ہاں" کالی شوخ آنکھیں ترچھی شعاعیں ڈال کر غروب ہو جاتی ہیں ۔

"اگر تم نے نہ کیا تو ۔" وہ پوچھتا ہے ۔

"کیوں" کالی آنکھیں نصف النہار سے چمکتی ہیں ۔

"نہ کیا تو تم مجھے جانتی ہو"۔ ہاتھ کی چھڑی ابھرتی ہے ۔

"جی" بائی کا سر جھک جاتا ہے ۔

"اچھا" ایک دم وہ گھبرا جاتا ہے "یہ لو" وہ چند دس دس کے نوٹ حقارت سے اس کی طرف پھینکتا ہے ۔

وہ ان نوٹوں کی طرف دیکھ کر ناک سکیڑ لیتی ہے ۔ اور دروازے سے سہارا لگا کر یوں کھڑی ہو جاتی ہے جیسے انتہائی دکھی ہو ۔ اور وہ ایک جست بھر کر دروازے سے نکل جاتا ہے ۔

روز بلاناغہ وہ اتنا لمبا چکّر کاٹ کر بیسن بازار سے ہوتا ہوا بائی کے مکان پر پہنچتا ہے ۔۔ روز بلاناغہ ۔۔ اور بلاناغہ ملحقہ کمرے سے وہ بائی کو بلاتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے ۔ "تم اس سے قطع تعلق کروگی یا نہیں" ۔ اور وہ معصومانہ انداز سے پوچھتی ہے "کس سے" اور وہ جلال میں چلّاتا ہے "خالد سے" ۔ "جی" کہہ کر وہ آنکھیں جھکا لیتی ہے ۔ "اگر نہ کیا تو" وہ غرّاتا ہے ۔ "اے کیوں" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی ہے ۔ "کیوں نہ کروں گی"۔ "نہ کیا تو" وہ اپنی چھڑی معنی خیز انداز سے اٹھاتا ہے ۔ روز بلاناغہ وہ چار ایک دس دس کے نوٹ بائی کی طرف پھینکتا ہے ۔ بائی کے چہرے پر حقارت کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ چھڑی اُٹھا کر باہر نکل جاتا ہے ۔ اور پھر چند ساعت کے بعد نکڑ سے کھونٹ والے بابا کا مسّرت بھرا قہقہہ گونجتا ہے اور محلے کی سارنگیاں سرگوشیاں کرتی ہیں ، ڈھولکیں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہیں ، گھنگرو زیرِ لب گنگناتے ہیں ، رقاصائیں خوشی سے رقص کرتی ہیں ، دُولا حلوائی کے سموسے بِکتے ہیں ، اجّو کبابیے کے

کباب لذیذ ہو جاتے ہیں اور بیسن بازار کی نبض دُرت لے پر دھڑکتی ہے ۔۔ روز بلاناغہ ۔

خالد کو بیسن بازار سے گزرنے کا اتفاق کبھی کبھار ہوتا تھا ۔ کبھی کبھار جب اسے اپنے دوست نسیم کے ہاں فوری طور پر جانا ہوتا کیونکہ نسیم اس کا واحد دوست تھا جو بیسن بازار کے پرے سٹی روڈ پر رہا کرتا تھا ۔ عام طور پر خالد اس سے ملنے کے لئے سرکلر روڈ سے جایا کرتا تھا جو چکّر کاٹ کر سٹی روڈ کی طرف جاتی ہے ۔ لیکن جب کبھی وقت تنگ ہوتا تو وہ اپنی اوپل بھنڈی بازار کی طرف موڑ لیتا اور بیسن بازار سے شارٹ کٹ کر کے سٹی روڈ پہنچ جاتا ۔ بیسن بازار میں راہ چلتے اس نے پنچم سُریں بھی سنی تھیں اور رنگین کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے متبسّم چہرے بھی دیکھے تھے اور انہیں دیکھ کر مسکرا کر آگے چل دیا تھا ۔ اس نے اس بازار کو کبھی خاص اہمیّت نہ دی تھی ۔

پھر ایک روز جب وہ بیسن بازار کے اس موڑ سے مڑا جہاں بابا کھونٹ والا بیٹھا رہتا تھا تو بائی کے چوبارے کے عین مقابل میں پہنچ کر اوپل رک گئی ۔ خالد نے بہت کوشش کی کہ اسے چلا کر لے جائے ۔ مگر بے سُود ۔ بالآخر اسے موٹر سے اترنا ہی پڑا ۔ موٹر سے اتر کر وہ سر کھجاتے ہوئے سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے کہ عقب سے بائی کی آواز سنائی دی "اے حمید ذرا ان کی مدد کرنا" ۔ اس نے مڑ کر دیکھا ۔ ہائیں ۔ بائی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا ۔ آپ ۔ آپ جیتی جاگتی ہیں یا مجسّمہ ہیں ۔

بائی مسکرا دی ۔

"آپ" وہ بولا ۔ "آپ بیسن کی بنی ہوئی ہیں یا ہلدی کی" ۔

بائی نے منہ پٹّا کر لیا ۔ "اونہوں" اس نے آنکھیں گھما کر کہا "زعفران کی"

"ارے آپ تو بولتی بھی ہیں"۔ خالد سر کھجانے لگا ۔ "بھئی حد ہوگئی"۔

"ابھی سے" وہ ایک انداز سے بولی ۔ "ابھی تو ابتدا ہے" یہ کہہ کر وہ پُھدک کر مکان میں داخل ہوگئی ۔

اس روز اوپل میں بیٹھے نسیم کی طرف جاتے ہوئے وہ آپ ہی گنگناتا رہا

"بھئی حد ہو گئی" اسے کھوئے کھوئے دیکھ کر نسیم فوراً تاڑ گیا کہ کوئی بات ہے اور پوچھنے لگا "بھئی آج کونسی حد توڑ کر آئے ہو"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بائی کو دیکھ کر خالد حیران ہوا تھا اور بائی نے اس پر خاصہ اثر ڈالا تھا۔ مگر اس اثر کی نوعیت ایسی نہ تھی کہ وہ بات چھپا لیتا اور اسے راز بنا کر ہمیشہ کیلئے خود پر مسلّط کر لیتا کیونکہ وہ بائی کے حُسن سے اس قدر متاثر نہیں ہوا تھا۔ وہ حُسن اور محبّت کی لازم و ملزومیّت کا قائل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک بائی ایک جاذبِ نظر عورت تھی۔ جو عورت ہونے کے باوجود لڑکی دکھائی دیتی تھی جیسے کہ بیسیوں عورتیں ہوتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو حسین عورت کو دیکھ کر "بھئی واہ" کہہ کر آگے کو چل پڑتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد اس بھئی واہ کو قطعی طور پر بھول جاتے ہیں اور اپنے کام کاج میں لگ جاتے ہیں اگر اس روز بائی کو دیکھ کر بھئی واہ کی بجائے حد ہوگئی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ بائی کے جسم کی ریشمیں زردی دیکھ کر اس نے محسوس کیا تھا جیسے لیمن کرش کا گلاس بھرا ہُوا ہو اس قدر گہرے زرد رنگ کا جسم اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے گورے بدن دیکھے تھے، سانولے جسم دیکھے تھے۔ ملیح رنگ دیکھا تھا۔ مگر سرسوں کے پھول کا سا رنگ ۔۔ اس کے لئے یہ انوکھی چیز تھی۔

"ارے یار" وہ ہنس کر کہنے لگا "آج تو سمجھ لو حادثہ ہی ہوگیا۔ ایک ایسی لڑکی سے مڈبھیڑ ہو گئی جو پاؤڈر کی بجائے پسی ہوئی ہلدی سے میک اپ کرتی ہے"۔ اور وہ ہنسنے لگا۔ "کہتی ہے زعفران کی بنی ہوئی ہوں"۔

"اچھا" نسیم ہنسا۔ "دلچسپ قصّہ ہے۔ کون تھی وہ"؟

"لو" خالد نے منہ بنالیا۔ "یہ معلوم ہوتا تو حد کیوں ہوتی"۔

"کہاں ملی تھی" نسیم نے سرسری طور پر پوچھا۔

"بھئی یہیں اس بیسن بازار کی ہے"۔

"ارے" نسیم چلّایا۔ "کہیں پیلی بائی کی تو بات نہیں کر رہے ہو تم"

"پیلی بائی" خالد چلّایا۔ "وہ کیا شے ہے حضور"

"ہائیں" نسیم نے اس کی طرف غور سے یوں دیکھا جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آیا ہو۔ "پیلی بائی کو نہیں جانتے ۔۔ وہ تو زرد ناگن ہے"۔ نسیم ہنسنے لگا "اور دلچسپ بات یہ ہے کہ بیسن بازار میں رہ کر بھی گھریلو انداز سے رہتی ہے اور لوگ اسی بات پر مرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے" وہ چلّایا "کہ گھر سے چل کر اتنی دور اس گھریلو انداز کو دیکھنے جاتے ہیں ۔۔ کون نہیں جانتا اُسے"۔

"اچھا" خالد ہنسنے لگا "تو پھر ہمیں بھی لے چلو یار کبھی۔ ہم بھی جان لیں اسے"

بیسن بازار کے علاقہ میں کون تھا جو پیلی بائی کو نہ جانتا ہو۔ حتّٰی کہ سول لائنز کے خاندانی نواب تک یا تو اس سے واقف تھے یا واقفیت پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ اگرچہ اسے بیسن بازار میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

یہی کوئی چھ مہینے کی بات ہوگی جبکہ ایک روز ناگاہ اس جگمگاتے ہوئے بازار میں مہینے کی آخری تاریخوں کے چاند کی طرح وہ طلوع ہو گئی تھی۔ ہوا یہ کہ دُولا حلوائی نے چانن بائی کے اصرار پر اس نکڑ پر یہ زمین خرید کر مکان تعمیر کرانا شروع کردیا۔ کسی زمانے میں دُولا حلوائی کے دل میں چانن بائی کے لئے جگہ تھی جسے مٹھائی کی دوکان نے عرصۂ دراز سے پُر کر دیا تھا اور چانن بائی بھی اپنی سیلانی طبیعت کی وجہ سے لاہور چھوڑ کر کراچی جا بیٹھی تھی۔ اب وہ لاہور واپس آنا چاہتی تھی۔ مگر کوئی مناسب چوبارہ نہیں ملتا تھا۔ اس نے دُولا کے پرانے جذبہ سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے متواتر کئی ایک خط لکھے۔ دُولا حلوائی کے مکان بنوانے کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ اس گزرے ہوئے سانپ کی لکیر کو پھر سے پیٹے۔ اس نے یہ سوچا کہ چلو کرایہ تو آئے گا اور تعلق مفت ۔۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔

جب اس چوبارے پر آخری پلستر ہو رہے تھے تو ایک روز صبح سویرے ایک لڑکا دوڑا دوڑا حلوائی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ "چاچا ہمارے مکان میں کوئی آگیا ہے"۔ دولا نے اس بات کو کوئی اہمیّت نہ دی اور موتی چُور کے لڈو بناتے ہوئے بولا۔ "کس مکان میں ۔۔ کون آیا ہے؟"

"نئے مکان میں چاچا"۔

"نئے مکان میں ۔۔ نہیں ۔ نہیں"۔ وہ چلّایا یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ یہاں کسے جرأت ہو سکتی ہے ۔ کہ دُولا کے مکان پر قبضہ کرے ۔

"سچ کہتا ہوں چاچا" لڑکے نے سنجیدگی سے کہا' اللہ کی قسم ۔

" ہائیں" دولا نے غصّے میں ہاتھ جھاڑے اور تنکوں کی ٹوپی سر پر رکھ کر جوتا پہننے لگا ۔ "چل تو دیکھوں کون ہے وہ لاٹ کا بچّہ جس میں اتنی جرأت ہے کہ ہمارے مکان پر قبضہ جمائے"۔ اس نے لاٹھی اٹھاتے ہوئے کہا ۔

جب وہ نئے چوبارے کے کمرے میں داخل ہوا تو پیلی بائی تار کول کے ڈرم پر یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی زرد چڑیا کسی حبشی کی انگلی پر بیٹھی ہو اور آس پاس اس کا سامان پڑا تھا ۔

"کون ہے تو؟" وہ چلّایا ۔

"میں" وہ بولی "اے میں تو کوئی بھی نہیں"۔

"کیا مطبل" وہ چلّایا ۔

"اے بس" اس نے ہاتھ کو یوں چلا کر کھول دیا جیسے کبوتر اڑا رہی ہو ۔ "کوئی بھی نہیں"۔

"یہاں کیا کر رہی ہو"۔ وہ غرّایا۔

"اے کچھ بھی نہیں"۔ اس نے سیاہ آنکھیں گھمائیں ۔

"یہ گھر ہمارا ہے"۔ دُولا نے دھمکی دی ۔

"لو میں کب کہتی ہوں کہ میرا ہے"۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی ۔

" تو نکل یہاں سے دوڑ جا"۔ وہ چلّایا ۔

"اے تانگہ تو لادے"۔ اس نے پانچ روپے کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا ۔

"میں تمہارا نوکر ہوں کیا"۔ دُولا غرّایا ۔

"نہیں تو" وہ مسکرائی ۔

"تو پھر"

"اے گھر والے تو ہو" سیاہ معصوم آنکھیں نصف النہار سے چمکیں ۔

وہ ہنس پڑا "عجیب ہو تم"۔

"اچھا دیکھو" وہ بولی "اب تانگہ جو لائیگا تو کچھ کھانے کو بھی لادے کچھ نہیں کھایا صبح سے"۔ اور پھر بالکل بے تکلّفانہ منہ پھاڑ دیا اور کہنے لگی "دیکھ لو بالکل خالی ہے"۔

پھر دس منٹ کے بعد وہ بیٹھی پوریاں کھا رہی تھی اور دُولا پانی کا گلاس لئے کھڑا تھا اور انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اسے وہاں آباد کرنے آیا ہو نکالنے کے لئے نہیں اورشام کو دوکان پر بیٹھے ہوئے دولا ہنس ہنس کر دوستوں کو بتا رہا تھا کہ اس کا رنگ اس قدر گہرا پیلا ہے جیسے بوندی کا لڈّو ہو ۔ بالکل ایسا ۔ اوراس کی باتیں عجیب ہیں جیسے اسکول کی نویں جماعت سے بھاگ کر آئی ہو ۔ چلو بھائی اپنا کیا ہے کرایہ ہی لینا ہے نا ۔ اور وہ چانن بائی ۔ اُسے ٹرخا دیں گے ۔ اس کا کیا ہے ۔ وہ ہنس رہا تھا ۔ بچّوں جیسی معصوم ہنسی ۔

دولا کی باتیں سن کر دوکان پر بیٹھنے والے حیران رہ گئے ۔ دولا اس قدر بڑی بات کو یوں ہنس کر برداشت کرے ۔ حیرانی کی بات تو تھی ہی ۔ ایک تو وہ ضد میں مشہور تھا اور دوسرے وہ ان بائیوں کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو ۔

اس کے منہ سے اس نو وارد کی باتیں سن کر سارے بیسن بازار میں نو وارد کی دھوم مچ گئی اور اس کے ریشمیں زرد رنگ کا اس قدر چرچا ہوا کہ بیسن بازار والوں نے اسے پیلی بائی کے نام سے موسوم کردیا ۔

دُولا حلوائی کے علاوہ پیلی بائی کی شہرت کو کھونٹ والے بابا نے بھی ہوا دی ۔ نہ جانے وہ بات محض اتفاق پر مبنی تھی یا واقعی وہ پیلی بائی کا اعجاز تھا ۔

بابا کھونٹ والا کوئی معمولی فقیر نہیں ہے ۔ وہ بیسن بازار کی اہم شخصیت ہے ۔ ایک ایسی شخصیت جسے سب جانتے ہیں اور جس کی موجودگی اور غیر حاضری کا سب کو احساس رہتا ہے ۔ اس علاقہ میں بابا کھونٹ والا کہیں بھی چلا جائے ، کسی دروازے پر کھڑا ہو کر سوال کردے کوئی اس کے سوال کو رد نہیں کرے گا ۔ دُولا حلوائی اس کے سامنے تازہ ترین مٹھائی رکھ دے گا ۔ اجّو کبابوں اور

تکوں کی پلیٹ بھر کر پیش کرے گا ۔ رائل ٹاکی کے گیٹ کیپر اُسے آتا دیکھ کر دروازے کھول دیں گے تاکہ اگر وہ اندر جانا چاہے تو جس کلاس میں جی چاہے جا بیٹھے ۔ دوکانداروں کی بات چھوڑیئے وہ ان دروازوں سے بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا جہاں سے بھری جیبوں والے بھی خالی ہاتھ لوٹتے ہیں ۔ پیلی بائی کے آنے سے پہلے وہ بازار کی عین وسط میں دولا حلوائی کی دوکان کے قریب بیٹھا کرتا تھا ۔ جب سے لوگوں نے ہوش سنبھالا تھا وہ وہیں بیٹھا تھا ۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور کس لئے وہاں بیٹھے بیٹھے وہ بیسن بازار کا جزو اعظم بن چکا تھا اور کسی نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ وہ کیوں وہاں بیٹھا ہے ۔ بلکہ جب کبھی وہ اپنی جگہ پر نہ ہوتا تو سبھی سوچتے اور دوسروں سے پوچھتے کہ بھئی کھونٹ والا بابا کہاں گیا ۔

وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا ۔ اور اگر کرتا بھی تو صرف اپنے اس کھونٹ سے جو ہر وقت اپنے ہاتھوں میں تھامے رہتا تھا ۔ یہ کھونٹ ایک بھاری اور بھدّی ہاتھ کی چھڑی تھی ۔ اس کا دستہ موٹا تھا اور پہلوؤں پر وہ یوں ابھری ہوئی سی تھی جیسے دوسانپ اس کے گرد لپٹے ہوئے ہوں ۔ اور وہ سالہا سال کے میل سے سیاہ ہوچکی تھی ۔ بابا ہر وقت اس کھونٹ کو سینے سے لگائے رکھتا اور ہر چند منٹ کے بعد دونوں ہاتھوں سے اسے اوپر کو اٹھاتا اور یوں لہراتا جیسے کسی کو پیٹنے کی دھمکی دے رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے عجیب سی چیخیں نکلتیں اورکف جاری ہو جاتے ۔ مگر ان آوازوں نے کبھی الفاظ کی شکل اختیار نہ کی تھی ۔ وہ ایک منٹ کھونٹ لہرانے کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا اور چند ایک لمحوں کے بعد پھر سے اپنے کھونٹ کو ابھارتا اور لہراتا اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتا اور اس کا قہقہہ بازار میں گونجتا جیسے وہ کسی غصّے آمیز دھمکی اور تمسخر آمیز قہقہے کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا ہو ۔

پیلی بائی کی آمد کے دوسرے ہی روز بازار کے لڑکوں نے شور مچا دیا کہ کھونٹ والا بابا نہیں ہے ۔ کھونٹ والا بابا چلا گیا ۔ اور لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ موجود نہیں ہے ۔ یہ واقعہ حیران کن بات تھی ۔ کیونکہ سالہا سال سے وہ اسی جگہ بیٹھتا تھا اور کبھی وہاں سے نہ ہلا تھا ۔

اس بات پر چاروں طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں ۔ پھر خبر آئی کہ وہ پیلی بائی کے چوبارے کی نکڑ پر آبیٹھا ہے اور لوگ سمجھنے لگے کہ بابا کی نقل مکانی کو پیلی بائی سے تعلق ہے اور اس طرح پیلی بائی آتے ہی سارے بازار میں مشہور ہوگئی ۔ اور آتے جاتے لوگ چوبارے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے ۔

ہاں تو پیلی بائی کو دیکھنے کی ہوس جو خالد کو وہاں لے گئی تھی ۔ اس میں عیش پرستی تماش بینی یا عشق و محبّت کا عنصر نام کو نہ تھا ۔ خالد ایک صحت مند نوجوان تھا ۔ جس کے ذہن میں چیزوں کی اقدار کی مناسبت میں گڈمڈ ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اگر وہ ہفتے میں ایک دو بار پیلی بائی کے ہاں چلا جایا کرتا تھا تو اس کا مقصد محض ذہنی تفریح تھا ۔

پہلی مرتبہ جب ان کی آمد پر بائی نے "پیابن نائیں پڑت موہے چین" کی ٹھمری شروع کی تو وہ ہنس کر بولا "مولانا کوئی بات کیجئے ۔ یہاں اس کے لئے دماغ کا خانہ سراسر خالی ہے" اور وہ مسکرا کر اس کے پاس آبیٹھی تھی اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی تھی ۔ "اے حضرت رمضان مبارک کے بعد عیدالفطر کا فطرانہ کس حساب سے دیا جائے ۔ ذرا یہ مسئلہ سمجھا کر ہماری مشکل حل کر دیجئے "لو اور سن لو" وہ ہنسا "یہ بھی خوب رہی"۔ "ہم سے پوچھا بھی تو کیا حضور نے"۔

"تو کیا یہ خانہ بھی خالی ہے" بائی نے سنجیدگی سے پوچھا ۔

"یہ بتاؤ کہ زعفران آج کل زوروں پر کیوں ہے ؟"

بائی نے برا سامنہ بنا لیا "چھوڑیئے" وہ بولی "کسی ٹھنڈی چیز کی بات کیجئے ۔

"زعفران تو بے حد گرم ہوتا ہے"۔

"ارے تو کیا آپ طبیب بھی ہیں" وہ ہنسنے لگا۔

"طبیب تو ہیں لیکن آج کل مریض نہیں ملتے ۔"

اسی طرح وہ بیٹھ کر باتیں کرتے رہے ۔ وہ بناتی رہی وہ بنتا رہا اور بس ۔ خالد نے تو اس نئی واقفیت کو چنداں اہمیّت نہ دی تھی اور نہ ہی اُسے راز بنایا تھا ۔ مگر اس کے باوجود اپنی طبیعت کے خلاف اسے معمولی سی بات کو چھپانا پڑتا تھا ۔ مثلاً جب وہ کارخانے پہنچتا تو اس کے والد پوچھتے "کیوں میاں کہاں

رہے تم" تو اسے اِدھر اُدھر کا کوئی بہانہ کرنا پڑتا ۔ کیونکہ اس کے والد آغا عظیم اللہ پرانے رنگ کے وضعدار بزرگ تھے اور انہوں نے کاروبار اور سرمایہ مسلسل محنت اور مشقت سے کمایا تھا وہ صراطِ مستقیم کے قائل تھے اور صراطِ مستقیم ان کی نگاہ میں ایک متعیّن شدہ تنگ راستہ تھا ۔ افراد برطرف انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ان کی اوپل وہاں سے گزرے ۔

خالد کے متعلق آغا عظیم کی توقعات بے حد بلند تھیں ۔ ان کی تمام تر امیدیں خالد سے وابستہ تھیں ۔ اور خالد نے اپنے باپ کو کسی بات میں مایوس نہیں کیا تھا وہ ان کے روبرو ادب سے کھڑا ہو جاتا اور ہر بات پر جی ہاں کہہ کر انہیں خوش کر دیتا ۔ حتیٰ کہ وہ ایسی ایسی باتوں پر بھی ماتھے پر بل نہ ڈالتا جو اس کے خیالات و جذبات کے منافی ہوتیں ۔ شاید اسی لئے انہیں خالد سے والہانہ محبّت تھی ۔

آغا عظیم کی سب سے بڑی کمزوری ان کی طبعی فقیر پرستی تھی ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عقیدے کے مطابق کاروبار میں ان کی تمام تر کامیابی ایک فقیر کی دعا کی وجہ سے ہُوئی تھی ۔ اگرچہ اب انہیں مزید دعا کی تو ضرورت نہ تھی اور نہ ہوس تھی ۔ پھر بھی وہ فقیروں سے احتراماً ملتے تھے ۔ انہیں سلام کرتے ۔ ان کے حضور میں با ادب بیٹھے رہتے اور پھر اجازت لے کر لوٹ آتے ۔

بابا کھونٹ والے کی کرامات کے متعلق انہوں نے سب سے پہلے اپنے موٹر ڈرائیور سے سنا تھا ۔ لیکن بیسن بازار کی تفصیل نے انہیں پریشان کر دیا تھا ۔ اس لئے انھوں نے بابا کھونٹ والے کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں ایک کھٹک سی لگ گئی تھی ۔

کارخانے میں کام کرتے ہوئے یا گھر بیٹھے ہوئے انہیں دفعتاً بابا کھونٹ والے کی یاد آ جاتی ہے ۔ اور وہ مضطرب ہو جاتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں جیسے التزاماً بابا کی خدمت میں حاضر نہ ہونا بے ادبی کی علامت تھا ۔

پھر ایک روز بعد از دوپہر نیند سے بیدار ہوتے ہی انہوں نے ڈرائیور کو بلایا

اور کہنے لگے ۔ "محمد علی ہمیں جانا ہی پڑے گا ۔ چاہے وہ کہیں بھی ہوں ہمیں جانا ہی پڑے گا ۔ انہوں نے آپ بلایا ہے ۔ خواب میں وہ آئے اور مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہنے لگے ۔ ڈرتا ہے ، وہاں جانے سے ڈرتا ہے آخر ہم بھی تو وہیں بیٹھے ہیں ۔ جاؤ محمد علی گاڑی تیار کرو ہم ابھی جائیں گے" ۔

"گاڑی تو نہیں ہے صاحب" ڈرائیور نے جواب دیا ۔ "وہ چھوٹے صاحب لے گئے" ۔

"کہاں گیا ہے ؟" انہوں نے پوچھا ۔

"معلوم نہیں صاحب" وہ بولا ۔

اچھا تو ہم تانگہ سے چلیں گے محمد علی لیکن ایسے راستے سے لے چلنا کہ اس بازار سے نہ گزرنا پڑے ۔

محمد علی انہیں سرکلر روڈ سے گھما کر سیدھا سٹی روڈ سے لے گیا اور پھر وہاں سے تانگہ واپس کر دیا تاکہ بیسن بازار کا وہ ٹکڑا راہ میں نہ پڑے جہاں لوگوں کا ہجوم رہتا ہے ۔

پیلی بائی کے چوبارے کے سامنے اپنی اوپل کھڑی دیکھ کر آغا عظیم اللہ سکتے میں رہ گئے ۔ "محمد علی" ۔ انہوں نے اوپل کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ ان کی گھگھی بندھی ہوئی تھی ۔ محمد علی اس راز سے واقف تھا ۔ کیونکہ ایک بار وہ خود خالد کو وہاں لاچکا تھا ۔ اس کا رنگ فق ہوگیا ۔ عین اس وقت پیلی بائی کی بیٹھک سے خالد کا قہقہہ بلند ہوا ۔

آغا عظیم اللہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چھڑی سنبھالی اور ایک خوفناک عزم سے چوبارے میں داخل ہوئے ۔ بیٹھک میں پہنچکر انہوں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھڑی کو بلند کیا ۔ "تم ۔ تم"۔ وہ خالد کی طرف دیکھ چلّائے ، منہ سے کف جاری ہو گئے ۔ پیلی بائی پُھدک کر ان کے درمیان آ کھڑی ہوئی ۔ اور یوں مسکرانے لگی جیسے وہاں تفریحی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہو ۔

وہ بائی کو دیکھ کر گھبرائے ۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اُن کی چھڑی نیچے

گر گئی ۔ ایک ساعت کے لئے وہ یوں کھڑے کے کھڑے رہ گئے جیسے مٹی کے بنے ہوئے ہوں اور خالد چپکے سے سرک کر باہر نکل گیا ۔ پھر دفعتاً ان کو ہوش آیا اور وہ سوٹی اٹھا کر باہر کی طرف بھاگے لیکن خالد کی اوپل جا چکی تھی ۔

آغا عظیم اللہ دیر تک سڑک کے درمیان کھڑے دونوں ہاتھوں میں چھڑی اٹھائے اسے لہراتے رہے ۔ ان کے منہ سے بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں لیکن ان بے معنی آوازوں نے الفاظ کی شکل اختیار نہ کی تھی ۔ پھر کھونٹ والے بابا کا بھیانک قہقہہ گونجا ۔ اگرچہ اس میں خوشی کی شدت دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی ۔ لیکن وہ قہقہہ اس قدر بھیانک تھا کہ بیسن بازار والے بھی چونک پڑے ۔ لوگ اکٹھے ہو گئے ۔ لڑکے نعرے لگانے لگے ۔ چوباروں کی بند کھڑکیاں کھل گئیں ۔ کھونٹ والا بابا اپنا کھونٹ سنبھالے قہقہے لگاتا ہوا عظیم اللہ کے قریب آ کھڑا ہوا ۔ مگر عظیم اللہ اپنی ہی دُھن میں کھڑا چھڑی ہلاتا رہا ۔ وحشت میں وہ نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا منہ سے کف جاری تھے ۔ اور بابا کھونٹ والا ان کی طرف دیکھ دیکھ کر یوں ہنس رہا تھا جیسے بہت دیر کے بعد ایک ساتھی آ ملا ہو ۔

اب بھی اتنا لمبا چکّر کاٹ کر عظیم اللہ روز بلاناغہ بائی کے مکان پر پہنچتا ہے ۔ اور بلاناغہ جب بتیوں کی روشنی میں چمک پیدا ہو جاتی ہے وہ ملحقہ کمرے میں داخل ہو کر غصّے میں چلّاتا ہے "بائی کو بلاؤ ۔" اور پھر بائی کو دیکھ کر کئی ایک ساعت کے لیے یوں سکتے میں رہ جاتا ہے جیسے کھو گیا ہو ۔ وہ کچھ کہنے کی شدید کوشش کرتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا ۔ اس کی چھڑی ہوا میں اُٹھتی ہے اور گر پڑتی ہے پھر اُٹھتی ہے پھر گر پڑتی ہے ۔ اور بائی سر جھکائے سامنے کھڑی انتظار کرتی ہے جیسے کوئی مجرم منصف کے روبرو کھڑا فیصلے کا انتظار کرتا ہو ۔ دیر تک وہ یونہی ایک دوسرے کے رُوبرو کھڑے رہتے ہیں ۔

پھر دُور سے کھونٹ والے کا قہقہہ عظیم اللہ کو چونکا دیتا ہے ۔ اور وہ لرزتی ہوئی آواز سے پوچھتا ہے "تم اس سے قطع تعلق کرو گی یا نہیں ؟"

"اے کس سے" دو معصوم آنکھیں نصف النہار سے چمکتی ہیں۔

"خالد سے" وہ بڑبڑاتا ہے ۔

"اے کیوں" وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر پوچھتی ہے ۔ کون خالد ۔

"میرا بیٹا" وہ آہ بھر کر کہتا ہے ۔ اور پھر دفعتہً غصّہ میں آ کر چلّاتا ہے ۔

"میں کہتا ہوں تم اس سے قطع تعلّق کر لو ۔ میں کہتا ہوں ۔ میں"

"اوہ ۔ آپ کہتے ہیں" ۔ وہ سر جھکا کر یوں گنگناتی ہے جیسے سبب کچھ سمجھ گئی ہو ۔

"اگر تم نے نہ کیا تو؟" وہ چھڑی لہرا کر پوچھتا ہے ۔

"کیوں نہ کروں گی؟" سیاہ آنکھیں ترچھی شعائیں ڈال کر غروب ہو جاتیں ۔

"نہ کیا تو تم مجھے جانتی ہو" وہ چلّاتا ہے اور جیب سے چار ایک دس دس روپے کے نوٹ نکال کر پھینکتا ہے ۔ نوٹوں کو دیکھ کر بائی کے چہرے پر حقارت کی ایک شدید لہر دوڑ جاتی ہے ۔ اور وہ دروازے سے سہارا لے کر کھڑی ہو جاتی ہے ۔ پھر عظیم اللہ یوں باہر کی طرف دوڑتا ہے جیسے اندر کھڑا رہنے سے ڈرتا ہو ۔ دروازے پر کھونٹ والا بابا اسے دیکھ کر مسرت بھرا قہقہہ لگاتا ہے جیسے اسے دیر کے بعد ایک ساتھی مل گیا ہو ۔ بازار کی سارنگیاں بغلیں بجاتی ہیں ۔ ڈھولکیں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہیں اور رقاصائیں خوشی سے رقص کرتی ہیں ۔ اور دولا حلوائی کے سموسے بکنے ہیں ۔ اجّو کے کباب لذیذ ہو جاتے ہیں ۔ بے سن بازار کی نبض درت کی لے پر دھڑکتی ہے اور دادرے کے ٹھیکے پر بیبلی بائی کا گیت بازار میں گونجتا ہے ۔

"اب کون تجھے سمجھائے ۔......"

روز بلاناغہ ۔۔

............○............

چارگوٹ

اعظم آباد میں چارگوٹ سے کون واقف نہیں ۔ سول لائنز کے صاحب ، دفتروں کے بابو ، بستی کے مزدور ، چھابڑی والے ، پانفروش شہر کے سیٹھ بنگالی بابو دلال اور کٹنے سبھی چارگوٹ کو جانتے ہیں ۔ چارگوٹ اعظم آباد کا وہ واحد مقام ہے جہاں مشرق اور مغرب کچھ دور تک شانہ بشانہ چلتے ہیں ۔ جہاں ادائیگی کے لئے پرس سبز نوٹ اگلتے ہیں اور ساتھ ہی گرہ سے کھولے ہوئے میلے سکے کھنکتے ہیں ۔ جہاں کاروں کے ہارن بجتے ہیں ۔ رکشا والوں کی ہڈیاں چٹختی سنائی دیتی ہیں ۔ پھیری والوں کے آوازے ، فقیروں کی صدائیں ، دفتر کے بابوؤں کی دبی دبی آہیں ، صاحبوں کے "اے ہٹ جاؤ آگے سے" اور مزدوروں کے ننگے بے تکلف قہقہے گونجتے ہیں ۔

چارگوٹ وہ چوک ہے جہاں چار بازار ملتے ہیں ۔ جنوب میں میکلوڈ روڈ کی خوبصورت سہ منزلہ عمارتیں ہیں ۔ جن میں سو سے دو سو روپے ماہوار کرایہ کی فلیٹوں تلے جنرل مرچنٹس کی دوکانیں ہیں ۔ سول لائنز کا یہ آخری ٹکڑا نہ جانے کس اصول کے تحت چارگوٹ سے نکل کر شمال کو شہر کے عوامی علاقے میں جا گھسا ہے یہ حصہ زینت بازار کے نام سے مشہور ہے ۔ جہاں ہر قسم کی زینت کا سامان ملتا ہے ۔ سنگار فرنیچر لباس آرٹ سے متعلقہ نوادر تصاویر اور مجسمے سب زینت بازار میں گڈمڈ ہوئے پڑے ہیں اور اس دلچسپ گڈمڈ سے چیزیں ڈھونڈھنے کے لئے سول لائنز کے بانکے زینت بازار میں جانے پر مجبور ہیں ۔ پاؤڈر سرخی سے تھپی ہوئی بانکیاں برقعوں میں لپٹی ہوئی عریاں بیگمات فیشن کے دلدادہ صاحب سبھی چارگوٹ کی سرحد کو عبور کرکے زینت بازار میں آتے ہیں ۔ انہیں آرٹ سے دلچسپی نہیں ۔ وہ خالی زینت کے متوالے ہیں ۔ اس کے باوجود

انہیں یہ گوارا نہیں کہ لوگ انہیں آرٹ سے بے بہرہ سمجھیں ۔

چارگوٹ کے مغرب کی طرف بابو باڑہ میں دفتروں کے بابو مقیم ہیں جو سائیکلوں پر چلتے ہیں ۔ فلمی دھنیں گنگناتے ہیں ۔ ہوٹلوں میں چائے کے پیالے پر ادب پر بحث کرنے پر گزر اوقات کرتے ہیں اور سڑکوں اور گھروں میں صاحب کی باتیں کرکے وقت کاٹتے ہیں ۔ مشرق میں مزدوروں کے گھروندے ہیں ۔ اس علاقے کو بستی کہتے ہیں ۔ اور بستی سے پرے کالا پل ہے اور پل کے پرلی طرف لال کھوئی سرخ لالٹینوں کی وہ بستی ہے جس میں بابو اپنے صاحب اور مدقوق بیگم کو بھولنے کے لئے ڈبکیاں کھاتے ہیں ۔ اور مزدور عیش و عشرت حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں ۔

معلوم نہیں اس چوک کا نام چارگوٹ کیسے پڑگیا ۔ شاید اس کی وجہ وہ چارگوٹ نما گولے ہوں جو چوک کے مرکزی چبوترے کے گرد سیمنٹ سے بنے ہوئے ہیں ۔ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چارگوٹ در اصل چارکھونٹ تھا جو بعد میں بگڑ کر چارگوٹ بن گیا ۔

چارگوٹ پر بابو باڑہ اور بستی کا قبضہ ہے ۔ چوک سے شمال اور جنوب دونوں جانب دفعتاً سول لائنز کے اثرات معدوم ہو جاتے ہیں اور بستی کا رنگ ابھر آتا ہے پھر شمال میں زینت بازار میں مغربیت گویا پھر سسکیاں بھرتی ہوئی ابھرتی ہے چارگوٹ کا یہ ٹکڑا گویا سول لائنز کے غالیچے پر ٹاٹ کا ایک پیوند ہے ۔ یا جیسے بلوری مرتبان پر ٹین کا جوڑ لگا ہو ۔

اگر آپ میکلوڈ روڈ سے زینت بازار کی طرف جائیں تو چارگوٹ کے قریب دفعتاً سول لائنز کا وہ صاف خوبصورت اور خوابیدہ منظر ختم ہو جائے گا اور آپ محسوس کریں گے جیسے آپ گورا قبرستان سے نکل کر دفعتاً زندگی کے جھرمٹ میں آگئے ہوں میلی پُر شور عریاں زندگی ۔

چارگوٹ میں زندگی کے شرارے اڑتے ہیں جنہیں دیکھ کر سول لائنز کی مبتدی گڑیاں آنچل سنبھالتی ہیں اور مشاق بیگمیں چوری چوری آرزو کرتی ہیں کہ وہ مڑ کر زندگی کی اس بھیڑ میں جا داخل ہوں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے ،

جہاں مرد اور عورت کے ازلی فرق کے سوا اور کوئی امتیاز نہیں رہتا ۔ سول لائنز کی ان بلوری پتلیوں کے ساتھی چارگوٹ کے قریب پہنچ کر آستین چڑھا لیتے ہیں جیسے زندگی کے اس بے تکلف ریلے کے خلاف جنگ کرنے کے لئے تیار ہوں ۔ لیکن چارگوٹ کے عوام نہ تو ان لوگوں کو دیکھ کر نفرت سے ناک چڑھاتے ہیں اور نہ ہی حسرت سے ان کی طرف دیکھ کر ان سا ہونے کی آرزو کرتے ہیں ۔ انہیں دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر یوں مسکراہٹ آجاتی ہے جیسے وہ کلدار گڑیوں کا تماشہ دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہوں ۔

چارگوٹ کے ایک جانب دینا کبابئیے اور لالو چانپ والے کی دوکان ہے دوسری جانب پہلوان دودھ والا اور کریم مٹھائی والا ہے جن کے درمیان میں صوبہ پان والے کی الماری ہے ۔ تیسری جانب پچا حلوہ پوری ہے ۔ حلوہ پوری والے کے ساتھ ڈاکٹر ڈیوڈ کا مطب ہے اور چوتھی جانب کریم جراح کے ساتھ نورا گجرے والا اور امام دین فروٹ والا ہے اِن دوکانوں کے علاوہ چارگوٹ کے چکّر میں چار رہڑی والوں نے مستقل طور پر اپنے اڈے بنائے ہوئے ہیں ۔ ان میں اجمل کلفی والا ۔ توفیق پکوڑے والا ۔ صوبہ سری پائے والا اور بھیّا پلاؤ والا ہے ۔ پولیس نے ان رہڑی والوں کے خلاف بارہا کاروائی کی ہے ۔ ابھی پچھلے ہفتے ٹریفک ویک کے دوران میں پولیس کے ایک دستے نے وہاں چھاپہ مارا تھا اور تمام رہڑیاں بنچیں اور کرسیاں وہاں سے اٹھوادی تھیں ۔ پھر نہ جانے کیسے اس واقعہ کے صرف ایک گھنٹے بعد کئی ایک سپاہی انہیں بنچوں پر بیٹھ کر انہیں رہڑیوں سے سری پائے ، پلاؤ اور کباب کھا رہے تھے ۔

ویسے بھی تو بستی کی پولیس چوکی والے جب بھی چارگوٹ سے گزرتے ہیں تو وہ پہلے دینا کبابئیے کو باقاعدہ سلام کرتے ہیں ۔ اور توفیق پکوڑے والے سے ہاتھ ملاتے ہیں ۔ "کیوں بھئی حوالدار" دینا کبابیہ ایک شانِ انسپکٹریت سے انہیں مخاطب کرتا ہے " فضلو کا پیچھا چھوڑو گے بھی یا نہیں" ۔ سپاہی جواب میں دانت نکالتا ہے "کیسا ہے وہ تمہارا سرونٹ" توفیق دور سے چلّاتا ہے ۔ "ہمیں

بھی دکھا دو کسی دن حوالدار" ۔ "چھ کباب چار تکے" ۔ لڑکا چلّاتا ہے اور دینا کبابیہ کے ہاتھ آپ ہی آپ سیخوں سے کھیلنے لگتے ہیں ۔ اس کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ جوں کی توں قائم رہتی ہے ۔ "سوا تین روپے" لڑکا چلّاتا ہے اور گاہک کی طرف دیکھے بغیر اس کے ہاتھ سے پانچ کا نوٹ لے کر دینا بے پروائی سے اس ڈھیر میں پھینک دیتا ہے اور پھر روغن سے لتھڑے ہوئے سکّوں کی مٹھی بھر کر ایک روپیہ بارہ آنے گاہک کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے چلّاتا ہے ۔ "بارہ سیخیں اور بنا دے گامے" ۔

چارگوٹ گویا اعظم آباد کا مطبخ ہے ۔ شہر والے وہاں کھلے بندوں کباب ، چانپ ، کلفا اور حلوہ پوری کھانے کے لئے آتے ہیں ۔ سول لائنز والے چھپ چھپ کر وہاں پہنچتے ہیں ۔ اور بند کاروں میں بیٹھ کر کھاتے ہیں ۔ وہ مٹن چانپ اور پڈنگ چھوڑ کر دینا کے کباب اور پچا کا حلوہ کھانے آتے ہیں ۔ اور جو ایک مرتبہ پہلوان کا کلفا کھا لیتا ہے اس پر آئس کریم حرام ہو جاتی ہے ۔

پہلوان روز پانچ پانچ سیر کے بارہ برتن کلفے کے بناتا ہے اور شام کے پانچ سات بجے تک اس کا سودا ختم ہو جاتا ہے اور کئی محروم گاہک خالی برتن اٹھا کر لوٹتے ہیں اور پہلوان سودا ختم کرنے کے بعد اک شانِ استغنٰے سے حقّہ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے "اودوے لے" وہ چلّاتا ہے "حرامی آج سودا نرم رہا ہے ۔ ٹھیک طور پر آگ نہیں دی تو نے ۔ تیری ہڈیاں توڑدوں گا نا تو عقل آئے گی تجھے" ۔

"اچھا بھلا سودا تھا اب تُو خواہ مخواہ لڑکے پر برس ریا اے" کریم حلوائی چلّاتا ہے "کھانے والے ہونٹ چاٹ رہے تھے پر پہلوان کو پسند ہی نہیں واہ" ۔

"تو چپ بیٹھا رہ کریم" پہلوان ہنستا ہے ۔

"وہ جو کالی والی بڑی کار میں آئے تھے مالم ہے کیا کہہ رہے تھے" ۔ کریم بولے جاتا ہے ۔

"کیا کہہ رہے تھے" ۔

"کہہ رہا تھا وہ فوجی وردی والا جیادہ کھایا نہیں جاتا ورنہ جی چاہتا ہے کھا کھا

کر یہیں ڈھیر ہو جائیں"۔

پہلوان ہنستا ہے "یہ کاروں والے کھانا کیا جانیں ، انہیں سودے کی سمجھ بھی ہو کچھ ۔ یہ تو چینی کی پلیٹیں کھڑکانا ہی جانتے ہیں"۔

صبح سویرے ہی لوگ چچا حلوہ پوری والے کی دوکان پر یورش کر دیتے ہیں دوپہر کو اجمل کلفی والے کے گرد بھیڑ لگ جاتی ہے اور پھر شام کے وقت کلفا چانپ کباب اور سری پائے کا دور چلتا ہے .... اور پھر نورا کے گجرے بکتے ہیں اور بستی کے مزدور گلے میں گجرے ڈالے منہ میں پان دبائے سگریٹ پیتے ہوئے کالے پُل کی طرف چل پڑتے ہیں ۔

شام کے وقت چارگوٹ میں چہل پہل ہو جاتی ہے میکلوڈ روڈ کی فلیٹوں کے مکین دور سے ترچھی نگاہوں سے ادھر دیکھتے ہیں ۔ زینت بازار کے بالاخانوں کی کھڑکیوں کے پردوں تلے سے سیاہ رسیلی آنکھیں تاروں کی طرح چمکتی ہیں ۔ بابو باڑے کے جنگلوں میں ننگے بچّے بھوکی نگاہوں سے چارگوٹ کی طرف دیکھتے ہیں ۔ ان کے پیچھے زرد زرد نسائی ڈھانچے حسرت بھری اداس نگاہوں سے چوک کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے تھکا ہارا مسافر کسی ویرانے سے اس نخلستان کو دیکھتا ہے ۔ جہاں اسے پہنچنے کی کوئی امید نہ ہو ۔

صمدو حجام چچا کی دوکان پر کھڑا ہو کر چلاتا ہے "وہ سُن لیا چچا تم نے ۔ اے چچا میں کیا کہہ رہا ہوں"۔

سودا دیتے ہوئے چچا ایک نظر صمدو کی طرف دیکھتا ہے چچا کی نگاہوں میں پھوٹی ہوئی پھلجھڑیاں اس کی شرعی داڑھی کو جھٹلا دیتی ہیں ۔ اسے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے گھونگھٹ تلے کسی دوشیزہ نے دھکتے ہوئے کوئلے چھپا رکھے ہوں ۔ جوانی چچا نے علانیہ پُھولجھڑیاں چلانے میں بسر کر دی لیکن پھر ایک روز دفعتاً گھر میں رکھے ہوئے بلوری گلاس توڑ دیے اور آنکھوں سے چلتی ہوئی عورتوں کے کپڑے نوچنے سے توبہ کر لی ۔ اسے تائب ہوئے دو سال ہو چکے ہیں ۔ لیکن اس کی آنکھیں ابھی تک ٹھنڈی نہیں پڑ سکیں ۔ ان میں اب تک شرارے اڑتے ہیں ۔ اگرچہ اب اس کی نگاہیں کھلاڑی کی سی نہیں بلکہ تماش بین کی سی ہیں وہ

دیکھتا ہے ۔ مسکراتا ہے "میں جانتا ہوں" کی سی مسکراہٹ اور پھر آنکھیں جھکا لیتا ہے اور اس کی جھکی جھکی آنکھوں میں دیر تک رنگین بلبلے پھوٹتے رہتے ہیں "وہ سن لیا چچا تم نے" صمدو حجام چلّایا ہے "گھی سات روپے سیر ہو گیا ۔ سات روپے ۔ سنا تم نے ۔ سات روپے"۔

"تو تجھے کیا غم ہے" چچا ہنستا ہے ۔

"لو بھئی کر لو بات" صمدو ہاتھ چلا چلا کر لوگوں کو مخاطب کرتا ہے ۔

لمبے بالوں والا کمیونسٹ شاعر حلوہ کھاتے ہوئے جوش میں اُٹھ بیٹھتا ہے ۔ "یہ مہنگائی حکومت کا قصور ہے" ۔ وہ تقریر شروع کرتا ہے لیکن چچا بیچ میں بول اٹھتا ہے ۔ "تُو کیا گھی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ صمدو" سب اس پر ہنس پڑتے ہیں ۔ لمبے بالوں والے کی بات کوئی نہیں سُنتا اور وہ چپ چاپ بیٹھ کر حلوہ کھانے لگتا ہے ۔ "لو ۔ کر لو بات ۔ چچا یہاں یہ حالت ہے کہ کھانا تو درکنار رہا ۔ ہفتے میں ایک بار گھی کی مالش نہ کروں تو بدن اینٹھ جاتا ہے"۔

"اینٹھنے دے سالے کو ۔ کھاتا پیتا اینٹھتا ہے تو پڑا اینٹھے" چچا کو صمدو کو چھیڑنے میں مزا آتا ہے ۔

"لو کر لو بات ۔ اس مہنگائی میں ہم تو مر گئے ، تباہ ہو گئے ۔ اور یہ چچا ہماری مسخری اڑا رہا ہے"۔

"تم مر گئے ہو تو بولو چچا کیا کرے ۔ میاں جس نے مرنا ہے اس نے مرنا ہے ۔ جس نے جینا ہے اس نے جینا ہے ۔ یہ تو مولا کے رنگ ہیں" ۔ چچا کی پھولجھڑیاں اڑتی ہیں ۔

"ہاں یہ تو سولہ آنے کھری کہی" صمدو سر جھکا لیتا ہے ۔

"تو بول نا چچا کیا کرے"۔

"چچا کیا کرے" صمدو جیب ٹٹولتے ہوئے کہتا ہے ۔ "چچا یہ کرے کہ آدھ پاؤ حلوہ پوری تول دے ۔ صمدو کے لئے" ۔

"ہوئی نا بات" چچا کی آنکھوں میں رنگین بلبلے اڑتے ہیں ۔ اور وہ سودا تولنے لگتا ہے اور صمدو ٹین کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں سے

کہتا ہے بس ہمیں تو اس مہنگائی نے مار دیا ۔ جیسے مہنگائی سے مر جانا ایک بڑی خوش قسمتی ہو ۔ دوکان پر کھڑے سبھی گاہک صمدو کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں ۔ وہ سب گھی کی مہنگائی پر اظہارِ پریشانی کرتے ہوئے یوں حلوہ پوری کھائے جاتے ہیں جیسے حلوہ پوری کھانا مہنگائی کا واحد علاج ہو ۔

چارگوٹ کے اس موڑ پر جو بستی کی طرف جاتا ہے ۔ سبز رنگ کی کھڑکیوں والے بوسیدہ چوبارے سے سیاہ فام اجو کا چہرا یوں چمکتا ہے ۔ جیسے اس کے پیچھے بیسیوں ننھے ننھے بلب جل رہے ہوں ۔ جیسے کسی تاریک روشنی کی لہریں اس کے خدوخال میں مسلسل طور پر رواں دواں ہوں ۔ سیاہ فام ہونے کے باوجود وہ انگارے کی طرح دہکتی ہے ۔ قمیض سینے پر پھٹی جارہی ہے ۔ باریک قمیض تلے پیٹ کے خطوط میں حوالگی کے واضح اشارے ہیں ۔ وہ ہر راہ چلتے کو ٹٹولتی ہے پرکھتی ہے اور ننگی دعوت دیتی ہے ۔ اسے رفیق کا ذرا خوف نہیں ۔ وہ پکوڑے والا رفیق جس سے ساری بستی ڈرتی ہے ۔ اجّو کے سامنے اگر گھٹنے ٹیک دیتا ہے ۔ مانا کہ وہ بستی کا بدمعاش ہے ۔ لیکن وہ اجّو کے لئے بدمعاش نہیں ۔ اجّو کے لئے وہ ایک ضدی بچے کے سوا کچھ نہیں ۔ وہ اجّو کے خاوند سے زبردستی اسے چھین لایا ہے اوراسے علانیہ اس چوبارے میں رکھا ہوا ہے ۔

بستی کی مسجد کا ملّا اور بازار کے دوکان دار سبھی اس عورت پر لعنتیں بھیجتے ہیں لیکن رفیق کے ڈر کے علاوہ اجّو کے جسم کی ان شعاعوں کی وجہ سے خاموش ہیں ۔ جن کا لشکارہ دیکھنے کے لئے وہ چوبارے تلے رُک جاتے ہیں ۔

مسجد کا ملّا وضو کرتے ہوئے اجّو کی طرف دیکھتا ہے ۔ لاحول پڑھتا ہے اور پھر دیکھتا ہے ۔ اس کی آرزو ہے کہ اجّو صراطِ مستقیم پر آجائے ۔ دل ہی دل میں وہ جانتا ہے کہ صراطِ مستقیم سے اس کا حجرہ قریب تر ہے بہت قریب ۔

صمدو حجام بھورا دھوبی ڈیوڑھی کے باہر بیٹھ کر حقہ پیتے ہوئے اجّو کی طرف دیکھتے ہیں ۔ ان کے ہونٹ آن جانے میں لٹک جاتے ہیں ۔ ”بس اس جمانے میں ایک یہی چیج سستی ہے“ صمدو اجّو کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ۔

لمبے بالوں والا اشتراکی رک جاتا ہے ۔ ”ہاں“ وہ اجو کی طرف دیکھے بغیر چلّاتا

ہے ۔ ”یہ سب حکومت کا قصور ہے“ ۔ بھورا دھوبی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتا ہے ۔ ”حکومت کی نہیں ہم اجو کی بات کر رہے ہیں“ ۔ لمبے بالوں والا اجو کی طرف دیکھتا ہے اسکا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے اور وہ بُھول جاتا ہے کہ حکومت کیا چیز ہے ۔ اور اس کا کیا قصور ہے ۔ وہ دونوں لمبے بالوں والے کی موجودگی کو بھول جاتے ہیں ۔

”ہاتھ سے اشارہ نہ کر صمدو ۔ جو رفیقے نے دیکھ لیا تو ۔۔۔۔۔“ بھورے کا جھری دار ہاتھ کانپتا ہے ۔

”لو سن لو اس کی بات میرا کیا بگاڑلے گا ۔ میری کون لوگائی گھر ماں بیٹھی ہے“ ۔

صمدو چمک کر کہتا ہے ۔

”بس تو جوش میں نہ آ“ ۔ بھورا اسے سمجھاتا ہے ۔

”میں تو کہہ رہ تھا اس مہنگائی کے جانے میں ایک یہی چیج سستی ہو رہی ہے“ ۔

”کہاں ہو رہی ہے سستی“ فیضو پنواڑی کتھے بھرے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہتا ہے ۔ ”ٹکے لگتے ہیں ٹکے ۔ ہاں ۔ کبھی خریدی ہو تو جانو“ ۔ وہ دونوں فیضو کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ۔

”ہم سے پوچھو تو ۔ صرف گھی ہی نہیں مہنگا ہو رہا“ ۔ فیضو مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے یوں اجو کی طرف دیکھ رہا ہے جیسے اس کی ریشمیں کرتی کو چیر کر اس کے جسم کو ٹٹول رہا ہو ۔ پیٹ پر گدگدی کر رہا ہو ۔

”لڑکے ہوش کی بات کر“ ۔ بھورا دھوبی چلّاتا ہے ۔ لیکن فیضو اس کی بات نہیں سنتا ۔ اور گرانی کے اس شکوے کے باوجود ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اسے خریدنے کے لئے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لئے تیار ہے ۔

”پاگل ہو رہا ہے“ دھوبی کے ماتھے پر شکن پڑ جاتے ہیں ۔

”تیری رگوں میں بھی خون ہو تو میں پوچھوں“ پنواڑی قہقہہ لگاتا ہے ۔

”اسے معلوم نہیں“ ۔ بھورا حجام سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ۔ ”لونڈا ہے

نا اسے معلوم نہیں سب ایک سی ہوتی ہیں ۔ سب"۔

اجو کی سیاہ چنگاریاں فیضو کی شربتی آنکھوں سے کھیلتی ہیں ۔ اس کے سفید دانت چمکتے ہیں ۔ جیسے وہ بھورے دھوبی کی بات پر ہنس رہی ہو ۔ اور فیضو سے کہہ رہی ہو "اس کی بات نہ سنو ۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں ۔ مجھ میں کیا فرق ہے"۔

اجو کی مسکراہٹ کی روشنی کا عکس صمدو حجام کی آنکھوں میں جھلکتا ہے اور وہ بھول جاتا ہے کہ صرف ایک ہی چیز سستی ہے ۔

اجو کے دانتوں کی بجلی سے سیلون کار کے دروازے کے قریب کھڑا کلفا کھاتا ہوا صاحب چونکتا ہے اور حریص نگاہوں سے اس سیاہ فام عورت کی طرف چوری چوری دیکھتا ہے تاکہ کار میں بیٹھی ہوئی گوری چٹی خاتون کو پتہ نہ چل جائے ۔ اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بستی ہے اور بستی کے رہنے والے بدتمیز جانگلو ہوتے ہیں ۔ وہ اس جنگلی شیرنی کو دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہے اس لئے کہ وہ پاؤڈر سرخی سے تھپی ہوئی غالیچے کی بے جان شیرنیوں سے مختلف ہے ۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بستی کے چوک میں کھڑا ہے ۔ رفیق کے پاس کھڑا بالا کہنی مار کر رفیق کو ادھر متوجہ کرتا ہے ۔ "دیکھ لے" وہ دبی آواز میں کہتا ہے "ادھر"۔

رفیق قہقہہ مار کر ہنس دیتا ہے "دیکھنے دو" وہ بے پرواہی سے کہتا ہے ۔ "یہ بیچارے دیکھنے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں اور وہ چٹی گوری عورتیں جو یہ ساتھ لئے پھرتے ہیں وہ صرف دِکھنا جانتی ہیں"۔

رفیق کی بات سن کر ایک قہقہہ بلند ہوتا ہے ۔ اور بستی کے سیاہ فام مزدوروں کے دانت چمکتے ہیں ۔

پہلوان کی دوکان پر بھیڑ لگی ہے ۔ گاہک کلفے کے لئے تکرار کر رہے ہیں ۔ اور پہلوان یوں خاموش بیٹھا سودا تول رہا ہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔

"اے میاں دھکے تو نہ دو" ادھیڑ عمر کا دُبلا آدمی چلاّتا ہے ۔ "واہ پہلوان اچھی دکان ہے ۔۔ یہاں آؤ اور کپڑے پھڑوا کر جاؤ ۔۔ بھئی واہ"۔

"کپڑا پہلے ہی نہیں ملتا"۔ بھورا ہاتھ چلاتا ہے ۔

"اب تو اور چڑھ گیا ہے"۔۔ ادھیڑ عمر والا کہتا ہے ۔

"کون سی چیز ہے جو چڑھ نہیں رہی سب حکومت کا قصور ہے"۔ لمبے بالوں والا شاعر موقعہ پاکر اپنی ہانکتا ہے ۔ "حکومت کیوں ان کو معلوم ہی کیا ہے کہ دال چڑھ گئی ہے ۔ چار آنے بڑھ گئی ہے ۔ یہ تو ان دوکانداروں کی لگائی ہوئی آگ ہے میاں ۔ بھورا کھانستا ہے ۔ لمبے بالوں والا خاموش ہو جاتا ہے کوئی اس کی بات نہیں سنتا ۔ "دال بھی چڑھ گئی ہے تو بولو کوئی کیا کھائے پئے"۔ ادھیڑ عمر والا یوں آنکھیں چمکاتا ہے جیسے کھائے پئے بغیر رہنا نعمت ہو ۔ جیسے کلفے کو کھانے پینے سے دور کا واسطہ نہ ہو ۔

"ہم غریبوں کے لئے مصیبت کے دن ہیں"۔ بھورا آہ بھرتا ہے پھر پہلوان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "پہلوان مجھے تو ایک پاؤ بھر دے دے نا پہلے"۔

ڈاکٹر ڈیوڈ پہلوان کی دوکان پر لگی ہوئی بھیڑ کی طرف حسرت بھری نگاہ سے تکتا ہے ۔ اور پھر اپنے مطب کی ویرانی کو محسوس کر کے آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے "سارا دن کھاتا ہے ۔ یہ بستی والا لوگ سارا دن دانت نکالتا رہتا ہے ۔ قہقہے لگاتا ہے ۔ اتنا نہیں کہ ان لوگ کو کالرا ہی ہو جائے ۔ ڈیم اٹ"۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ چارکوٹ میں ہاسپٹل کرو" ہنری چلاّتا ہے "ہم نے منع نہیں کیا تھا ۔ یہ کیا ہاسپٹل کی جگہ ہے یہاں تو کھانے پینے کا شاپ چلتا ہے ہاسپٹل نہیں"۔

"نانسنس" ڈیوڈ تیوری چڑھا کر کہتا ہے ۔ "کھانے پینے کی جگہ ہاسپٹل نہیں چلے گا تو کہاں چلے گا ۔ وہ دیکھو" وہ بھیا کے پلاؤ کے تھال کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں ۔ "یہ چاول خالص انفکشن ہے اور وہ سری پائے ۔ آج سنڈے ہے ۔ دو دن سے یہی "سینٹل" سری پایا بک رہا ہے ۔ اور کسی کو واسٹ تک نہیں ہوتا ۔ پھر وہ چانپ ہے ۔ اور وہ ڈیم کلفا ۔ یہ لوگ زہر اور پتھر سب ڈائجسٹ کر لیتا ہے ۔ سارا دن مہنگائی کی شکایت کرتا ہے اور ساتھ ہی بکری کی طرح جگالی کرتا رہتا ہے اور پھر ہنستا ہے ۔ ایڈیٹ اور پھر شام

کو ہار پہن کر پان سے منہ رنگتا ہے ۔ اور کالے پل کی طرف چلا جاتا ہے ۔ لال کھوئی میں ڈپ لگانے کے واسطے ۔ اور پھر اس ڈسیزڈ ایریا سے قہقہے مارتا ہوا واپس آتا ہے ۔ یہ لوگ ، ڈیم اٹ مجھے میڈیکل سائنس پر کوئی فیتھ نہیں رہا ۔" ہنری مسکراتا ہے ۔ "میڈیکل فیتھ کو چھوڑو ۔ اکنومکس کے اصول گڈمڈ ہو رہے ہیں"۔

"اکنومکس' ڈیوڈ قہقہہ لگاتا ہے ڈیم اکنومکس جتنی مہنگائی بڑھتی ہے یہ لوگ اتنا زیادہ کھاتا ہے اور ہنستا ہے ۔ اور یہ میڈیسن فلسفہ اور اکنومکس" ڈیوڈ نے کتابوں کی الماری کی طرف اشارہ کرکے کہا ۔ "لائرز آل لائز ۔ جھوٹ ، بکواس بائی گاڈ اگر بابو باڑہ نہ ہو تو ہم لوگ بھوکا مر جائے اور یہ بابو لوگ ۔ ہونہہ ، یہ بھی ایڈیٹ ہے ۔ یہ بابو بوگ سمجھتا ہے کہ وائف نے بد پرہیزی کر لی ہے ۔ ہی ہی ہی ۔ اڈیٹس ۔ کھانے کو ملتا نہیں اور بدپرہیزی ۔ اور پھر یہ بابو لوگ رات کو صاحب کا غصّہ بیوی پر اتارتا ہے اور اسے لَو سمجھتا ہے ۔ ڈیم اٹ" ۔

"ڈاکٹر صاحب" زرد رو بابو دوکان میں جھانکتا ہے ۔ "ڈاکٹر صاحب" "ول ول کم ان" ڈیوڈ کہتا ہے "آجاؤ ۔ آجاؤ ۔ ہیو اے سیٹ" ۔ "ڈاکٹر صاحب پھر تکلیف ہو گئی رات کو" ۔ بابو دبی آواز میں گنگناتا ہے "مسز کے بارے میں ؟"

"ڈاکٹر صاحب میں جمعہ کو آیا تھا نا آپ کے پاس" ۔

"آیا تھا ۔ آیا تھا ۔ او بس بس ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ کیا نام ہے" ۔ ڈاکٹر سرخ رنگ سے شیشی بھرتا ہے ۔

"تھری ڈیز ۔ ٹوائس ڈیلی" ۔

بابو مبہم سی آہ بھرتا ہے اور جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے ۔ ڈاکٹر سے دوائی لے کر وہ باہر نکلتا ہے اور حسرت سے چوک کی طرف دیکھتا ہے ۔ کباب اور چانپ کی دوکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے ۔ "چار آنے پاؤ ۔ چار آنے پاؤ" ۔ بھیا پلاؤ والا چلّاتا ہے ۔ سری پائے کھاتے ہوئے دو لڑکے چٹخارے لے رہے ہیں ۔ صدو حجام کلفا کھاتے ہوئے کپڑے کی گرانی پر تقریر جھاڑ رہا ہے ۔ چچا کے حلوے سے عجیب سی میٹھی خوشبو آرہی ہے اوراس کی جھکی جھکی آنکھوں سے فوارے

چھوٹ رہے ہیں ۔ دفعتاً بابو کی نظر پہلوان کی دوکان پر کھڑی ہوئی موٹروں پر پڑتی ہے ۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا ہے ۔ آنکھوں میں حرص جھلکتی ہے اور وہ پہلوان کی دوکان پر پہنچ کر چوری چوری موٹروں میں جھانکتا ہے ۔ موٹروں میں سرخ ہونٹوں ، سیاہ بالوں ، سڈول بازوؤں کی جھلکیاں دیکھ کر اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے ۔ پنواڑی کی دوکان پر کھڑا ہو کر وہ جیب سے آخری روپیہ نکالتا ہے ۔

دفعتاً بابو کی نگاہ دوائی کی بوتل پر پڑتی ہے اور اس کے سامنے ایک مدقوق عورت اور تین ننگے دھڑنگے بچّے آ جاتے ہیں ۔ پھر وہ کیپسٹن کے پیکٹ کی طرف دیکھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے ۔ جیسے اس نے جرم کیا ہو ۔ گناہ کیا ہو ۔ سگرٹ نکال کر جھٹ سے وہ پیکٹ جیب میں ڈال لیتا ہے یہ احساسِ گناہ اس کی زندگی کی واحد دلچسپی ہے ۔ واحد سہارا ۔

دفعتاً اس کی نگاہ اجو پر پڑتی ہے ۔ اس کا خون منجمد ہو جاتا ہے ۔ "یہ کون ہے" وہ چلّاتا ہے ۔

پنواڑی جھک کر اجو کی طرف دیکھتا ہے "بس دیکھ لو" وہ کھجاتے ہوئے ہنستا ہے ۔

"بڑی بنی سنوری ہوئی ہے" ۔

"اونہوں" پنواڑی مسکراتا ہے ۔ "بنی سنوری ہوئی موٹروں میں ہوتی ہیں ۔ یہ سالی تو ننگی ہے" ۔

"سج دھج تو وہ ہے" ۔

"جان ہے جان ۔ خالی جان ۔ لہو ہے لہو اور یہ موٹروں میں تو بس چونے گچی ہے" ۔

"یہ موٹروں کا امتیاز حکومت نے پیدا کر رکھا ہے" لمبے بالوں والا رک کر کہتا ہے ۔

"پر یہ ہے کون" ۔ وہ دونوں اجو میں اس قدر کھو چکے ہیں کہ وہ راہ چلتے شاعر کی بات سنتے ہی نہیں ۔

"تم نے کیا لینا ہے بابو صاحب ۔ تم اپنا سگریٹ پیو" ۔ پنواڑی کہتا ہے

"اور یہ دوائی کس کے لئے ہے" بابو دوائی کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس کی نگاہوں میں ایک زرد ڈھانچہ ابھرتا ہے ۔ ننگے بچے روتے ہیں ۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ دوائی کو دور پھینک دے ۔ لیکن ڈیڑھ روپیہ ، وہ جھٹ سے اسے جیب میں ڈال لیتا ہے ۔

"بھئی بڑی بانکی عورت ہے یہ" وہ حسرت بھری نظروں سے اجو کی طرف دیکھتا ہے ۔

"چھوڑو بابو صاحب" پنواڑی ہنستا ہے ۔ "تمہارے بس کا روگ نہیں ۔ یہ دوائی پینے والی عورت نہیں" ۔

"دیکھانا" صدو قریب آکر کہتا ہے ۔ "لو دیکھ لو ہوئی نا بات میں کہوں ہوں سارے چوک کو کھا جائے اور ڈکار نہ لے ۔ عورت ہوئی نا اور ایمان سے بھئی جب سے رفیق اسے لایا ہے اس چوبارے ماں مسجد کا ملّا تب سے سارا دن وضو کرتا رہتا ہے ۔ سالے کا وضو بیس مرتبہ ٹوٹتا ہے دن ماں" ۔

پنواڑی قہقہہ مارتا ہے ۔

"وہ تو علانیہ اوپر بلا رہی ہے ۔ حد ہوگئی" ۔ بابو کھجاتے ہوئے گنگناتا ہے ۔

"جمانہ ہی ایسا آیا ہے ۔ سبھی بُلاتی ہیں ۔ یہ دیکھ لو وہ" صدو موٹروں کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ "سرخیاں لگا لگا کر ہونٹوں کو لشکاتی ہیں ۔ ننگا پنڈا دکھا دکھا کر روکتی ہیں" ۔

"اور پھر ذرا ہاتھ لگا دو تو بدکتی ہیں اور وہ اجو ابے صدو ان کا اس سے کیا مقابلہ ۔ وہ عورت ہے اور یہ گڑیاں ! ۔۔۔ اس کے چوبارے پر چڑھ کر دیکھ لو بابو صاحب ۔ اگر دو گھڑی مین بازار میں چاروں شانے چت نہ کرو تو میرا ذمہ اور ۔۔۔"

"ابے ابے" صدو کی ڈر سے گھگھی بندھ جاتی ہے ۔ "رفیق رفیق" ۔ وہ رفیق کی طرف اشارہ کرکے پنواڑی کو خبردار کرتا ہے ۔

"بیڑی دینا بھئی ایک" رفیق آکر پنواڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے ۔

"یہ کیا کیا ہے تُو نے رفیق جو چوک میں شیرنی لا باندھی ہے" ۔ پنواڑی ہنس کر پوچھتا ہے ۔ رفیق کی آنکھوں میں گویا سوڈے کی بوتلیں کُھل جاتی ہیں اور وہ فخر سے اجو کے چوبارے کی طرف دیکھتا ہے ۔

بابو پان کی دوکان سے چل پڑتا ہے ۔ دینے کبابیے کی دوکان کے سامنے جیجا کوچوان کو کھڑا دیکھ کر اس کا جی چاہتا ہے کہ اس سے بات کرے مگر اس میں ہمت نہیں پڑتی ۔

جیجا تانگے والا چارکوٹ کا مشہور بھڑوا ہے مشہور ہے کہ اس کے پاس بیسیوں لڑکیاں ہیں ۔ گاؤں کی موٹر والوں کی ۔ کالج کی ۔ کئی بار بابو کا جی چاہتا ہے کہ وہ جیجے سے بات کرے ۔ مگر اس میں کبھی ہمت نہیں پڑی ۔

حاجی عمر اپنی عظیم الشان دوکان پر بیٹھا دن کی کمائی گن رہا ہے ۔ تین سو پینسٹھ ستر اس کے چہرے پر اکتاہٹ ہے اور انداز میں بے حسی ۔ سیٹھ علم الدین بلند آواز میں کہتا ہے "مندا بڑھ رہا ہے" ۔

حاجی اس کی طرف دیکھے بغیر کہتا ہے ۔ "مال ہی نہیں آتا ۔ آٹھ میں سے دو سٹور خالی پڑے ہیں اور یہ دیکھو آج کی بِکری صرف تین سو بہتّر"۔

ان کے چہروں پر بے حسی اور نحوست ٹپک رہی ہے ۔ سامنے میز پر نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور دوکان پر مجرمانہ خاموشی چھائی ہوئی ہے ۔ چوک میں مزدوروں کے قہقہے گونج رہے ہیں ۔

"چار آنے پاؤ" بھیّا چلّاتا ہے ۔ "چار آنے پاؤ ۔"

"چار ٹکے چھ سیخیں" ۔

"پانچ روپے چھ آنے" ۔

"ایک پاؤ حلوہ ۔ ذرا جلدی کرنا ۔ چچا اِس مہنگائی سے ہم تو مر گئے تیری قسم" ۔ "میاں جس نے مرنا ہے وہ مر جاتا ہے ۔ جس نے جینا ہے وہ جیتا ہے" ۔ چچا چلا کر کہتا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں اس کا ماضی یوں جیتا ہے ۔ جیسے زمانۂ حال میں تبدیل ہوگیا ہو ۔

”لا حول ولا قوة“ اجو کی باریک قمیض سے اس کے پیٹ کی لکیر دیکھ کر ملّا وضو کرتے ہوئے آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہے ۔

”موج لینے دے“ رفیق موٹر والوں پر ہنستا ہے“ دیکھنے دے یہ بیچارے دیکھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں“ ۔

پہلوان حقے کا کش لگا کر کہتا ہے ”تو چپ رہ کریم انہیں کیا معلوم کیسے کھاتے ہیں کیا کھاتے ہیں ۔ یہ تو بس چینی کی پلیٹیں کھڑکانا ہی جانتے ہیں“ ۔

”ہی ہی ہی ہی“ ۔ پنواڑی کھجاتے ہوئے ہنستا ہے ”بنی سنوری ہوئی نہیں ۔ اس میں جان ہے جان ۔ لہو ہے لہو“ ۔

”کیپسٹن کا پیکٹ“ بابو ایک روپیہ پنواڑی کی طرف پھینکتا ہے اور دفعتاً محسوس کرتا جیسے اس نے ان ننگے بچّوں کے جسموں کو ایک اور کپڑے سے محروم کر دیا ہو ۔ زرد مدقوق عورت کی کھانسی کی آواز گونجتی ہے ۔

”چچا گھی سات روپے سیر ہو گیا“ صمدو یوں آنکھیں چمکا کر چلّاتا ہے جیسے گھی کا مہنگا ہونا بہترین خوشخبری ہو ۔

”ڈیم اٹ“ ڈیوڈ غصّے سے کتابوں کو گھورتے ہوئے کہتا ہے ۔ ”ان لوگ کو کالرا بھی نہیں ہوتا ۔ کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ الٹا قہقہے لگاتا ہے ۔ شیم فیسڈ“ ۔

”چار آنے پاؤ چار آنے“ بھیّا گویا اس کا منہ چڑاتا ہے ۔

”تانگی وچ آماہیا“ فیضو پنواڑی گلے میں ہار ڈال کر اجو کی خالی کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا ماہیا گاتا ہے ۔ اور کالے پُل کی طرف چلے جاتا ہے ۔

”ڈیم اٹ“ ڈیوڈ چلّاتا ہے ۔ ”انہیں ڈیسینٹر بھی نہیں ہوتا“ ۔

”ہی ہی ہی ہی ----“ چارگوٹ میں چاروں طرف سے قہقہے گونجتے ہیں ۔ ”ہی ہی ہی ہی -----“

............○............

ذاتی معاملہ

نہ جانے پاک تارپین فیکٹری پر کیا افتاد آپڑی تھی کہ فیکٹری پر سکوت طاری تھا ملازمین سہمے ہوئے تھے ۔ ان کی بیویوں کی پیشانیوں پر شکن پڑ گئے تھے اور اپنے گھروں میں کھوئی کھوئی بیٹھی تھیں ۔ بچے حیران تھے ۔ عمارتیں ویران دکھائی دیتی تھیں مشینیں چلنے کی بجائے کراہ رہی تھیں ۔

فیکٹری سے تین میل کے فاصلے پر وارنگل کے گاؤں کے کنوئیں پر گھڑے رکھے گندمی بھرپور دوشیزائیں اداس کھڑی تھیں ۔ جن کے قریب گاؤں کی چکی آہیں بھر رہی تھی ۔

ایک ہفتہ قبل فیکٹری میں اس قدر چہل پہل تھی جیسے میلا لگا ہو ۔ کوارٹروں میں مزدوروں کی بیویاں اپنا کام لے کر مل بیٹھتیں ۔ کام کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی بات چھڑ جاتی اور پھر ہاتھ چلتے ، آنکھیں اشارے کرتیں اور قہقہے گونجتے ۔ باہر فیکٹری کے سکول میں بچے کھیلتے اور شور مچاتے ۔ مشینوں پر کام کرتے ہوئے مزدور اور کلرک ان آوازوں کو سنتے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹیں پھیل جاتیں ۔ اور ان کے قہقہے گونجتے ۔

پھر جب چھٹی کا وقت آتا تو مزدوروں اور کلرکوں کا ایک ریلا فیکٹری سے نکل کر کوارٹروں کی طرف چل دیتا ۔ وہ ہاتھوں میں ٹفن کیریر جھلاتے ہوئے ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہوئے اپنے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھتے ۔ پھر ان کی آوازیں کوارٹروں میں گونجتیں ۔ اور پھر جلد ہی گھروں سے نکل کر وہ کھیتوں یا بازار اور یا وارنگل میں جا پہنچتے ۔ بازار میں خرید و فروخت کی گہما گہمی شروع ہو جاتی ۔ کھیتوں میں ماہیا کی تانیں گونجتیں وارنگل کی دوشیزاؤں کی آنکھوں میں مسکراہٹیں جھلکنے لگتیں ۔ کوئیں کا رہٹ گانے لگتا اور گاؤں کی چکی ناچتی ۔

لیکن اب فیکٹری پر سکوت طاری تھا ۔

بچے باغیچے کے پاس چُپ چاپ کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے ان کا جی چاہتا تھا کہ باغیچہ میں جاکر کھیلیں جیسے وہ پہلے کھیلا کرتے تھے ۔ مگر انہیں مالی سے ڈر لگتا تھا ۔ حالانکہ مالی نے انہیں کبھی گھاس پر کھیلنے سے منع نہ کیا تھا ۔

مالی خاموشی سے کھڑا ایک جھاڑی کو بہت بڑی قینچی سے کاٹ رہا تھا ۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا ۔ آنکھوں میں اداسی تھی ۔ اس کے باوجود بچّے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی جھریوں سے ڈرے ہوئے تھے ۔ بچوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یک دم حالات کیوں بدل گئے تھے ۔ سکول میں استادوں نے کیوں گھورنا شروع کر دیا تھا ۔ گھروں میں مائیں انہیں کیوں ڈانٹنے لگیں تھیں ۔ اور ابا یوں چُپ کیوں ہو گئے تھے ۔ انہیں سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس تبدیلی کی وجہ کیا تھی ۔

سکول کے ماسٹروں کا کیا قصور وہ بیچارے تو خود یوں دکھائی دیتے تھے جیسے مظلوم ہوں ۔

پھر اس روز جب فیکٹری کے جنرل مینجر پہلی مرتبہ سکول میں آئے تھے تو پہلی مرتبہ بچے حیران رہ گئے تھے ۔ انہیں اس بات کا یقین ہی نہ آتا تھا ۔ اسی لئے وہ حسب معمول شور مچاتے رہے ۔ پھر جنرل مینجر نے ہیڈماسٹر کے کمرے میں استادوں کو اکٹھا کیا تھا اور دیر تک نہ جانے وہ سب کیا باتیں کرتے رہے تھے ۔

اگلے روز سکول کا ہیڈماسٹر ہمیشہ کے لئے سکول چھوڑ کر چلا گیا تھا ۔ اور سکول میں شور مچ گیا کہ بڑے ماسٹر کو جنرل مینجر نے نکال دیا ہے ۔ اس بات پر بچّے سہم گئے تھے ۔ اور ماسٹروں کی دھمکیاں شدید ہو گئیں ۔

سکول سے نکل کر بچّے خوشی خوشی گھر پہنچتے کہ شاید وہاں حالات بہتر ہوں لیکن جونہی وہ گھر میں داخل ہوتے مائیں گھور کر ان کی طرف دیکھتیں ۔ "آ گئے ہو تم" وہ طنزاً کہتیں جیسے وہ ان کے اپنے بچّے ہی نہ ہوں ۔

ماؤں کی مامتا کم نہیں ہوئی تھی ۔ نہ ہی ان کی طبیعت نے پلٹا کھایا تھا ۔ ان کے دلوں میں بچوں کی محبّت اب بھی ویسے ہی تھی ۔ جیسے پہلے ہوا کرتی تھی ۔ وہ بے چاریاں کیا کرتیں ۔ ان کے دل تو خود کسی ان جانے خوف سے دھک دھک کر رہے تھے ۔ وہ یوں محسوس کرتی تھیں ۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو ۔ ان کا یہ ڈر ان کے خاوندوں کی پریشانی کی وجہ سے تھا ۔ جب بھی وہ کام کاج سے فارغ ہو کر گھر میں داخل ہوتے تو بیویاں ان پر امید بھری نگاہ ڈالتیں ۔ ان کے انداز اور حرکات کا جائزہ لیتیں کہ شاید حالات بدل گئے ہوں اور گھر میں پھر وہی پہلی سی چہل پہل ہو جائے ۔ لیکن ان کے داخل ہونے کا انداز دیکھ کر ان پر اداسی کا ایک گہرا پردہ پڑ جاتا ۔ وہ گھروں میں یوں داخل ہوتے تھے جیسے تھک کر چُور ہو چکے ہوں ۔ جیسے زندگی ایک بوجھ ہو ۔

بیچارے خاوند بھی مجبور تھے ۔ ان کے ماتھے کی تیوریاں غصّے کی مظہر نہ تھیں یہ تو ان کے اپنے دل کا خوف تھا جو ان کے اعضا میں بے چینی بن کر بل کھاتا تھا اور بالآخر شکنیں بن کر پیشانی پر اکٹھا ہو جاتا ۔ جیسے ابال کھانے کے بعد دودھ کی کڑاہی پر بالائی جم جاتی ہے ۔ انہیں خود معلوم نہ تھا کہ فیکٹری کے حالات دفعتاً یوں بدل کیوں گئے تھے ۔ پہلے بھی تو وہ اسی فیکٹری میں ہنس ہنس کر کام کیا کرتے تھے اور کام کرنے کے دوران میں ایک دوسرے پر فقرے بھی چست کرتے رہتے تھے ۔ کام کے دوران میں چھیڑ چھاڑ جاری رہتی تھی ۔ بلکہ اس طرح تو کام اور بھی آسان ہو جایا کرتا تھا ۔ اور جب چھٹی ہوتی تو ذرا سی تھکن بھی محسوس نہ ہوتی تھی ۔ ایک ہفتے سے ان کے سپروائزروں نے حکم نافذ کر دیا تھا کہ کام کے دوران میں باتیں کرنا منع ہے ۔ کیونکہ اس طرح کام میں حرج ہوتا ہے ۔ اس نئے حکم کو سن کر پہلے تو وہ حیران ہو گئے تھے پھر ہنس پڑے تھے "لو یہ بھی کیا حکم ہے" ۔ معراج نے بروزے کے مواد کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہا ۔ "کام کیا زبان سے کیا جاتا ہے" ۔ معراج کی اس بات پر خود سپروائزر نے بھی دبا دبا قہقہہ لگایا تھا ۔ اور بھٹی کے قریب کھڑا کلن تو کھلکھلا کر ہنسنے لگا تھا ۔

اس روز دوپہر کے وقفے کے بعد سپروائزر کو بڑے صاحب کی طرف سے بلاوا آ گیا تھا اور اس کے بعد یہ خبر فیکٹری میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ سپروائزر

کو بڑے صاحب نے برطرف کردیا ہے اور وہ خزانچی سے حساب کتاب کرکے رخصت ہو چکا ہے ۔

اس پر بھی مزدوروں کو یقین نہ آیا تھا ۔ وہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ خبر کسی نے ویسے ہی چلادی ہے ۔ بھلا کوئی ہنسنے پر بھی برطرف ہوا ہے ۔ اب مسکراہٹوں اور قہقہوں پر بھی کنٹرول ہوگیا گیا ۔ معراج اور کلن اس بات پر ہنستے رہے تھے ۔ کلن بار بار کہتا ۔ "لو میرے یار ہمیں بتاتے ہیں ۔ میاں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے ۔ جگہ جگہ کی دھول پھانکی ہے ۔ ہمیں کون بتائے گا ۔ ہاں میاں" ۔ اس کے باوجود آہٹ پر وہ دروازے کی طرف اس امید پر دیکھتے تھے کہ ابھی سپروائزر ہنستے ہوئے داخل ہوگا ۔ اور سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ مگر شام ہوگئی چھٹی کا وقت آپہنچا لیکن سپروائزر داخل نہ ہوا ۔ اس پر اُن کے دلوں میں ان جانا ہراس پیدا ہو گیا ۔ ان کی مسکراہٹیں پھیکی پڑتی گئیں ۔ قہقہے کھوکھلے ہوتے گئے حتّی کہ چھٹی ہوگئی ۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ سپروائزر کی برطرفی کی خبر صحیح ہے تو وہ حیران رہ گئے ۔ "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے ۔"

"نہیں نہیں اس کی کوئی اور وجہ ہو گی" ۔

"لو صاحب اتنی سی بات پر نوکری سے نکال دیا ۔ اچھا مجاق ہے یہ"۔

"کہتے ہیں بڑے صاحب بڑے گسّے میں ہیں بھئی"۔

"لو میاں غصّے میں کون نہیں ہوتا ۔ کسی نا کسی وخت ہر کوئی ہوتا ہے" ۔

"بھئی کہہ جوریا ہوں میں کوئی اور بات ہوگی دراصل"۔

اس شام وہ سب چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر سرگوشیاں کرتے رہے اور دیر تک بازار میں سکول کے پرے گراؤنڈ میں ، باغ میں اور کوارٹروں میں باتیں ہوتی رہیں ۔ لیکن اس کے باوجود کوئی بھی معاملے کی اصلیّت کو نہ پا سکا ۔

اس برطرفی کے بعد باقی ماندہ سپروائزروں نے پنجے نکال لئے ۔ بات بات پر جواب طلبی ہونے لگی ۔ معمولی تساہلی پر جرمانے ہونے شروع ہو گئے ۔

سپروائزروں کے چہرے منجمد ہو گئے ۔ اور ان کی حرکات و سکنات سے معلوم ہونے لگا ۔ جیسے وہ لوہے سے بنے ہوئے ہوں ۔ معمولی سی بات پر سپروائزر دانت بھینچ کر صاحب کے سامنے پیش کرنے کی دھمکی دیتے ۔ اور بڑے صاحب کانام سنتے ہی مزدوروں کے اوسان خطا ہو جاتے کیونکہ بڑے صاحب کے سامنے جو شخص بھی پیش کیا جاتا اسے فوری برطرفی کا پروانہ مل جاتا ۔

فیکٹری کے سبھی لوگ حیران تھے کہ صاحب کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا ہے ۔ اس سے پہلے تو صاحب نے کبھی ایسی بات نہ کی تھی ۔ اسے اس فیکٹری میں جنرل مینجری کرتے چھ سال ہو چکے تھے ۔ فیکٹری کے معاملات میں وہ دخل تو دیتا تھا ۔ لیکن اس کی نوعیّت صرف کاغذی ہوتی تھی ۔ اس نے کبھی فیکٹری کا چکر نہ لگایا تھا ۔ مزدوروں سے براہِ راست وہ کبھی نہ ملا تھا ۔ اور نہ ہی اس نے معمولی کوتاہیوں کو درخور اعتنا سمجھا تھا ۔ الٹا وہ تو فیکٹری کے کارندوں سے اظہارِ ہمدردی کیا کرتا تھا ۔ مثلاً جب سپرنٹنڈنٹ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے فوت ہوگیا تھا تو اس نے اس کے کم سن بچّوں کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں ۔ سٹور کیپر فضل الٰہی کی ناگہانی وفات پر اس نے اس کی جگہ اس کے بڑے لڑکے کی تقرری کردی تھی ۔ حالانکہ وہ بچّہ پورے طور پر بالغ بھی نہ ہوا تھا ۔ اور فیکٹری کے قانون کے مطابق اسے ملازمت دی ہی نہ جا سکتی تھی ۔ پھر اچھا کام کرنے والوں کے لئے صاحب نے انعامات دینے کی رسم ڈالی تھی اور فیکٹری کے ملازمین کے بچّوں کو مفت تعلیم دلانے کی خاطر حکومت کو مجبور کرکے وہیں ایک انگریزی سکول کھلوا دیا تھا ۔ اور ملازمین کی تفریح کے لئے کھیلیں شروع کردی تھیں ۔

لیکن اب سبھی سمجھنے لگے تھے کہ تمام قصور جنرل مینجر کا ہے ۔ فیکٹری کے مزدوروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں ۔ جنہیں اکبر علی اور کلن نے ہوا دی ۔ مزدوروں نے دو ایک جلسے کئے ۔

مزدوروں کے حقوق پر تقریریں کی گئیں اور طے پایا کہ مزدوروں کا ایک وفد بڑے صاحب سے ملے ۔ لیکن صاحب کا رویہ دیکھ کر وفد

کے لیڈر نے پینترہ بدل لیا اور پھر جب چند روز کے بعد اکبر علی کی برطرفی کا حکم سنایا گیا تو فیکٹری پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا اور مزدوروں کے سر جھک گئے ۔ مزدور یہ سمجھتے تھے کہ اس تبدیلی کی تمام تر ذمہ داری جنرل منیجر پر ہے ۔ یہ بات ان کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ جنرل منیجر سے بڑا کوئی اور شخص بھی ہے ۔ جس کی بات جنرل منیجر پر حاوی ہے ۔ وہ اس بات کو کیسے سمجھ سکتے بھلا ۔ ان کے خیال میں تو فیکٹری کے معاملات میں جنرل منیجر کا حکم حرفِ آخر تھا ۔ انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں ۔ جو جنرل منیجر کو مینیج کریں ۔ اور جن کے روبرو جنرل منیجر کی حیثیت ایسی ہو جیسے مزدوروں کی سپروائزر کے سامنے ہوتی ہے ۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ جنرل منیجر کو مینیج کرنے والی کا نام انوری تھا ۔ جسے وہ پیار سے انو کہا کرتے تھے ۔ لیکن وہ تو سمجھتے تھے کہ وہ ان کی دوسری بیوی ہے ۔ اور ان کے خیال کے مطابق تو بیوی وہ ہوتی ہے جو میاں کی ہر بات مانے اور اس کے اشاروں پر چلے ۔ ویسے شادی سے پہلے انوری نے صمد کو یہی اعتبار دلایا تھا کہ وہ ان کے اشاروں کی طالب ہے اور صمد کو انوری کی یہ بات ایسی پیاری لگی تھی کہ اسی وجہ سے اسے انوری سے عشق ہو گیا تھا اور اس نے انوری کو شادی کا پیغام دے دیا تھا ۔ لیکن جلد ہی اس کے اشاروں کا تسلسل ٹوٹ گیا یا شائد اس لئے کہ انوری اشاروں پر کچھ زیادہ ہی چلنے کی متوالی تھی ۔

صمد کو آپ نے شاید کبھی نہ دیکھا ہو ۔ کیونکہ وہ مجلسی آدمی نہیں اور سماجی تقاریب پر شامل ہونے کا دلدادہ نہیں ۔ اگر آپ نے اسے دیکھا بھی ہے تو بھی وہ اس قسم کا فرد ہے جسے دیکھ کر بھی آپ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے ۔ کیونکہ اس میں کوئی ایسی خصوصیّت نہیں جس کی وجہ سے آپ اس کی طرف غور سے دیکھیں۔نہ ہی وہ اس قدر خوبصورت ہے کہ نگاہ پر چڑھ جائے اور نہ ہی ایسا بدصورت کہ آپ اسے دیکھنے پر مجبور ہو جائیں ۔ وہ ایک عام سا جوان ہے ۔ کالج میں بھی وہ زیادہ میل جول کا شوقین نہ تھا ۔ اگرچہ اس کی طبیعت میں جھجک نام کو نہ تھی ۔ نہ ہی وہ احساسِ کمتری کا شکار تھا ۔ لیکن وہ فضول وقت ضائع کرنا

پسند نہ کرتا تھا اور نہ ہی اسے یہ شوق تھا کہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے ۔

صمد کو پڑھنے کا شوق تھا اور حالانکہ سائنس کا طالب علم تھا مگر وہ مغربی لٹریچر کے ایک بڑے حصّے کا مطالعہ کر چکا تھا ۔

اس کے والدین اوسط حیثیت کے مالک تھے اور بڑی مشکل سے اسے تعلیم دلا رہے تھے ۔ اس لئے وہ فارغ البالی کے احساس سے نا واقف تھا ۔ اس کے پاس نہ تو تفریح کے لئے روپیہ تھا اور نہ ہی وقت ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وقت کا زیادہ تر حصّہ کمرے میں بیٹھ کر مطالعہ کرنے میں صَرف کرتا رہا ۔ اور ایم۔ایس۔سی میں ایسی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ٹرپنٹائن فیکٹری کے شعبۂ تحقیق میں اسے تارپین کی متعلقہ مصنوعات کی تحقیق کرنے کی ایک آسامی مل گئی ۔

ان دنوں صمد ابھی عبدالصمد ہی تھا ۔ ابھی وہ اے صمد نہیں ہوا تھا ۔ ایک تو اسے ان رقموں کے ادا کرنے کی فکر تھی ۔ جو اس کی تعلیم کے لئے اس کے والد کو قرض لینی پڑی تھیں ۔ دوسرے والدین کی خدمت کا خیال اس کے پیش پیش تھا ۔ جنہوں نے اتنی بڑی قربانیاں دے کر اسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی ۔ اور بالآخر اسے اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی تعلیم کا فریضہ ادا کرنا تھا ۔ لہٰذا اس کے ذہن میں تفریح یا مشاغل کا کبھی خیال ہی نہ آیا تھا ۔ آپ جانتے ہیں عشق و محبت بے فکری اور فرصت کی پیداوار ہیں ۔ حالانکہ جس مکان میں صمد رہتا تھا اس کے قرب و جوار میں بھی مکانات تھے ۔ چوبارے اور کوٹھے تھے ۔ ان مکانوں میں کھڑکیاں تھیں ۔ جن میں سفید بازو حرکت کرتے تھے ۔ سرمگیں آنکھیں جھانکتیں تھیں ۔ لٹیں اڑتی تھیں اور رنگین آنچل لہراتے تھے ۔ چھتوں پر رنگین بوتلیں سی چلتی پھرتی تھیں ۔ خود ان کے گھر میں عزیز و اقارب کی جوان لڑکیاں آتی جاتی تھیں اور وہ اندر بیٹھ کر جان بوجھ کر سریلی ہنسی ہنسا کرتی تھیں جیسے کہ نوجوان لڑکیوں کی عادت ہوتی ہے ۔ یہ آوازیں صمد کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں ۔ جنہیں سن کر اس کا دل بھی دھک سے رہ جاتا تھا اور چند ساعت کے لئے کیمسٹری کی کتاب کے فارمولے گڈمڈ ہو جاتے تھے اور وہ چند ایک منٹ

کے لئے کتاب بند کرنے پر مجبور ہو جاتا ۔ لیکن جلد ہی حقائق اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتے اور فارمولے پھر سے ترتیب میں آجاتے اور مطالعہ شروع ہو جاتا ۔

تارپین فیکٹری میں آسامی مِلتے ہی بیاہ کی بات شروع ہو گئی اور جلد ہی سرگوشیوں سے ابھر کر گھر میں باآوازِ بلند اس موضوع پر باتیں ہونے لگیں ۔ صمد نے پہلی مرتبہ سنا تو اس نے شانے جھٹک کر منہ سا بنا لیا ۔ کیونکہ اُسے شادی کی بات پسند نہ تھی ۔ لیکن اس کی بات کو کون پوچھتا تھا وہاں ۔ اور خالی شانے جھٹک کر منہ بنانے سے کیا ہوتا ہے ۔ صمد کے والدین سوسائٹی کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں شادی کے بارے میں بڑے سے بڑا اور واضح احتجاج بھی والد کی ایک "اہم" سے فرو کردیا جاتا ہے اور یہی ہوا ۔ ایک روز اس کے والد عبدالرحیم اپنا بڑا سا مخصوص کھونٹ اٹھائے اس کے پاس آبیٹھے اور کہنے لگے ۔ "بیٹا اب یہ نیک کام جلد از جلد سر انجام ہو جانا چاہیئے ۔ تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہوا ہے بیٹا سمجھے" ۔ اس وقت صمد کو شانے جھٹک کر منہ بنانا بھی یاد نہ رہا تھا ۔ نہ ہی اس زمانے میں اسے احساس تھا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی اور کو دخل دینے کا حق نہیں ۔ صمد نے والد کی بات کے جواب میں سر جھکا لیا تھا اور بات طے ہوگئی تھی ۔ یہ تو اس کے والد کی شرافت تھی کہ انہوں نے اس سے اس موضوع پر بات کی تھی ۔ ورنہ اگر وہ اس سے بات کئے بغیر ہی تاریخ مقرر کر دیتے تو ۔ بہر حال دو ماہ کے اندر اندر صمد کی شادی اس کے چچا کی بیٹی سلمٰی سے ہوگئی ۔ اور سلمٰی صمد کی جرابیں دھونے نکٹائیوں پر کلف کرنے ، پتلونیں رفو کرنے اور دیگر ضروریات پوری کرنے کا خیال رکھنے لگی ۔ سلمٰی کی آمد صرف صمد کے آرام کا باعث ہی نہ تھی ۔ بلکہ سبھی لوگ اس سے بے حد خوش تھے ۔ صمد کے والد اور والدہ تو پہلے سے ہی اس کی آمد کے متمنی تھے ۔ انہوں نے تو خوش ہونا ہی تھا ۔ صمد کا بڑا بھائی امجد جو اس رشتے سے خوش نہ تھا ۔ اسے بھی سلمٰی نے چند ہی دنوں میں رام کر لیا تھا ۔ صمد کی چھوٹی بہن اور بھائی تو سلمٰی پر جان دینے لگے تھے اور پڑوسی اور عزیز و اقارب اس کے مداح ہو گئے تھے ۔ وہ خالی صمد کی بیوی ہی نہ تھی ۔ بلکہ ایک اچھی بہو اور بھابی اور اچھی پڑوسن بھی تھی ۔

ایک سال کے اندر اندر اچھے کام کی وجہ سے صمد کو شعبۂ تحقیق کا صدر بنا دیا گیا اور ابھی اس نے دوسال کی نوکری مکمل نہ کی تھی ۔ کہ اسے تحقیق کے شعبہ سے نکال کر اسسٹنٹ مینجر بنا دیا گیا اور تقسیم کے بعد جب فیکٹری کا نام پاک تارپین فیکٹری رکھا گیا تو ساتھ ہی اسے جنرل مینجر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا اور سلمٰی اور صمد اپنا کوارٹر چھوڑ کر بنگلے میں منتقل ہو گئے ۔ بنگلے کے ساتھ ہی انہیں ایک چھ سلنڈر کی بیوک کار اور بیرہ ، خانساماں ، شوفر اور دیگر مراعات حاصل ہوگئیں جو جنرل مینجر کے عہدے کے ساتھ وابستہ سمجھی جاتی تھیں ۔

اس تبدیلی کے باوجود سلمٰی کی زندگی میں چنداں فرق پیدا نہ ہوا ۔ نوکر چاکر کے باوجود وہ صمد کی جرابیں دھوتی رہی اور اس کی نکٹائیوں پر کلف چڑھاتی رہی اور اس کی جملہ ضروریات کا خود خیال رکھتی رہی ۔

اس تبدیلی کے بعد صمد محسوس کرنے لگا کہ اتنے بڑے منصب پر پہنچنے کے باوجود اس کی زندگی گھریلو قسم کی ہے ۔ اور اس کی بیوی میں وہ شوخی نہیں جو کہ متمدن بیویوں میں ہوتی ہے ۔ بلکہ اسے تو یہ بھی گلہ تھا کہ وہ خالی بیوی ہی رہی بیوی سے ابھر کر بیگم نہ بن سکی ۔ دراصل اب صمد کے راستے میں مالی مشکلات نہ تھیں ۔ پرانے قرض وہ عرصہ ہوا اتار چکا تھا ۔ چھوٹا بھائی اور بہن دونوں فارغ التحصیل ہو چکے تھے ۔ بڑا بھائی تو خیر پہلے سے زمینداری کے کام میں مصروف تھا ۔ والد اور والدہ انتقال کر چکے تھے ۔ اور محنت کا سوال تو اب پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ۔ آپ جانتے ہیں کہ جنرل مینجر ہو جانے کے بعد اگر محنت کی جائے تو وہ محنت نہیں بلکہ تفریح محسوس ہوتی ہے ۔ کیونکہ اس میں اقتدار کے نشے کا عنصر شامل ہوتا ہے ۔

اب وہ عبدالصمد نہ رہا تھا بلکہ اے صمد ہو چکا تھا ۔ اب ایسی باتیں سوچنے کے لیے اس کے پاس بہت وقت تھا ۔ بلکہ اپنی عظمت کے احساس کی پرورش کرنے کے سوا اب اس کا ذہن کسی اور بات کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا ۔

لیکن اس کے باوجود صمد فطری طور پر ایک اچھا خاوند تھا ۔ وہ سلمٰی کے نقائص کو دل ہی دل میں محسوس کرتا ۔ لیکن اس کے باوجود اسے کبھی خیال نہ

آیا تھا کہ وہ اس سے قطع تعلق کر سکتا ہے ۔ حالانکہ قطع تعلق کے لئے اس کے پاس ایک موزوں بہانہ بھی تھا کہ سلمٰی کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی ۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی زندگی اطمینان سے گزار رہا تھا ۔

آہستہ آہستہ اسے سلمٰی کے خلاف کئی شکایات پیدا ہوتی گئیں ۔ اول تو یہ کہ اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہ تھا ۔ اچھے کپڑے تو وہ اس کے کہنے پر پہن لیتی تھی ۔ مگر ان میں یوں مقید ہو جاتی ۔ جیسے وہ ریشم کے تاروں سے نہیں بلکہ لوہے کی سلاخوں سے بنے ہوئے ہوں ۔ پھر وہ سنگار کے فن سے قطعی نا واقف تھی ۔ منہ پر پاؤڈر لگانا تو وہ گناہ سمجھتی تھی اور لپ سٹک پر لاحول پڑھتی تھی ۔ سلمٰی کو بال بنانے کے ڈھنگ سکھانے کے لئے صمد نے کئی ایک تصاویر مہیا کی تھیں اور اسے کئی ایک لیکچر پلائے تھے مگر سب بے سود ۔ صمد کا حکم ماننے کے بعد وہ ہنس کر کہتی ۔ "توبہ اس طرح تو سر میں درد ہونے لگتا ہے" ۔ اور پھر جلد ہی بالوں کو کھول کر رسمی طریقے سے چوٹی گوندھ لیتی ۔ البتہ وہ آنکھوں میں کاجل ضرور لگاتی تھی ۔ مگر خالی کاجل لگانے سے کیا ہوتا ہے ۔ پھر اسے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ لوگوں سے ملتی نہیں ۔ اور اگر عورتیں آ بھی جاتیں تو بات کرتے ہوئے صرف دو جملے دہراتی رہتی تھی ۔ "اچھا جی؟" "ہاں جی" اور بس جیسے وہ بیگم نہیں بلکہ باندی ہو ۔

سلمٰی خوبصورت تھی ۔ اس کا جسم متناسب تھا اور خدوخال تیکھے تھے رنگ تو بہت ہی گورا تھا ۔ مگر اس کی حرکات میں نہ لَے تھی اور نہ آواز میں لوچ اور سب سے بڑی شکایت جو اَب صمد کو اس کے خلاف تھی ۔ کہ اس کا چناؤ اس نے خود نہیں کیا تھا ۔ اگرچہ اس شکایت کا اظہار اس نے کبھی نہ کیا تھا ۔ لیکن یہ شکایت اس کے دل میں روز بروز تقویّت پکڑتی جا رہی تھی ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آرزو ابھرتی آ رہی تھی کہ کاش وہ اپنے چناؤ کی لڑکی سے بیاہ کرتا ۔

پھر ایک روز بیٹھے بٹھائے سلمٰی کی حرکتِ قلب بند ہو گئی اور صمد تنہا رہ گیا ۔ وہ بھاگا بھاگا فیکٹری سے گھر پہنچا ۔ ڈاکٹر بلوائے ۔ معائنے کروائے ۔ لیکن اس کی یہ کوششیں سلمٰی کو واپس نہ لا سکیں ۔

کچھ دیر وہ اس کی چارپائی کے پاس بیٹھا رہا ۔ پھر اضطراب میں ٹہلنے لگا ۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ سلمٰی فوت ہو چکی ہے ۔ وہ چارپائی پر یوں چُپ چاپ پڑی تھی جیسے سو رہی ہو ۔ اس کے نقوش اور بھی تیکھے ہو گئے تھے ۔ اس کے ہونٹ حسبِ دستور بھنچے ہوئے تھے ۔ اور ہونٹوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ کے نشانات تھے ۔ جیسے کام کرتے کرتے تھک کر لیٹ گئی ہو ۔

سلمٰی کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ صمد گھر میں ایک خلا محسوس کرنے لگا اور غم اس کے دل میں بوند بوند گرنے لگا ۔ حالانکہ وہ کہا کرتا تھا ۔ "سلمٰی تمہیں خود کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اتنے نوکر چاکر ہیں پھر بھی تم خود کام کرتی ہو ۔ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا" ۔ لیکن اس کی موت کے بعد اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا جیسے کام کاج کے لئے نوکر کافی نہ تھے ۔ اس کی جرابیں تو دھل ہی جاتی تھیں ۔ نکٹائیوں پر کلف بھی ہو جاتا تھا ۔ مگر نہ جانے وہ دھلی ہوئی جرابیں کیوں دھلی ہوئی محسوس نہ ہوتی تھیں ۔ اور نکٹائیوں کے کلف میں نہ جانے کیا خامی رہ جاتی تھی ۔

کچھ عرصے تک تو وہ پریشاں حالی میں گھر میں گھومتا رہا پھر وہ باہر نکل گیا اور میل ملاقات کے شغل میں گھر کو بھولنے کی کوشش شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس کے بنگلے میں بیگم اطہر ، مسز دوبے ، مسز سہگل ، نعیمہ ، حامدہ اور رفیقہ کے قہقہے گونجنے لگے اور چارپائی پر سوئی ہوئی سلمٰی کے نقوش مدھم پڑتے گئے ۔

ایک سال کے اندر اندر صمد ، اے صمد سے مسٹر صمدؔ بن گیا اور اسے جرابیں دھونے اور نکٹائیوں پر کلف کرنے والی بیوی کے خیال پر ندامت محسوس ہونے لگی ۔ اور اس کی وہ خواہش جو سلمٰی کے انتقال پر دب کر رہ گئی تھی ۔ پھر شدت سے عود کر آئی کہ اس کے گھر میں اس کے اپنے چناؤ کی بیوی ہو ۔ ایک ایسی بیوی جو گھر کی بیگم بن سکے جو اعلٰے طبقے کے لوگوں سے میل جول کی صلاحیت رکھتی ہو ۔ جو ڈنر، لنچ اور کافی پارٹیوں کا انتظام کر سکے اور پھر ان پارٹیوں میں اپنے سنگار ، لباس اور حرکات سے توجہ کا مرکز بن سکے ۔

ابھی وہ یہ خواب دیکھنے میں مصروف ہی تھا کہ مس انوری ہوائی کی طرح "شوں ۔۔" سے اس کے حلقے میں آ داخل ہوئی اور اسے دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا ۔ اس قدر دنگ رہ گیا کہ اسے سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی ۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ اسے اپنی بیگم بنانے کے خیال کو جانچتا اور انوری کی روشنی میں اپنے مستقبل کا جائزہ لیتا وہ اس کے روبرو گھٹنوں پر گر کر اظہارِ محبّت کر چکا تھا ۔ جس کے جواب میں انوری نے ایک رنگین قہقہہ لگایا تھا اور ترچھی نظروں سے التفات کا وعدہ کرنے کے باوجود بے نیازی سے بات کو ٹال دیا تھا ۔ اس سے صمد کے دل کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی تھی اور وہ سوچنے کے قابل ہی نہ رہا تھا ۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جو عورت اس قدر شدت سے اثر پذیر ہو کہ آپ میں سوچنے کا ملکہ نہ رہے ۔ اس سے محبت ہو جانا مرد کے لئے قدرتی امر ہے تو مختصر یہ کہ انوری کے اثر سے صمد پر یہ قدرتی امر مسلّط ہو گیا ۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی ماہ میں دونوں کی شادی ہو گئی ۔

شادی سے چند روز پہلے اس کا بڑا بھائی امجد آ گیا ۔ اس نے صمد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے عزیزوں میں سے کسی کی لڑکی منتخب کر لے لیکن صمد ہنس پڑا اور کہنے لگا ۔ "نہیں بھائی جان یہ میرا ذاتی معاملہ ہے ۔ اس میں دخل دینے کا کسی کو حق نہیں" اور امجد خاموش ہو گیا ۔ افسر بھائی کے سامنے چپ ہونے کے سوا وہ کر ہی کیا سکتا تھا ۔

شادی کے بعد چھ مہینے تک صمد حواس باختہ رہا ۔ اس کی زندگی درت لے پر ناچتی رہی ۔ گھر قہقہوں سے گونجتا رہا ۔ اس کے روبرو اکسانے والی سیاہ آنکھیں اسے مشتعل کرتی رہیں ۔ سرخ ہونٹ اس کے اعصاب پر بیر بہوٹیاں بن کر رینگتے رہے ۔ سفید بازو اسے یوں جھلاتے رہے جیسے وہ روتا ہوا ایک بچہ ہو ۔ خوشبوئیں کونوں سے نکل کر اسے گھیر لیتیں اور پھر انوری کی طرف اشارے کر کے مسکراتیں ۔

وہ یوں حواس باختہ رہا جیسے کوئی جاٹ میلے میں جا پہنچا ہو یا جیسے بچہ مٹھائیوں کے ڈھیر تلے دب گیا ہو ۔

صرف وہی نہیں سارا ماحول اس کے ساتھ اس رقص میں مصروف تھا ۔ فیکٹری کی مشینیں انوری کے گیت گاتی تھیں ۔ گاؤں کی چکی چلّاتی "انوری انوری" مزدور قہقہے لگاتے تھے ۔ اور پھر کام کاج سے فارغ ہو کر سرسوں کے کھیتوں میں انوری صمد کے ماہیئے الاپتے تھے ۔ اور بچے سکول میں تالیاں پیٹتے تھے ۔ بچوں مشینوں اور مزدوروں کو اپنی خوشی میں شریک محسوس کر کے صمد کا جی چاہتا کہ وہ ان سب کو اتنی بخشیش دے کہ وہ خوش ہو جائیں ۔ پھر وہ احکامات جاری کرتا ۔ ان کے بچّوں کو مفت تعلیم دینے کے لئے سکول کھول دیا جائے ۔ اور ان کے کوارٹر فراخ کر دیئے جائیں ۔ ان کی تفریح کے لئے کلب کھول دیا جائے ۔ اور ان احکامات پر بچوں کی تالیاں اور تیز ہو جاتیں ۔ مزدوروں کے قہقہے اور گونجتے اور ان کے گیت اور سریلے سنائی دیتے ۔

پھر دفعتاً ایک روز صمد پر انکشاف ہوا کہ وہ سوچ رہا ہے ۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ تھک گیا ہے اس مٹھاس کی شدّت سے اکتا گیا ہے اس نے محسوس کیا کہ اسے تنہائی کی ضرورت ہے ۔ انوری تو اس کی ہو چکی تھی ۔ زندگی کی مسرّت تو اُسے حاصل ہی تھی ۔

دراصل وہ چاہتا تھا کہ وہ مسرّت پیش منظر سے نکل کر پس منظر میں چلی جائے ۔ اور اس کے دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے ۔ اس خیال پر دفعتاً اس چارپائی کے دھندلے نقوش ابھرنے لگے ۔ جس پر کسی زمانے میں سلمٰی لیٹی ہوئی تھی ۔ جیسے سو رہی ہو ۔ سلمٰی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں ہلکی سی طنز دیکھ کر وہ چونک گیا ۔ اور گہری سوچ میں پڑ گیا ۔

لیکن سوچ بچار انوری کے لئے قابل قبول نہ تھی ۔ وہ سوچنے کی مہلت دینے کے خلاف تھی ۔ اس کے لئے زندگی ایک مسلسل تموّج تھا ۔ اس کی روح میں پیام حیات سلگتا نہ تھا ۔ بلکہ شعلہ جوالا کی طرح بھڑکتا تھا۔

انوری صمد کو اس لئے محبوب تھی کہ اس میں شوخی تھی ۔ شوخ تو وہ تھی مگر وہ اس حد تک شوخ تھی کہ شوخی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا ۔ اس کی شوخی سکون کے پس منظر پر ایک لہر نہ تھی بلکہ وہ شوخی پیش منظر پر ایک طوفان

تھی ۔

جب انوری نے محسوس کیا کہ صمد بیٹھ کر سوچنے لگا ہے تو اسے دھچکا سا لگا ۔ یہ اس کے سحر کی توہین تھی ۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں کا تکلم کم ہو رہا ہے جیسے اس کی مسکراہٹ کی دل کشی میں فرق آگیا ہے اور اس کے حسن کی روشنی مدھم پڑتی جارہی ہے ۔ یہ محسوس کرکے انوری نے زندگی کی موم بتی کو دونوں طرف سے جلا دیا ۔ اور رقص کی لے کو اور تیز کر دیا ۔ اور تیز ۔

صمد کچھ دیر تک تو اس کے ساتھ گھسٹتا رہا ۔ جیسے بچہ جوان کے ساتھ ساتھ چلتا تو ہے مگر پھر تھک جاتا ہے ۔ اسی طرح صمد ایک روز تھک کر گر پڑا لیکن انوری ازلی طور پر رقاصہ تھی ۔ اس کے لئے رقص ہی زندگی تھا ۔ اور تھکنا یا رکنا اس کے لئے ممکن ہی نہ تھا ۔ اس نے صمد کو رکتے ہوئے دیکھا ۔ ممکن ہے اس نے یہ چاہا ہو کہ وہ صمد کے ساتھ رک جائے ۔ مگر فطری طور پر وہ مجبور تھی ۔ اس لئے وہ رک نہ سکی ۔

صمد کے اشاروں پر چلنے والی انوری کو اشاروں پر چلتے رہنے کا جنوں تھا ۔ اب اگر اشارے کرنے والا ہی تھک جائے تو ایک نیا کھلاڑی میدان میں آکر اشارے کرنے لگے تو ۔۔۔؟ بھلا وہ بے چاری کر ہی کیا سکتی تھی ۔

مسٹر زیڈ احمد کے آنے پر یک دم منظر بدل گیا اور انوری کی توجہ صمد سے ہٹ کر احمد پر مرکوز ہو گئی اور صمد سوچنے لگا ۔ لیکن سوچنے سے زندگی کا دھارا رکتا نہیں ۔

تنہا بنگلے میں بیٹھ کر صمد سوچتا رہتا ۔ اور پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور دیوانہ وار ٹہلنے لگتا ۔ حتیٰ کہ انوری پارٹی سے واپس آکر حسین انداز میں کہتی ۔ "ڈارلنگ آج پارٹی میں بڑا لطف رہا ۔ احمد نے تو حد کر دی" ۔ احمد کا نام سن کر صمد کے ذہن میں ایک دھماکا سا ہوتا اور پھر ایک خلا پھیل جاتا اور وہ انوری کی بات سنے بغیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے سنگار کو دیکھتا جو روز بروز شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور چارپائی پر پڑی ہوئی لاش کے ہونٹوں کی مسکراہٹ میں طنز واضح ہوتا جاتا ۔

پھر لوگ انوری اور احمد کی باتیں کرنے لگے یہ باتیں پہلے سرگوشیوں میں شروع ہوئیں اور پھر جلد ہی بلند ہوگئیں ۔ اتنی بلند کہ صمد کے کانوں تک آپہنچیں اور ایک روز وہ ایک عزم کے ساتھ اُٹھ بیٹھا ۔ اور دفتر سے نکل کر گھر جا پہنچا ۔ اسے داخل ہوتے دیکھ کر انوری ایک ادا سے اس کی طرف بڑھی ۔ "ڈارلنگ کل پارٹی میں ۔۔"

"بڑا لطف رہا" ۔ "وہ غصّے میں چلّایا ۔ "اور مسٹر احمد نے حد کر دی یہی نا ۔۔"

"صمد" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگی ۔

"دیکھو انوری" وہ غصّے میں چلّایا ۔ "آج سے تم احمد سے نہیں ملو گی" ۔

"کیا مطلب" پہلی مرتبہ وہ تنک کر بولی ۔

"مطلب وطلب نہیں ۔ میں کہتا ہوں تم احمد سے نہیں مل سکتی" ۔

"لیکن کیوں" ۔ وہ چلّائی ۔ "کسی سے ملوں یا نہ ملوں ۔ اس میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں ۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے" ۔

"ذاتی معاملہ" صمد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا ۔

چارپائی پر پڑی ہوئی لاش اُٹھ بیٹھی ۔ "ذاتی معاملہ ؟" اس نے حیرانی سے انوری کی طرف دیکھا ۔ پھر وہ مڑی اور صمد کی طرف دیکھنے لگی ۔ اور پھر ایک مدھم مگر بھیانک قہقہہ سنائی دیا ۔

"ذاتی معاملہ، ذاتی معاملہ" فیکٹری کی مشینوں نے شور مچا دیا ۔

سکول کے بچے تالیاں پیٹنے لگے ۔

مزدوروں نے ایک قہقہہ بلند کیا ۔

"ذاتی معاملہ" گاؤں کی چکی قہقہہ مار کر ہنسی ۔

صمد آگ بھبھوکا ہو کر گھر سے باہر نکل آیا ۔ "سپروائزر ۔۔ بند کرو اس شور کو بند کرو ۔ یہ لوگ کام وام کچھ نہیں کرتے ۔ سارا دن قہقہے لگاتے رہتے ہیں ۔ حکم کر دو کہ کام کاج کے وقت کوئی کسی سے بات نہ کرے" ۔

لمبے لمبے ڈگ بھر کر صمد دفتر میں داخل ہو گیا اور اس نے دروازہ اور کھڑکی

بند کردی ۔

"ٹا ۔۔۔ ٹی" "ٹا ۔۔۔ ٹی" دفتر کی گھڑی زیر لب بولی ۔ صمد نے دیوانہ وار اس کے پنڈولم کو نوچ کر فرش پر پھینک دیا ۔

فیکٹری پر ہو کا عالم طاری ہو گیا ۔

مزدور سہم گئے ان کی بیویوں کی پیشانیوں پر شکن پڑ گئے ۔ بچے گھبرا کر خاموش ہو گئے ۔ مشینیں کراہنے لگیں ۔ گاؤں کی چکی آہیں بھرنے لگی اور رہٹ نے بین کرنے شروع کر دیے ۔

مینا کے پاؤں

مینا میں دو خصوصیات تھیں ۔ ایک تو اس کے پاؤں جلتے رہتے تھے ، دوسرے اس کی ناک سونگھنے کے معاملے میں بے حد حساس تھی ۔ پھولوں کی خوشبو کی بات نہیں نہ ہی چنے اور سیاہی کی سی خصوصی چیزوں کی بُو باس کی بات ہے ۔ وہ تو ڈھکنا اٹھائے بغیر ہنڈیا میں پڑی ہوئی چیز کو بھانپ لیتی تھی ۔ اسی سے تو اسے گھر میں سبھی بڑی ناک والی کہتے تھے ۔ اور اس کے جلتے پاؤں کو مذاق سے مکی کے بُھٹے کہتے تھے اپنے جلتے پاؤں سے وہ عاجز آچکی تھی ۔

اس واقعہ کی تمام تر ذمہ داری مینا کے پاؤں اور ناک پر عائد ہوتی ہے ۔ ایک تو اس کے خم دار گلابی پاؤں جلتے تھے خصوصاً گرمیوں میں جبھی وہ ننگے پاؤں فرش پر چلنے میں بے حد تسکین محسوس کیا کرتی تھی ۔ سکول سے آتے ہی گُرگابی اتار کر پھینک دیتی اور پھر فرش پر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر گھومتی پھرتی اور خواہ مخواہ ہنستی ہنسے جاتی جیسے صرف جوتا اتارنے سے وہ جنّت میں آپہنچی ہو ۔

مینا کے پاؤں فرش کی ٹائیلوں سے چھوتے تو وہ انوکھی پُر لطف ٹھنڈک محسوس کرتی ۔ عجیب سی لذّت ۔ پھر وہ فرش پر پانی چھڑک کر اسے اور ٹھنڈا کرتی اور پھر گیلے فرش پر چلتی ۔

حالات اگر اسی پر اکتفا کرتے تو بھی بات طول نہ کھینچتی اور جلتے پاؤں کو ٹھنڈا کرنے کی معصوم عادت ایسے خطرناک نتائج پیدا نہ کرتی ۔ نہ مجھے اس کو بیان کرنے کی کوفت ہوتی اور نہ آپ کو سننے کی مصیبت ۔ مگر حالات کو آپ جانتے ہی ہیں ۔ حالات کو کون نہیں جانتا ۔

ایک روز بیٹھے بٹھائے مینا پر انکشاف ہوا کہ پاؤں کو گیلا کر کے پنکھی سے ہوا

دی جائے تو وہ لذت کئی گنا بڑھ جاتی ہے ۔ اس کے بعد مینا کا یہ معمول ہو گیا کہ سکول سے آئی ۔ جوتا اُتارا ۔ ننگے پاؤں اِس کمرے سے اُس کمرے میں گئی ۔ اُس کمرے سے اِس کمرے میں آئی ۔ اِدھر گھومی اُدھر گئی ۔ اور پھر کھانا کھا کے کتابیں لے کر چارپائی پر جا بیٹھی اور چارپائی کے پاس پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھ لی اور ساتھ ہی ایک ہاتھ کا پنکھا بھی ۔ پھر منہ میں پنسل ڈال حساب کی کتاب کھول کر بیٹھ گئی ۔ اور ایک آدمی ایک کام کو چار دن میں کرتا ہے ۔ گنگناتے ہوئے آن جانے میں پانی کی ایک کٹوری بالٹی سے نکال پیروں پر ڈالی اور پنکھے سے پاؤں کو ہوا کرتے ہوئے منہ میں پنسل ڈالے سوچنے لگی ۔ کہ پانچ آدمی اُس کام کو کتنے دنوں میں کریں گے ۔

اسے یوں بے خبری میں پاؤں کو پنکھا جھلتے ہوئے دیکھ کر گھر والے ہنستے بڑا بھائی سرور قہقہے لگاتا اور پھر یوں چلّاتا جیسے سبق یاد کر رہا ہو ۔ ”بھٹیارن بُھٹے بھون رہی ہے‘ ۔ دور چھوٹا غذن چیختا ۔ ”کہاں ہیں بُھٹے“ ۔ اور ماں مسکرا کر کہتی ۔ ”اونہہ بُھٹے نہیں سیخ کباب“ ۔

اس پر مینا اضطراب بھری کروٹ لیتی ۔ پنکھا ہاتھ سے گر جاتا ۔ ‘فضول” وہ ہونٹ نکال کر کہتی ۔ ”میرا سارا سوال بُھلا دیا ۔ سب تباہ کر دیا ۔ یہ بھائی جان تو خواہ مخواہ رنگ میں بھنگ ڈالتے ہیں‘ ۔ ”اونہوں“ سرور جواب دیتا ”رنگ تو جوں کا توں قائم ہے ۔ بلکہ اور بھی نکھر آیا ہے“ دیکھ لو وہ مینا کے پاؤں کی طرف اشارہ کرکے کہتا ۔ ”ایسے سُرخ ہو رہے ہیں جیسے جلتے کوئلے ہوں‘ ۔

ان جلتے ہوئے کوئلوں پر سبھی ہنستے تھے ۔ سرور ۔ غذن اور اس کی ماں اور ان کے علاوہ مینا کا چچا بھی جو سفید داڑھی سمیت ہنسا کرتا ۔ مگر گھر میں کبھی سنجیدگی سے کسی نے یہ نہ سوچا تھا کہ وہ کوئلے جلتے کیوں ہیں اور وہ بھٹیارن پنکھے سے اس بھٹی کی تپش کو فرو کرتی ہے ۔ یا اسے ہوا دیتی ہے ۔

جب مینا گھر والوں کے مذاق پر جھنجھلاتی تو سرور شور مچا دیتا ۔ ”لو ہو گئی کباب ، اماں سچ کہتی ہے ۔ بھٹے نہیں ۔ سیخ کباب ہیں“ ۔ اور غذن ہونٹ چوستے ہوئے پوچھتا ”بھائی جان کہاں ہیں کباب“ اس وقت سرور کو یہ خیال نہ آتا

کہ وہ کباب گلابی کیوں تھے اور جب ان کا ذکر چھڑ جاتا تو مینا ہنس مکھ ہونے کے باوجود کباب کیوں ہو جاتی تھی اور اس کے گالوں پر دو گلابی بھنور سے کیوں پڑ جاتے تھے ۔

اس کی ماں بھی مینا کی اس معصوم عادت پر مسکرا دیا کرتی ۔ جیسے پاؤں کو پنکھا کرنا ایک دلچسپ عادت کے سوا کچھ نہ ہو ۔ اور اس کے چچا تو یوں بے اختیار ہنستے کہ ان کی لمبی سفید داڑھی تھوک سے بھر جاتی ۔

اگر مینا اپنے پاؤں کو پنکھے سے ہوا کرنے ہی پر اکتفا کرتی تو بھی حالات نہ بگڑتے اور اس بھٹی سے اڑی ہوئی چنگاریاں یوں آگ نہ لگاتیں ۔ لیکن مشکل تو یہ ہوئی کہ مینا ایک دو گھنٹے سوال نکالنے کے بعد تھک کر لیٹ جانے کی بھی تو عادی تھی ۔ گرمیوں میں دوپہر کو سونے کی عادت کسے نہیں ہوتی ۔ اور سوئے ہوئے پاؤں کو پنکھا نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن پاؤں کو ہوا میں رکھے بغیر وہ سو بھی تو نہ سکتی تھی ۔

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے ۔ مینا نے بھی ایک طریقہ ایجاد کر رکھا تھا ۔ اس نیم چھتی کمرے کی کھڑکی کی اونچائی جہاں وہ سکول کا کام کیا کرتی تھی ۔ عین چارپائی کی اونچائی کے برابر تھی ۔ وہ ان گلابی انگاروں کو کھڑکی سے باہر نکال دیا کرتی تاکہ انہیں ہوا لگتی رہے اور وہ کچھ دیر کے لئے آرام کر سکے ۔

یہ کھڑکی عین اس چبوترے پر کھلتی تھی جو بیٹھک کے طور پر استعمال میں لایا جاتا تھا ۔ گھر میں اس نیم چھتی کے علاوہ صرف دو کمرے تھے ۔ جو گھر کی ضروریات کے لئے ناکافی تھے ۔ اس لئے مکان کے ملحقہ چبوترے کو سرور کے دوستوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا ۔ سرور کے دوست اس چبوترے تک بے تکلف چلے آتے اور پھر چبوترے پر پہنچ کر یا تو دستک دیتے اور یا آواز دے کر سرور کو بلا لیتے ۔

اطہر سرور کا دوست نہیں تھا ۔ لیکن وہ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے ۔ اطہر کا عہدہ سرور سے بڑا تھا ۔ کیونکہ وہ اسسٹنٹ تھا ۔ گریجویٹ ہونے کی وجہ سے اسے ابتدا ہی سے اسسٹنٹ کی جگہ مل گئی تھی ۔ اطہر شاید سرور

کے گھر کبھی نہ آتا ۔ مگر اسے ایک فائل کی شدید ضرورت پڑ گئی جو سرور کے پاس تھی ۔ اس لئے وہ زینہ پر چڑھ کر چبوترے پر آپہنچا اور پھر جب دستک دینے لگا تو دفعتاً اس نے چق کے سِرکنے کی آواز سنی ۔ انجانے میں اس نے سر اٹھا کر نیم چھتی کی کھڑکی کی طرف دیکھا ۔ کھڑکی کے ایک کونے میں چق کے باہر دو خم دار گلابی پاؤں تہ کئے ہوئے ایک دوسرے کے اوپر یوں رکھے تھے جیسے امریکی پینٹ کا اشتہار ہو ۔

اطہر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور پھر اوپر دیکھا لیکن دھندلانے کی بجائے وہ بیر بہوٹیاں اور بھی چمکنے لگیں ۔ پھر وہ بھول گیا کہ اسے دروازے پر دستک دینی تھی ۔ یا وہ فائل حاصل کرنی تھی جس کا صاحب کو خبط لگا ہوا تھا ۔

اطہر کو گلابی پاؤں سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ خم دار پاؤں مغرب میں بے حد خوبصورت سمجھے جاتے ہیں ۔ اور وہاں ٹخنوں کی ساخت کو چہرے کے خدوخال کی سی اہمیت حاصل ہے ۔ اسے ان باتوں کا علم ہی نہ تھا ۔ پیروں سے اس کی دلچسپی صرف اس حد تک تھی جیسے عام پاکستانی نوجوانوں کو ہوتی ہے مثلاً جیسی آپ کو ہے ۔

آپ سیاہ نقاب پوش کو دیکھتے ہیں ۔ دور سے دیکھ کر آپ نقاب سے اندازہ لگاتے ہیں کپڑا ریشمیں ہے ۔ سلوٹیں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔ "فال" اچھا ہے ۔ قد خاصہ ہے ۔ حرکات جمالی ہیں ۔ آپ مزید معلومات حاصل کرنے کی شدید کوشش کرتے ہیں کہ پس پردہ کی ایک جھلک نامکمل سہی ۔ مبہم سہی ۔ لیکن ایک جھلک نظر آجائے ۔ اِدھر اُدھر کی ناکام جستجو کے بعد دفعتاً آپ کو یاد آتا ہے اور آپ نیچے نگاہ دوڑاتے ہیں اور چپلی میں دو سفید سفید پیروں پر آپ کی نگاہ جم جاتی ہے اور پھر ان پیروں کی نوعیت کے مطابق ایک چہرہ آپ کی قوتِ متخیّلہ کے پردہ پر نمودار ہونے لگتا ہے ۔

اطہر کے نزدیک پاؤں کی اہمیّت صرف اسی حد تک تھی ۔ اس سے زیادہ نہیں ۔ لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا ان بیر بہوٹیوں کو دیکھ کر اس کی قوّت متخیلہ

شل ہو گئی ۔ حتیٰ کہ ان خم دار گلابی پاؤں میں اسے کوئی چہرہ دکھائی نہ دیا ۔ بلکہ وہ ان پاؤں کو دیکھ کر یوں بوکھلا گیا کہ اسے چہرہ بازو یا لٹ دیکھنے کا اشتیاق نہ رہا ۔

چند ایک منٹ تو وہ وہاں کھڑا رہا پھر اضطراب کی شدت سے گھبرا کر چپکے سے سرور سے ملے بغیر ہی سیڑھیاں اتر کر لوٹ گیا ۔

اس کے بعد دفتر سے آتے ہوئے جب بھی وہ سرور کے گھر کے پاس پہنچتا تو ان گلابی پاؤں کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں نہ جانے کہاں سے ابھر آتی جسے محسوس کرکے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آتے اور پھر گھبراہٹ اور ندامت محسوس کرنے کے باوجود محراب دار دروازے سے جھانکتا اوراس کی نگاہیں چق کے کونے میں کچھ تلاش کرتیں اور پھر محرومیّت سے بوجھل ہو کر لوٹ جاتیں ۔

پھر جب وہ گھر پہنچ کر ستانے کے لئے چارپائی پر لیٹتا تو چھت سے دو گلابی پاؤں لٹک آتے آرام کرسی پر بیٹھتا تو سامنے ٹنگے ہوئے کیلنڈر پر خم دار بیر بہوٹیاں چلنے لگتیں ۔ دفتر کی فائل کھولتا تو دو مخملی پاؤں رقص کرنے لگتے جیسے وہ فائل نہ ہو باٹا کا اشتہار ہو ۔ حتّٰی کہ ایک روز مجبور ہو کر وہ پھر سرور کے چبوترے پر جا چڑھا ۔ یہ مجبوری روز بروز بڑھتی گئی نتیجہ کے طور پر سرور اور اطہر میں رسمی سے تعلقات پیدا ہو گئے ۔

اس کے باوجود سرور کو معلوم نہ ہوا کہ اطہر کی آمدورفت کی غائت کیا ہے ۔ اسے معلوم بھی کیسے ہو سکتا تھا کیونکہ اطہر نے کبھی ان خم دار پاؤں والی کو دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی ۔ اسے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اس گلابی جوڑے کے پیچھے دو شربتی آنکھوں ۔ ایک ستواں ناک ۔ دو متکلم ہونٹ اور ایک مسکراتی ہوئی ٹھوڑی والی خوابیدہ لڑکی بھی ہے ۔ جس کی لٹ اس کے رخساروں پر گری ہوئی ہے اور بازو انگڑائی کی صورت پھیلے ہوئے ہیں ۔ جن کے سامنے حساب کی کتاب ادھ کھلی پڑی ہے اور ابھی تک ہاتھ میں پنسل تھمی ہوئی ہے اور اُلٹی ہوئی کاپی پر ادھورا سوال کیا ہوا ہے جس میں چار آدمی اور پانچ لڑکے مل کر ایک کام کو کرتے ہیں اور جو سمجھ میں آنے سے ایک دم منکر ہے ۔

ایک مرتبہ اطہر کے ساتھ بیٹھے ہوئے سرور نے بھی مینا کے پاؤں دیکھ لئے تھے اور اس بات پر وہ اندر آکر خلافِ معمول مینا سے لڑا تھا "کیا حماقت ہے"۔ وہ سوئی ہوئی مینا کے سر پر کھڑا ہو کر چلّانے لگا۔ "یہ کُھر باہر کیوں لٹکا رکھے ہیں۔ مینا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں سرخ چیونٹیاں کام کو کرتے ہیں اور جو سمجھ میں آنے سے ایک دم منکر ہے۔

ایک مرتبہ اطہر کے ساتھ بیٹھے ہوئے سرور نے بھی مینا کے پاؤں دیکھ لئے تھے اور اس بات پر وہ اندر آکر خلافِ معمول مینا سے لڑا تھا "کیا حماقت ہے"۔ وہ سوئی ہوئی مینا کے سر پر کھڑا ہو کر چلّانے لگا۔ "یہ کُھر باہر کیوں لٹکا رکھے ہیں"۔ اور مینا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں سرخ چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ مینا کی اس گھبراہٹ کو دیکھ کر سرور نے یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ کسی نا محرم کی خلوت گاہ میں جا گُھسا ہو۔

سرور کی اس بات پر مینا کی ماں بھی طیش میں آگئی تھی۔ "لو سُن لو پاؤں باہر نکل گئے تو کیا ہوا۔ تم تو پاگل ہوگئے ہو"۔ اور چچا سفید داڑھی کو ہاتھ میں لے کر بولے تھے۔ "حد ہوگئی میاں۔ لڑکی نے منہ باہر نکال کر جھانکا ہوتا تو بھی کوئی بات تھی۔ پاؤں چق سے باہر نکل گئے تو کیا ہوا۔ ان کے نقطۂ نگاہ سے تو چہرہ ہی سب سے زیادہ خطرناک عضو تھا۔ جس سے یا تو پُھول یا انگارے جھڑ سکتے تھے۔ پاؤں ـــ باہر نکلنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہنستے ہنستے ان کی داڑھی تھوک سے تر ہو گئی تھی۔

لیکن تجربہ کار سفید ریشوں کے اس خیال کے باوجود بھی وہ گلابی پاؤں دیکھ کر اطہر کو وہ سب کچھ ہوگیا تھا جو ایک نوجوان کو ہو سکتا ہے۔ حتّٰی کہ اس سے بھی زیادہ۔ یہاں تک کہ جب بھی اسے کوئی ـــ پُھول برساتا یا انگارے اڑاتا چہرہ دکھائی دیتا تو وہ بے پروائی سے منہ موڑ لیتا یا فضا میں لٹکتا ہوا ایک گلابی پاؤں ٹھوکر مار کر اُس چہرے کو مسخ کر دیتا۔

پھر اطہر کی نگاہیں جھک گئیں اور پیروں پر مرکوز ہوگئیں اور وہ دیوانہ وار ہر راہگذر کے پاؤں کو دیکھنے لگا۔ گرگابیوں، سینڈلوں اور سلیپروں سے جھانکتے

ہوئے پاؤں۔ ننگے بے ڈول پاؤں۔ بڑے بڑے بے حس مردہ پاؤں۔ گدگدے گرم پاؤں۔ گول گول گیلے پاؤں۔ چھوٹے چھوٹے حسّاس پاؤں۔ چڑھی ہوئی چتون سے غصّیل پاؤں۔ اس نے محسوس کیا جیسے پاؤں کا ایک دریا رواں ہو اور اس دریا میں دو گلابی خم دار بادبانوں کی واحد کشتی دھارے کے خلاف چل رہی ہو۔

مینا کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان جلتے ہوئے پاؤں نے اطہر کی زندگی میں ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ اسے یہ معلوم بھی کیسے ہوتا۔ اسے تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ وہ جلتے کیوں تھے۔ اور وہ جلن کس طوفان کی آمد کا نشان تھی۔ جو آہستہ آہستہ اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

مینا ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے خدوخال خوبصورت نہ بھی ہوں تو بھی وہ حسین سمجھی جاتی ہیں۔ جن کا رنگ جاذب نہ بھی ہو تو بھی لوگ انہیں دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جنہیں توجہ حاصل کرنے کے لئے اپنا چرچا کرنا پڑتا ہے۔ سنگار کرنا پڑتا ہے۔ یا چلتے ہوئے شوخی بھری حرکات کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ یا اثر پیدا کرنے کے لئے کسی کے آنے پر جھٹ منہ چھپانا پڑتا ہے۔ یا سیاہ نقاب سے موٹی سی آنکھ طلوع کرنی پڑتی ہے۔ یا مسکرا کر دوسرے کو لبھانا پڑتا ہے یا گھور کر ناک سکیڑ کر منہ موڑنا پڑتا ہے۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو ازلی طور پر خوبصورت ہوتی ہیں۔ جو جانتی ہیں۔ کہ وہ خوبصورت ہیں اور ان کی ہر حرکت جاذبِ نظر ہے۔ جن کا حجاب ایسا ہی پُر اثر ہے جیسے نمائشی حرکات۔ مینا کی جاذبیّت کا تمام تر راز اُس بے پناہ اعتماد پر استوار تھا جو اپنی جاذبیّت کے متعلق اس کے دل میں جاگزیں تھا اور جس کے وجود نے اسکی شخصیت کے گرد ایک ہالہ سا بنا رکھا تھا۔ اس لئے اس نے یہ ضرورت کبھی محسوس نہ کی تھی کہ کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھے یا بھائی جان کے دوستوں پر الجھی ہوئی لٹ یا نیم خوابیدہ آنکھ سے اثر ڈالے۔ اس لئے وہ اطہر کے وجود ہی سے بے خبر رہی۔

ادھر اطہر بھی کسی سے ملنے ملانے کا شوقین نہ تھا ۔ بلکہ اس کے برعکس وہ لوگوں سے چھپتا پھرتا تھا ۔ اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ جب بھی وہ دوستوں کے درمیان بیٹھتا تو کوئی نہ کوئی اس کے جسم کی بُو کا تذکرہ چھیڑ دیتا ۔ اگر کوئی اس کا ذکر نہ بھی کرتا تو بھی وہ محسوس کرتا جیسے وہ اسے محسوس کرکے ناک چڑھا رہے ہوں ۔ اسی وجہ سے زیادہ تر وہ کسی سے ملتا ہی نہ تھا ۔ اور لوگوں سے دور بیٹھتا تھا ۔ دفتر میں بھی اس نے اپنی سیٹ ایک کونے میں لگا رکھی تھی ۔ کہ کسی کو اس کے جسم کی بُو کا علم نہ ہونے پائے ۔ بچپن میں تو اس کے جسم میں کوئی خصوصی بُو نہ تھی ۔ پھر ایک روز عنفوان شباب میں بھیگتی ہوئی مسوں کے ساتھ نہ جانے وہ کہاں سے آگئی ۔ اور اس کے اقربا ہنس ہنس کر ناک بھوں چڑھانے لگے ۔ اور اُپلے لانے والی عمر رسیدہ گُجری جو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکایا کرتی تھی پرے پرے رہنے لگی ۔ حتّٰی کہ ایک روز جب اس نے اتنا بڑا منہ کھول کر اطہر سے کہہ دیا ۔ "یہ تو نے بدن پر کیسی بُو مل رکھی ہے" ۔ اس روز کے بعد اس نے کبھی کسی عورت کے قریب جانے کی جرأت نہ کی تھی ۔

اس کے جسم کی بُو کی نوعیّت کچھ عجیب سی تھی ۔ جیسے پرانے گڑ میں آئیوڈین ملی ہوئی ہو ۔ تلخ اور تیز بو ۔ اور یہی بُو اطہر اور مینا کے درمیان حائل ہوگئی ۔

اس روز جب وہ شام کے وقت سرور کے چبوترے پر بیٹھا سرور کا انتظار کر رہا تھا تو اس نے اپنی بنیان میں سرسراہٹ سی محسوس کی اور گھبرا کر اس نے اپنی قمیض اور بنیان اتار دی اور پھر جلدی میں ۔ تاکہ سرور واپس نہ آجائے ، بنیان کو ایک کونے میں پھینک کر قمیض پہن لی ۔ لیکن گھر جاتے ہوئے وہ اپنی بنیان اٹھا کرلے جانا بُھول گیا ۔

اطہر کے جانے کے بعد رات کے اندھیرے میں اتفاق سے مینا ادھر آنکلی ۔ چبوترے پر پہنچتے ہی وہ گھبرا کر رُکی "ہائے یہ کیا" وہ چلّائی ۔ اور یوں ناک چڑھائی جیسے چبوترے پر مرے ہوئے چوہوں کا ڈھیر لگ رہا ہو ۔ "ہائے امی" وہ اندر بھاگی ۔

گھر میں مینا بڑی ناک والی مشہور تھی ۔ اسے ہر جگہ سے بُو آتی تھی ۔ "ہائے کیا ہے تجھے لڑکی" ۔ اس کی ماں ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہتی ۔ "کیسے وقت گزرے گا تیرا پرائے گھر میں ۔ تجھے تو ہر جگہ سے بُو آتی ہے" ۔

مینا کو ہر جگہ سے بُو نہیں آتی تھی ۔ مگر اس کی بُو کی حس بے حد تیز تھی ۔ گھر میں آکر باورچی خانے کے قریب پہنچکر وہ چلاتی ۔ "بڑی اچھی ہے امّی تو ۔ ہائے میرا کتنا جی چاہتا تھا کہ مغز پکے" یا وہ ناک چڑھا کر کہتی ۔ "آج پھر ہنڈیا جلا دی نا' ۔ اور ماں حیرانی سے ناک پر ہاتھ رکھ لیتی ۔ "ہائے تجھے کیسے پتہ چل جاتا ہے ۔ لڑکی حد ہو گئی'' ۔

یا چچا ملنے آتے تو وہ مسکرا کر کہتی ۔ "یہ بسکٹ جو آپ لائے ہیں مجھے دے دیجئے'' ۔ اور چچا گھبرا کر پوچھتے ۔ "کونسے بسکٹ بیٹی" اور وہ ہنستی "یہ جو آپ نے جیب میں چھپا رکھے ہیں" ماں چچا کو احساس شرمساری سے بچانے کے لئے بول اٹھتی ۔ "توبہ اس لڑکی کی ناک بھی تو گز بھر لمبی ہے ۔ نہ جانے کہاں کہاں کی چیز سونگھ لیتی ہے'' ۔

پر اس روز جب سرور نے چوری چوری اپنے دوست کو بیّر پلا کر خالی بوتل الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا اور اماں کے پوچھنے پر بہانہ بنا دیا تھا ۔ "اماں اس میں میرے دوست کے چینی کے برتن رکھے ہیں ۔ اس لئے تالا لگایا ہے ۔ جب وہ لے جائے گا تو کھول دوں گا اور اماں اس کی بات پر مطمئن ہوگئی تھی ۔ تو مینا چپکے سے سرور کے پاس جاکر بولی تھی ۔ "بھائی جان وہ صندل کی بوتل جو آپ نے الماری میں رکھی ہوئی ہے ۔ اس میں سے ایک چُسکی شربت تو چکھا دیجئے ۔ صرف ایک چُسکی" ۔

اس روز سے گھر میں جب بھی مینا کی لمبی ناک کا تذکرہ ہوتا تو نہ جانے کیوں سرور کو غصّہ آ جاتا ۔ اور وہ طنزاً چلّاتا ۔ "اماں یہ کیسی بُو آرہی ہے" ۔ اور اماں انجانے میں پوچھتی "کیسی بُو بیٹا" تو وہ مینا کے روبرو تن کر کھڑا ہو جاتا اور پھر جھوٹ موٹ سوچ کر کہتا "جیسے باسی ٹکڑے پر سڑا ہوا کباب پڑا ہو" ۔

اس روز جب مینا نے اطہر کی بنیان کی بُو پر شور مچایا تو گھر والوں کے لئے

وہ کوئی عجیب بات نہ تھی ۔ لیکن مینا کے لئے وہ عجیب بات تھی ۔ وہ بُو مینا کے بند بند میں دھنس گئی اور اس نے ایسے محسوس کیا جیسے دفعتاً اسکے اَنا کی گھڑی داعیں سے باعیں کو چلنے لگی ہو ۔ اس کی طبیعت مالش کرنے لگی ۔ رنگ زرد پڑگیا ۔ اور دفعتاً نہ جانے کیا محسوس کرکے وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر نیم چھتی کی طرف بھاگی اور اپنی چارپائی پر نیم جان ہو کر گر گئی ۔

اس رات مینا کو نیند نہ آئی ۔ کچھ دیر وہ چارپائی پر لیٹتی ۔ پھر بُو کا ایک ہلکا سا بھبھکا آتا اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتی اور چپکے سے نیچے اُتر جاتی اور اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد چبوترے پر کھلنے والا دروازہ کھولتی اور پھر گھبرا کر اسے بند کرکے واپس چلی جاتی اور بے جان ہو کر چارپائی پر پڑ جاتی ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد بُو کا وہی بادل پھر اس کے گِرد گھیرا ڈال لیتا اور وہ پھر نیچے اُتر جاتی ۔

چوتھی مرتبہ جب اُس نے چبوترے کا دروازہ کھولا تو وہ جرأت کرکے باہر نکل گئی اور اس بنیان کی طرف یوں دیکھنے لگی ۔ جیسے وہ کوئی ناگ ہو ۔ اور وہ اس سے ڈرنے کے باوجود اس کی طرف تکنے پر مجبور ہو ۔

اس کے جسم کا بند بند ٹوٹ رہا تھا ۔ جیسے سبھی کچھ باہر نکلنے لگا ہو ۔ جسم میں ان جانی تاریں لرز رہی تھیں ۔ ایک خوفناک بھیانک لرزش ۔ پھر دفعتاً اس نے اِک جست بھری اور اس ناگ کو دو انگلیوں سے تھام لیا اور ایک دیوانہ وار جنبش سے اُسے اپنے منہ پر ڈال لیا ۔

دفعتاً اس کے پاؤں سے سُرخ شعلے اُٹھے اوراس کے جسم کو یوں چاٹنے لگے جیسے وہ آتشیں ہولی کھیل رہی ہو ۔۔۔ پھر ایک شعلہ اوراس سے اڑتے ہوئے رنگین شرارے اور پھر دفعتاً وہ گلابی انگارے یوں ٹھنڈے ہو گئے ۔ جیسے برف کی رنگین ڈلیاں بن گئے ہوں ۔ مینا نے چاروں طرف حیرانی سے دیکھا ۔ اس کی نگاہ میں حیرانی کے علاوہ ایک انوکھا اطمینان تھا ۔ پھر وہ چپکے سے اٹھی اور اس بنیان کو اٹھا کر اپنے صندوق میں رکھ کر مقفل کر دیا ۔

اگلے روز برسبیلِ تذکرہ جب دفتر میں اطہر نے سرور سے اس بنیان کے بارے میں استفسار کیا اور سرور نے ایک لمبا قہقہہ لگا کر مینا کی کھولتی ہوئی نفرت

کا سرسری بیان سنایا تو اطہر شرمندہ ہوکر خاموش ہوگیا اور پھر نہ جانے کس خیال سے بولا ۔ "وہ بنیان میرے ایک دوست کی تھی جسے میں دھلانے کے لئے لے جا رہا تھا ۔ خیر کوئی بات نہیں"۔

وہ آخری دن تھا ۔ جب اطہر سرور کے ہاں گیا ۔ اس کے بعد اس کا لاکھ جی چاہتا کہ وہ گلابی پاؤں ایک نظر دیکھ لے ۔ مگر وہ اس خواہش کو زبردستی دبا لیتا حتّٰی کہ اس نے دفتر آنے جانے کے لئے وہ راستہ بھی چھوڑ دیا ۔

ہسپتال کے طویل وارڈ میں مریض چُپ چاپ لیٹا ہوا تھا ۔ اس کے پاس ہی سٹول پر ایک دُبلا پتلا سفید ریش شخص خاموش بیٹھا تھا ۔ مریض چُپ چاپ چھت کو گھورے جارہا تھا ۔ کھویا ہوا سفید ریش بزرگ بے خبری میں اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا ۔ دور کمرے کے وسط میں ایک زرد رُو نرس ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے دیوار کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوسوں دور ہو ۔ وارڈ میں جملہ مریض اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے ۔

بُڈھے نے اضطراب سے کروٹ لی ۔ "تو تقسیم کے وقت تم جالندھر میں تھے"۔ اس نے گویا دوائی کی شیشی سے سوال کیا ۔ جو مریض کے سرہانے رکھی تھی ۔

مریض نے اسے دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا ۔۔۔ "اور تم سیدھے یہاں چلے آئے"۔۔ "ہاں" مریض نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا ۔

"اور گاؤں والے سب ۔۔۔"

"سب" مریض نے دونوں ہاتھوں کو کھول کر جیسے خالی کر دیا ۔ اور وہ دونوں خاموش ہو گئے ۔

کچھ دیر کے بعد مریض چونکا ۔ مگر چھت کی طرف سے نگاہ ہٹائے بغیر بولا ۔ "جو ڈاکٹر غدودوں کے بارے میں ٹریننگ لے کر آیا ہے امریکہ سے ۔ کیا نام ہے اس کا"۔

"ڈاکٹر ریاض ۔۔" بڈھے نے جواب دیا ۔

"کتنی دیر ہوئی اُسے آئے" ۔
"کوئی چھ ماہ" ۔
"ہوں ۔۔" اس نے بڈھے کی طرف پہلی مرتبہ دیکھتے ہوئے کہا ۔ "لیکن کیا واقعی جسم کی بُو کا علاج ممکن ہے" ۔
"جسم کی بُو ۔۔۔" بُڈھے نے کھوئے انداز سے اس کی طرف دیکھا
"مطلب ہے کچھ لوگوں کے جسم سے بُو آتی ہے نا ۔۔"
"ہاں ۔۔ بغل گند ۔۔۔ لیکن وہ کوئی بیماری نہیں ۔"
"سچ"
"ہاں ۔۔۔ ایسے کیس معمولی ہوتے ہیں" ۔
"معمولی ہوتے ہیں ؟"
"میرا مطلب ہے جان کا خطرہ نہیں ہوتا ۔ ویسے بہت مہنگے پڑتے ہیں ایسے اپریشن ہسپتال کی طرف سے کرنے کی اجازت نہیں ہے نا ۔ پرائیویٹ ہوتے ہیں ۔ اس لئے خرچ بہت اُٹھتا ہے" ۔
"لیکن ۔۔۔ کیا بُو لازماً دور ہو جاتی ہے" ۔
"ہاں ہاں ۔۔۔ مگر ایسا آپریشن کروانا نہیں چاہیئے" ۔
"کیوں ؟ ۔۔۔" مریض اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔
"مرد کی قوّت پر اثر پڑتا ہے" ۔
"اوہ ۔۔۔" مریض آہ بھر کر لیٹ گیا ۔
اور وہ دونوں خاموش ہو گئے ۔

بُڈھے نے اپنی انگلیوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔ "تم کروانا چاہتے ہو آپریشن ؟"
"میں ۔۔ میں ۔۔ " مریض چونکا ۔۔ نہیں ۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں" ۔ وہ گنگنانے لگا "میں نہیں ۔۔ لیکن اب کیا فائدہ ۔ بے کار ہے ۔ بالکل بے کار ۔" وہ پھر چھت کی طرف گھورنے لگا اور اسکائی لائٹ سے لٹکتے ہوئے گلابی خم دار غیر مرئی پاؤں میں کھو گیا ۔

نرس کے بوٹ کی چاپ سن کر مریض پھر چونکا ۔ مقابل کے بیڈ پر وہ رک گئی اور مریض کے لئے دوا گلاس میں انڈیلنے لگی ۔
مریض نے سرسری طور پر اس کی طرف دیکھا اور گویا اپنے آپ سے گنگنانے لگا ۔ "نئی نرس معلوم ہوتی ہے" ۔

"نہیں تو" ۔ بُڈھے نے آہستہ سے کہا ۔ "اس وارڈ میں اس کی ڈیوٹی ہفتے کے روز لگتی ہے" ۔
"ہوں ہفتے کے روز ۔۔" مریض خاموش ہوگیا ۔
"اسے جانتے ہو اطہر" بڈھے نے زیرِ لب پوچھا ۔ "جالندھر سے آئی ہے" ۔
"اچھا" اطہر نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا ۔ "ہو گی" ۔
"بے چاری یہاں اکیلی ہی پہنچی ہے" بڈھے نے حسرت بھری نظروں سے نرس کی طرف دیکھا ۔ "اور باقی سب ۔۔"
"سب" اطہر نے غور کئے بغیر دہرایا ۔
"ہاں ۔ سب" ایک ساعت کے لئے بڈھا خاموش ہوگیا ۔
"وہ تو شکر ہے کہ دسویں پاس تھی ورنہ ۔۔۔"
"ورنہ کیا ۔۔۔"
"ورنہ نوکری بھی نہ کر سکتی ۔۔ آخر پیٹ جو پالنا ہوا" ۔
"ہوں ۔۔۔" اطہر نے ایک آہ بھری ۔
پھر وہ دونوں دیر تک خاموش رہے ۔ بڈھا بار بار اطہر کی طرف دیکھتا ، پھر جھجک کر سر جھکا لیتا اور انگلیاں چٹخانے لگتا ۔ آخر جرأت کر کے بڈھے نے وہ سوال کر ہی دیا ۔
"تم نے شادی کیوں نہیں کی" ۔
"شادی ۔۔" اطہر گھبرا گیا ۔ "شادی" اس نے زیرِ لب دہرایا اور ہنسنے کی کوشش کی ۔ نہ جانے کوشش کی شدت سے یا اس زہر خند کی وجہ سے اس کے گال پر ایک قطرہ بہنے لگا اور اس کی نگاہ میں سبھی کچھ دھندلا گیا ۔ گلابی پاؤں گم

ہوگئے ۔ جیسے کسی نے انہیں سکائی لائٹ سے اوپر کھینچ لیا ہو ۔

"وہ ڈاکٹر صاحب ۔ ڈاکٹر ریاض" بوڑھے نے اطہر کو بازو سے ہلایا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا ۔ "ادھر آرہے ہیں وہ" ۔

"ریاض" وہ چونکا اور اُٹھ بیٹھا ۔ "یہی ہیں وہ گلینڈ ایکسپرٹ ؟"

"ہاں ۔ ہاں" بڈھے نے جواب دیا ۔ "یہی" ۔

ڈاکٹر ریاض سیدھا اطہر کے بیڈ کی طرف چلا آیا ۔ اور نرس بھی اسے آتا دیکھ کر اطہر کے بیڈ کی طرف آگئی ۔

"یہی ہے نمبر ۷ ؟" ڈاکٹر نے نرس سے پوچھا ۔

"یس ڈاکٹر" وہ بولی ۔

"کلر فینٹیسی کا کیس ہے" ۔

"یس ڈاکٹر" ۔

"کیا اب بھی آپ کو رنگ نظر آتے ہیں ۔" ڈاکٹر نے اطہر سے پوچھا ۔

"جی ہاں" بڈھے نے جواب دیا ۔ "اب بھی"

"اوہ ۔ آپ کمپاؤنڈر احمد شاہ ہیں کیا ۔" ڈاکٹر نے بڈھے کو پہچانتے ہوئے کہا۔

بڈھے نے سر اثبات میں ہلا دیا ۔

"یہ آپ کے عزیز ہیں کیا ؟"

"ان کے والد میرے دوست تھے ۔" بڈھے نے جواب دیا ۔

"ہوں ۔"

عین اُس وقت نرس نے ایک چیخ ماری ۔ "اوہ ڈاکٹر سم ریپٹائل" اور اس نے دیوانہ وار دائیں پاؤں کا جوتا اتارنے کی کوشش کی ۔ اُسے یوں بے چین دیکھ کر بڈھا اوراطہر دونوں اس کی طرف لپکے ۔ بڈھے نے اسے تھام لیا ۔ اطہر نے ایک ہی جھٹکے میں اس کا بوٹ اتار دیا اور جراب اتار کر پرے پھینک دی ۔ وہ زرد سے خم دار پاؤں دیکھ کر اطہر کی سانس رُک گئی ۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نرس کو دیکھنے لگا ۔

وہ تو شکر ہے کہ تمام لوگوں کی توجہ اس سانپ کی طرف مبذول ہوگئی تھی جو نرس کے بوٹ سے باہر نکل کر فرش پر ادھ مؤا پڑا تھا ورنہ نہ جانے لوگ اطہر کے اس رویّہ پر کیا سمجھتے ۔

پھر وہ نرس کو وہاں سے اٹھا کر لے گئے اور اطہر دیوانہ وار ڈاکٹر ریاض کے پیچھے بھاگا ۔ "ڈاکٹر ڈاکٹر ۔ میرا آپریشن کر دیجئے ۔ خدا کے لئے ۔ میں آپ کو پوری فیس ادا کر دوں گا ۔ ڈاکٹر خدا کے لئے ڈاکٹر" ۔

ایک ہفتے بعد اطہر خوشی خوشی اس گلی میں داخل ہوا اور ایک راہ گیر سے پوچھنے لگا ۔ "مس عظمت یہیں رہتی ہیں کیا ؟" ۔

"وہ نرس" اس نے جواب دیا ۔ "وہ سامنے سبز کواڑوں والا مکان ہے ۔ وہ داعیں ہاتھ پر چوتھا" ۔

"کم ان" دستک کی آواز سن کر مس عظمت نے جواب دیا ۔ لیکن اجنبی کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی ۔ "آپ آپ ۔۔۔ ۔"

"جی ۔ جی معاف کیجئے" ۔ وہ بولا ۔ "لیکن مجھے آپ سے ایک ضروری بات ۔ میرا مطلب ہے" ۔۔۔ وہ رُک گیا "یعنی ۔۔۔۔۔"

"بیٹھیے" وہ سویٹر بنتے ہوئے بے پروائی سے بولی ۔ "شاید آپ کو غلطی ہوئی ہے ۔ میں پریکٹس نہیں کرتی" ۔

"نہیں ۔ نہیں" ۔ وہ چلّایا ۔ "میں تو ویسے ہی یعنی ایک ضروری بات میں ۔۔ میں سرور صاحب کا دوست ہوں" ۔

نرس نے سر اُٹھا کر اسے دیکھا ۔ "اوہ" ۔ وہ بولی ۔

"میں وہاں گھر آیا جایا کرتا تھا ۔ سرور صاحب سے ملنے" ۔

سرور کا نام سُن کر اس کا سر جھک گیا اور ہاتھ بھی چستی سے چلنے لگا ۔

"سرور صاحب تو ۔۔" وہ رُک گیا ۔ "لیکن میں بھی یہاں اکیلا ہی پہنچا ہوں ۔ میرا اب کوئی نہیں ۔ کوئی بھی نہیں ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔ ورنہ میں خود یہ بات کہنے کے لئے حاضر نہ ہوتا ۔ میرا مطلب ہے ایسی بات خود کہنا مناسب نہیں

سمجھا جاتا مگر ۔۔۔ مگر ۔۔۔ لیکن آپ ۔۔۔ اگر برا نہ مانیں تو میں وہ بات عرض کروں“ ۔

مس عظمت کے چہرے پر شکن سی پڑ گئی ۔ اُس کے ہاتھ رک گئے ۔

”میں آپ کی بات نہیں سمجھی“ ۔

”جی“ وہ بولا ۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں ۔ لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو ۔۔۔ اور اگر آپ کو منظور نہ ہو تو تو ۔۔۔ یعنی آپ میری اس جسارت کو معاف کر دیں“ ۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟“ اس کے منہ پر سُرخی سی جھلک گئی ۔

”میری مدّت سے یہ آرزو تھی ۔ ایک مدت سے ۔ اور شاید آپ اسے تسلیم نہ کریں ۔ لیکن ۔۔۔ لیکن زندگی میں میری صرف ایک آرزو ہی ہے ۔ صرف ایک ۔ اور میں نے آپ کے پاؤں صرف پاؤں دیکھے تھے ۔ نیم چھتی کی کھڑکی سے لٹکتے ہوئے صرف پاؤں ۔ جیسے ۔۔۔ جیسے ۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن ۔۔۔ لیکن وہ بدقسمتی سے ۔۔۔ بدقسمتی سے“ وہ بغیر سوچے نہ جانے کس ترنگ میں بکے گیا ۔ ”اس روز ۔ کیا منحوس دن تھا وہ ۔ جب میری بنیان ۔ وہاں اس چبوترے پر“ ۔

”بنیان“ مس عظمت نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ۔

”ہاں ، ہاں وہ میری بنیان“ ۔ وہ گھبرا کر بولا ۔

”آپ کی“ مس عظمت کی آنکھوں میں گویا تھے سے دیے روشن ہو گئے اس کا منہ سرخ ہو گیا ۔

”آپ کی بنیان تھی وہ“ نرس نے چیخ کر پوچھا ۔

”نہیں ۔۔۔ نہیں“ وہ گھبرا کر بولا ۔ ”اب ۔۔۔ اب وہ نہیں رہی ۔ میرا مطلب ہے اب وہ بُو نہیں رہی ۔ میں نے آپریشن کروا لیا ہے ۔ آپ کے لئے صرف آپ کے لیے“ ۔

دئے بجھ گئے ۔ چہرے کی سُرخی زردی میں بدل گئی ۔ ”آپریشن“ وہ زیرِ

لب چلائی ۔۔ ”میں ۔۔۔ میں آپ کے لئے چائے“ ۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑی ۔

○

دُودھیا سویرا

شہر سے دُور گرینڈ ٹرنک روڈ کے کنارے پر درختوں کے جھنڈ کے نیچے وہ ایک مختصر سا قبرستان تھا ۔ اس میں صرف بیس پچیس قبریں تھیں ۔ جن میں بیشتر کچی تھیں ۔ پختہ قبروں میں صرف دو یا تین نئی معلوم ہوتی تھیں ، اور ان میں سے ایک سفید ٹائیلوں کی بنی ہوئی تھی اس مختصر سے قبرستان کے غربی کنارے پر ایک مسجد تھی جس کے باہر چبوترا سا بنا ہوا تھا مشرقی کنارے کی سڑک کے پاس بس سٹینڈ کا بورڈ آویزاں تھا ۔ جس کے پاس ایک کچے کمرے میں چائے کا سٹال تھا ۔

قبروں پر درختوں کے سُوکھے پتے بکھرے پڑے تھے ۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے ۔ اور قریب ہی پہاڑی نالہ جو جانی کے نام سے مشہور ہے شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا ۔ ان ٹُنڈ مُنڈ درختوں تلے قبرستان میں وہ چاروں اپنے اپنے خیال میں کھوئے ہوئے تھے ۔

پتلا دُبلا نوجوان منہ میں پائپ دبائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اضطراب بھرے انداز سے سوکھے پتوں پر ٹہل رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے وہ رک جاتا اور ایک نظر غور سے قبروں کی طرف دیکھتا ۔ اس کا ہونٹ ڈھلک جاتا ۔ پائپ اوور کوٹ کی اوپر والی جیب پر جا ٹکتا ۔ پھر وہ آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک لمبی آہ بھر کر پھر سے اضطراب بھرے انداز سے ٹہلنے لگتا ۔

مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص درخت سے ٹیک لگائے آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس کی بڑی بڑی جاذب آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے ڈرتا ہو کہ انہیں کھولا تو اسکا راز فاش ہو جائے گا ۔ اس کے ماتھے پر کرب بھری تیوری چڑھی ہوئی تھی جیسے بند

ہونٹوں کی وجہ سے دل کا تمام تر دکھ سمٹ کر پیشانی پر آ گیا ہو ۔ ہر چار پانچ منٹ کے بعد شدّت جذبات سے جھرجھری سی لیتا اور پھر چونک کر مڑتا اور غور سے قبروں کی طرف حسرت سے دیکھتا اوراس کے گالوں پر ایک آنسو ڈھلک آتا جسے چھپانے کے لئے وہ پھر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ۔

گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان کھدّر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا اور ایک بڑے سے پتّھر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا تھا ۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا ۔ آنکھیں گویا انگاروں کی طرح روشن تھیں ۔ چھاتی تنی ہوئی تھی جیسے اسے سانس لینے سے بھی لذّت محسوس ہو رہی ہو ۔ اس کے انداز میں ایک عجیب بے نیازی تھی ۔ ایک بے نام سی انبساط ۔ اور وہ چُپ چاپ گویا بے تعلقی سے قبروں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آجاتی ، اور اس کے چہرے پر دودھیا سویرا پھیل جاتا ۔

مسجد کے چبوترے پر اچکن میں ملبوس ایک پاکیزہ صورت معمّر آدمی دوزانو بیٹھا زیرِ لب بڑے خشوع سے کچھ پڑھ رہا تھا ۔

قبرستان کے پیچھے شمال میں دُور ٹیلے پر ایک گاؤں کے چند مکانات شام کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اوراس سے پرے شہر کے مینار اور فلک بوس عمارتوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا ۔

دفعتاً سارے آسمان پر بدلیاں چھا گئیں ، اور بوندیں پڑنے لگیں اور وہ چاروں قبرستان سے بس سٹینڈ کے مختصر سے چائے خانے کی طرف بھاگے ۔ چائے خانے کا کمرہ بہت چھوٹا تھا ۔ جس میں صرف ایک لمبا بنچ ، ایک کُرسی اور ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی ۔ وہاں پہنچ کر وہ سب دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔ پھر مُونچھ والے نے کوئی بات کرنے کی غرض سے پتلے دُبلے نوجوان سے کہا ۔ ”معلوم ہوتا ہے آپ کو بہت صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے ۔ کتنے مضطرب ہیں آپ بھائی صاحب !“

”مضطرب !“ پتلے دُبلے نوجوان نے دہرایا ”نہیں نہیں“ ۔ وہ اضطراب بھرے انداز میں چلّایا ۔ ”میں مضطرب تو نہیں ۔ میری روداد سن کر کیا کریں

گے آپ" ۔ وہ بولا ۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی اپنی کتھا سنانے لگا ۔
"مجھے اس بات کا دکھ ضرور ہے کہ وہ جوانمرگی کا شکار ہو گئی ، اور آج اس قبرستان میں مٹی کے ڈھیر تلے بے بس پڑی ہے ۔ مگر جہاں تک میرا تعلق ہے ، میں خوش ہوں ۔ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ میں اس سحر سے نکل آیا ہوں ۔ اُف کس قیامت کا سحر تھا جیسے کسی نے جادُو کر رکھا ہو ۔ ہاں وہ جادوگرنی تھی" ۔ وہ خاموش ہو گیا ، اور ان جانے میں بجھے ہوئے پائپ کے لمبے لمبے کش لینے لگا ۔

کھدّر پوش نے مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب بولا ۔ "آپ کو اس سے محبت ہوگی" ۔

"محبّت" پتلا دُبلا نوجوان چلّایا ۔ "مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن محبت ایسی تو نہیں ہوتی ۔ نہیں نہیں وہ تو ایک مثبت جذبہ ہے جو اطمینان اور تسکین کا باعث ہوتا ہے" پھر وہ یوں بولنے لگا جیسے دیر سے منتظر تھا کہ کوئی اسے چھیڑے ۔ "اور یہ ـــ یہ تو ایک بیماری تھی ، ہاں بیماری ۔ ایک ایسی بیماری جس کے تحت مریض خود چاہتا ہے کہ وہ شفایاب نہ ہو ۔ اور ایسے حالات پیدا کر لیتا ہے کہ مرض بڑھتا جائے ، دوا کرنے کے باوجود بڑھتا جائے" ۔

"عجیب بات ہے" اچکن پوش بزرگ نے سر اٹھا کر پہلی مرتبہ دُبلے پتلے مضطرب نوجوان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

بس سٹینڈ کے اس مختصر سے چائے خانے میں خاموشی چھا گئی ۔ باہر ہوا درختوں کے اس جھنڈ میں کراہ رہی تھی ۔ چیخ رہی تھی

"ہاں" دبلا پتلا نوجوان لمبی آہ بھر کر آپ ہی آپ یوں بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ، جیسے اسے دوسرے اصحاب کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا ہو ۔ "ہاں عجیب ۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ ۔ کس قدر جاذبیت تھی اس میں ۔ توبہ ہے!" اس نے جھرجھری لی ۔ اس میں نمائش نہیں تھی ۔ نخرا نہیں تھا ۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح اس کے ہونٹ بٹوے کی طرح کھلتے ملتے نہیں تھے ، اسکی آنکھیں ڈولتی نہیں تھیں ، اس کی بھویں تنتی سمٹتی نہیں تھیں ، اس کی آنکھوں میں متبسم اشارے نہیں جھلکتے تھے ۔ اسے دیکھ کر پیار کرنے کی

خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی ۔ بلکہ جی چاہتا تھا کہ اس کے قدموں میں گر کر رو پڑیں ۔ وہ لڑکی نہیں تھی ، مٹیار عورت تھی ، مٹیار عورت ۔ اس پر لڑکی پن کبھی نہیں آیا تھا ، کبھی نہیں ۔ وہ پیدائشی مٹیار تھی ۔ اس میں ایک عجیب سی آن تھی ۔ عجیب سی تمکنت ایک ایسا احساس جیسے کہ وہ تمام کائنات کا محور ہو ، مرکز ہو ، اُف پتلے دبلے نوجوان نے یوں لمبی سانس لی جیسے اس کے اندر شعلے بھڑک رہے ہوں "اس کے روبرو اپنی شخصیت شل ہو جاتی تھی ۔ اپنی آرزوئیں گویا مفقود ہو جاتی تھیں ۔ جی چاہتا تھا وہی کریں جو وہ چاہتی ہے ۔ جی چاہتا تھا وہ احکام جاری کرے اور ہم تعمیل کریں ۔ عجیب عورت تھی وہ عجیب" وہ پھر اپنے خیالات میں کھو کر چپ ہو گیا ۔

باہر درختوں کی ٹہنیوں میں گرتی ہوئی بوندیاں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی ہچکیاں لے رہا ہو ۔ دور جانی ندی بین کر رہی تھی ۔ کمرے میں اچکن پوش سر جھکائے بیٹھا تھا ۔ کھدّر پوش غور سے میز کی طرف گھور رہا تھا اور مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا شخص ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی دیوار کے پار نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا ۔

"ہاں جادُو" دُبلا پتلا نوجوان بولا ۔ "اُسنے مجھ پر بچپن سے ہی جادو کر رکھا تھا ۔ اور ، اور جب میں نے ہوش سنبھالا میں اس کے پیچھے پیچھے گود کے کُتے کی طرح پھرتا رہتا تھا ۔ جہاں بھی وہ جاتی ، میں اس کے پیچھے جاتا ۔ وہ کسی سے ملنے کے لئے گھر کے اندر چلی جاتی تو میں دہلیز پر بیٹھ جاتا اور انتظار کیا کرتا کہ کب وہ باہر نکلے اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل سکوں ۔ وہ چوبارے میں بیٹھ کر سوئٹر بُنتی تو میں اس کے سامنے چوکی یا پتھر پر بیٹھ رہتا ۔ وہ ہنڈیا پکانے میں مصروف ہوتی تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو رہتا ۔ وہ سکول جاتی تو میں سکول کے دروازے تک اس کے پیچھے پیچھے جاتا ۔ پھر سکول میں داخل ہوتے وقت وہ مڑکر میری طرف دیکھتی اوراس کی آنکھوں میں ایک شریر مسکراہٹ چمکتی ، اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی شرارت میں مَیں اس کے ساتھ شریک ہوں ۔ سوئٹر بُنتے ہوئے تاگا توڑتے وقت یا سلائی پر دھاگے سمیٹتے

وقت مجھے وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ مسکراتی ۔ وہی مسکراہٹ جیسے ہم دونوں کسی
پوشیدہ شرارت میں اکٹھے شریک ہوں ۔ بس وہی مسکراہٹ مجھے اس بات پر
اکساتی تھی کہ میں گود کے کتے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھروں ۔"

"گھر کے سب لوگ اسے اس بات پر چھیڑا کرتے تھے ۔ میری ماں بھی
ہنس کر اس سے پوچھا کرتی ۔ "اے ہے تم نے تو لڑکے پر جادو کر رکھا ہے
کیا ۔" کوئی کہتا توبہ ہے اس لڑکے کو کیا ہے پلّے کی طرح تمہارے پیچھے پیچھے
پھرتا رہتا ہے ۔ کوئی کہتا یہ لڑکا تو اپنی ماں کے ہاتھوں سے بھی نکل گیا لیکن
ان دنوں میں ابھی بچہ ہی تھا ۔ اس لئے لوگ بات کرکے ہنس پڑتے تھے اور
بس ، وہ خود بھی ہنسا کرتی ۔ اور کبھی کبھی میرے قریب آکر میرے منہ پر ہلکا سا
تھپڑ مار کر کہتی ۔ "کیوں رے تجھے میرے پیچھے پھرنے میں مزہ آتا ہے کیا ؟"
اور پھر ایک عجیب سی نگاہ میری طرف ڈال کر دہراتی "مزہ آتا ہے ۔" اس کے
کہنے کا انداز ایسا ہوتا کہ میں ایک مزے بھری جھرجھری محسوس کرتا اور اس کی نگاہ
کی شرارت کی چمک کی وجہ سے میں محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو اونہوں کسی
کو بتانا نہیں کہ اِس مزے بھری شرارت میں ہم دونوں برابر کے شریک ہیں ۔
برابر کے ۔ چُپ ۔"

دُبلے پتلے نوجوان نے ایک شدید جھرجھری لی ، اور پھر جیبوں کو ٹٹول کر
دیا سلائی نکالی اور ماچس جلا کر پائپ کے لمبے لمبے کش لینے شروع کردیے ۔ اچکن
پوش بزرگ اپنا وِرد بُھول چکے تھے ۔ اور منہ کھولے دُبلے پتلے نوجوان کی طرف
دیکھ رہے تھے ۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا ۔ کھدّر
پوش ہاتھوں کے پیالے میں ٹھوڑی رکھے گہری سوچ میں پڑا تھا ۔ باہر ٹین کی
چھت پر بوندیاں گویا یوں جلترنگ بجا رہی تھیں جیسے کوئی مغنّی مزے میں آیا ہوا
ہو ۔

"اس مزے کی وجہ سے میں اپنی عمر سے پہلے ہی جوان ہوگیا" ۔ پتلا دبلا
نوجوان بولا "میرا مطلب ہے بچپن ہی میں جوانی کی شرارت گویا مجھ پر مسلّط
ہوگئی ۔ اسے بھی اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ اس بات پر ہنسا کرتی تھی ۔

اس کی ہنسی میں طنز نہیں ہوتی تھی ۔ اونہوں ! جیسے مصوّر اپنے نقش کو دیکھ کر
مسکراتا ہے ۔ وہ عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھی ۔ لیکن اس کی اس
رازدارانہ مسکراہٹ نے گویا مجھ میں بلوغت کا خمیر پیدا کر دیا تھا اور میں اپنے
آپ کو اس کا ہم عمر سمجھنے لگا تھا" ۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا ۔ "پھر اس کی مسکراہٹ کا وہ
رازدارانہ رنگ گویا اس کی آنکھوں سے رس رس کر بہنے لگا حتّٰی کہ اس کی ہر حرکت
اسی رنگ میں شرابور ہوگئی اور ۔۔۔ اور میری نظر میں اس کے جسم کے پیچ و
خم یوں عریاں دکھائی دینے لگے جیسے وہ ہولی کھیل کر آئی ہو اور ہر نگاہ کے ساتھ جو
میں اس کے اوپر ڈالتا میری آنکھوں میں اسی رنگ کی پھوار پڑتی اور میرے جسم
میں ایک ہوائی سی چل جاتی توبہ ہے"۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے
یوں بھیگے بھیگے انداز سے کہا جیسے وہ رنگ میں شرابور ہو گیا ہو ۔ پھر دفعتاً سر اٹھا
کر بولا ۔ "پھر اس نے وہ شرارت سازش میں بدل دی اور ۔۔ اور ایک معصوم
لڑکے کو جس نے عنفوانِ شباب کے عالم میں ابھی قدم رکھا ہی تھا ، گناہ کے
احساس سے شناسا کر دیا ، توبہ ہے" ۔ وہ پھر چلّایا "جو گناہ سے آشنا نہ تھا ۔ جس
نے گناہ کی آرزو تک نہ کی تھی اسے گناہ کے احساس سے شناسا کردیا اور شناسا ہی
نہیں بلکہ شرابور کرکے بھیگے کبوتر کی طرح اس کی قوّت پرواز ختم کردی اور یہ سب
ایک جملے ایک کنایہ سے چُپ کوئی آرہا ہے" ۔ کس قدر معصوم جملہ ہے ۔ لیکن
ایک خوبصورت مٹیار کے مُنہ سے رازدارانہ انداز سے نکلے تو ، توبہ ہے" ۔ ایک
ساعت کے لئے وہ خاموش ہوگیا ۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا ۔ "ہم دونوں ایک
دوسرے سے دُور بیٹھے ہوتے وہ اپنے کام کاج میں منہمک ہوتی ، اور میں چپ
چاپ نگاہوں سے اس کے پاؤں کی انگلیوں سے کھیل رہا ہوتا پاؤں کی چاپ سن کر
دفعتاً وہ میری طرف دیکھتی اور خاموشی سے اشارہ کرتی "چپ کوئی آرہا ہے" اور میرا
دل اچھلتا اور میں اپنے آپ کو یوں سنبھالتا جیسے کوئی پکڑا گیا ہو اور پھر میں محسوس
کرتا جیسے آنے والا ہمارے راز سے واقف ہو" ۔ وہ ہنسنے لگا ۔ "عجیب بات
تھی ۔ راز کی نوعیت جانے بغیر میں اس کے کھل جانے سے ڈرتا تھا ۔ مجھے

معلوم نہیں تھا کہ راز کے کھلنے کا ڈر پیدا کرکے دراصل وہ مجھے راز کی نوعیّت کی علمی تحقیق کرنے پر اکسا رہی تھی ۔"

"پھر ایک روز شام کے وقت جب ہم دونوں کمرے میں اکیلے اگرچہ دُور دُور بیٹھے تھے تو اس کے والد صاحب کی کھنکھار سُنائی دی ، وہ دیوانہ وار اُٹھی اور میرا بازو پکڑ کر گھسیٹ کر کمرے کے کونے میں لے گئی اور مجھے الماری کے پیچھے ٹھونس دیا ۔ وہ پہلا دن تھا ۔ جب اس معصوم شرارت پر سازش کی مہر لگ گئی" ۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ اور دروازے کے باہر گرتی ہوئی بوندیوں کو غور سے دیکھنے میں کھوگیا ۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی ۔ اچکن پوش بزرگ پھر سے سر جھکا کر ورد کرنے میں مصروف ہوگیا ۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد اضطراب بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرنے میں مصروف ہو جاتا ۔ آخر وہ بے اختیار ہو کر بولا ۔ "پھر ۔۔۔ پھر کیا ہوا" ۔

"پھر ۔۔۔ ؟" پتلا دُبلا نوجوان چونکا ۔ "پھر ۔۔ ؟" اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا قصّہ بیان کررہا تھا ۔ "اوہ ۔ ہاں" ۔ وہ چلّایا ۔ "پھر کیا ہونا تھا ۔ پھر وہی ہوتا تھا جو وہ چاہتی تھی ۔ اور کیا ہو سکتا تھا اور میں ۔ میرا عزم تو یوں شل ہو چکا تھا ۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا تھا ۔ پھر اسی روز اس نے مجھ سے کہہ دیا ۔ کہنے لگی ۔ "اب تم نہ آیا کرو میاں جب تک میں خود نہ بلاؤں ۔" پھر دفعتاً نہ جانے کیا سمجھ کر اس نے میری جانب دیکھا ۔ وہی سازشی نگاہ ، وہی چپ کا سا انداز ۔ "میں بلایا کروں گی ۔ وہ بولی "ہاں" اس ہاں نے وہ منفی احساس جو اس کے منع کرنے کی وجہ سے مجھ پر مسلّط ہوگیا تھا ۔ قطعی طور پر رفع کردیا ۔ اورمیں نے پہلی مرتبہ اسکی ہاں کا مثبت اثر محسوس کیا اس وقت گویا ساری کائنات سمٹ کر میری جھولی میں آگری ۔ آتشدان پر شانت آسن میں بیٹھا ہوا دیوتا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا اور آتش دان پر بچھے ہوئے کپڑے پر کاڑھے ہوئے پھولوں میں سے خوشبو کا ایک ریلا آیا اور سارا کمرہ خوشبو سے بھر گیا ۔" وہ ہنسنے لگا ۔ "عجیب عمر تھی وہ بھی ۔

کاش کہ میں اس جادوگرنی کے سحر میں نہ آتا" ۔ اس کی ہنسی زہر خند میں تبدیل ہوگئی ۔ وہ اٹھ بیٹھا اور دروازے میں کھڑے ہو کر درختوں کے جُھنڈ تلے بکھری ہوئی قبروں کی طرف دیکھنے لگا ۔

"عجیب واقعہ ہے" ۔ اچکن پوش بزرگ نے زیرِ لب کہہ کر آہ بھری ۔ "تو کیا اس نے تمہیں بلایا" ۔ مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد نے پوچھا ۔

"ہاں" وہ بولا ۔ "کئی بار ، لیکن بے کار ۔ ہر بار جب بھی بلاتی تو کوئی نہ کوئی آجاتا اور مجھے پردے یا الماری کے پیچھے چھپا دیا جاتا ۔ جہاں میرا دل دھک دھک کرتا ۔ میرے جسم کا بند بند سمٹتا پھیلتا ، میرا حلق بند ہو جاتا اور چاروں طرف سے ایک ان جانا بوجھ مجھ پر پڑجاتا ۔ توبہ ہے" ۔ وہ چلّایا "جیسے جیسے ڈر اور خوف مجھے انڈے کی طرح پھینٹ کر رکھ دیتے ۔ لیکن اس کے باوجود میں انتظار کرتا رہتا کہ کب وہ بلائے اور میں جاؤں ۔۔۔ "پھر" وہ آہ بھر کر بولا" پھر اس کی شادی ہوگئی ۔ اور ۔۔۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مجھے اس بات پر دکھ نہ ہوا کہ وہ کسی اور کی ہو رہی ہے بلکہ صرف اس بات پر کہ اس سے چوری چھپے ملنے کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا ۔ حالانکہ ہمارے ملنے کی صورت کبھی پیدا نہ ہوئی تھی ۔ عجیب بات ہے نا" ۔ وہ پائپ کا کش لیتے ہوئے بولا ۔ اور جب وہ رخصت ہونے لگی تو اکیلے میں مجھ سے کہنے لگی ۔ تُم فکر نہ کرنا ۔ میں تمہیں بلاؤں گی ۔ میں بلاؤں تو آنا ضرور ۔ ضرور آنا ۔ اس کی اتنی سی بات پر مجھے اطمینان سا ہوگیا اور میری تمام شکایات یوں ختم ہوگئیں جیسے پیدا ہی نہ ہوئی ہوں اور ایک بار پھر میں انتظار کی لذّت میں کھوگیا۔

"چھ مہینے گزر گئے" ۔ اس نے مختصر سے وقفے کے بعد کہا ۔ "لیکن مجھے اس کا بلاوا نہ آیا ۔ اس کے رنگین وعدے کا سحر ٹوٹنے لگا اور ۔" اور وہ زہر خند کے ساتھ بولا ۔ "ایک روز میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر وہاں جا پہنچا ۔ جہاں وہ رہتی تھی ۔ اور پھر ایک رات جب اس کا خاوند گھر پر نہ تھا ۔ میں ناگہاں اس کے روبرو جا کھڑا ہوا ۔"

"مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گئی ، لیکن جلد ہی سنبھل کر بولی ، "شکر ہے

تم آگئے ۔ آؤ آؤ لیکن ادھر اس کونے میں کوئی نوکر نہ دیکھ لے" ۔ اس نے مجھے اسی نگاہ سے دیکھا ۔ وہی سازش وہی شوخی ، وہی نیم مدہوشی ۔ مجھے وہاں بٹھا کر وہ کام کاج میں مصروف ہوگئی ۔ اور رنگین تتلی کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگی ۔ ہر چند منٹ کے بعد چپکے سے وہ اس کونے میں آجاتی جہاں میں بیٹھا تھا ۔ اور پھر وہی نگاہ ، وہی تبسّم ۔۔ کام کاج سے فارغ ہو کر جب ہم اٹھے ہوئے تو وہی بات وقوع میں آئی جو ایسے موقعہ پر ہمیشہ ہوا کرتی تھی ۔ بیٹھے بٹھائے آہٹ کی آواز سن کر وہ زیرِ لب چلّائی ۔ "وہ ۔ وہ آگئے اور پھر اپنی بانہوں میں تھام کر گھسیٹتے ہوئے وہ مجھے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں لے گئی ۔ اور مجھے وہاں بٹھا دیا ۔ "چپ" وہ بولی اور دروازے کے پٹ بند کرکے خود باہر نکل گئی ۔ اور میں اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلا رہ گیا ۔ توبہ ہے، اس رات میرا کیا حال ہوا ۔ توبہ ہے" ۔ پتلے دُبلے نوجوان نے لمبی آہ بھر کر کہا ۔ "خوف کا ایک آرہ تھا جو مجھے کاٹ رہا تھا ۔ وہی بوجھ ۔ وہی گھٹن ۔ وہی تناؤ ۔ توبہ ہے" ۔

"دو گھنٹے وہاں دبک کر بیٹھنے کے بعد میرے لئے وہ تکلیف نا قابلِ برداشت ہوگئی اور خطرے سے بے پروا ہو کر میں نے باہر نکل بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ۔ جب میں دبے پاؤں نکلا تو کیا دیکھتا ہوں توبہ ہے" وہ چلّایا "توبہ ہے" ۔

"کیا" مونچھوں والا بولا ۔

"وہ اکیلی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی ۔ ایک بازو سر تلے دبایا ہوا تھا ۔ اور اس کے چہرے پر اتنی مسرت اور شگفتگی چھائی ہوئی تھی جیسے خوشی سے سرشار ہو اور سارے گھر میں اس کے اور اس کی نوکرانی کے سوا کوئی نہ تھا ۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ اس کی تمام تر خوشی اسی بات پر موقوف تھی کہ کسی کو الماری یا پردے کے پیچھے چھپا دے ۔ جہاں وہ تڑپ تڑپ کر اپنا آپ اس کے لئے ہلکان کرتا رہے اور خود اطمینان سے سو جائے ۔ غصّے سے میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ مجھے پکڑ لیتی میں ہمیشہ کے لئے اس کے سحر سے نکل آیا ۔ بھاگ آیا ۔"

"گھر آتے ہی میں نے امّاں سے کہا ۔ امّاں میری شادی کر دو ۔ چاہے کسی سے کردو ۔ اماں کردو ۔۔۔ اور جب میری شادی ہوگئی اور میری حسین و جمیل بیوی میرے پاس آگئی تو ۔۔" تو وہ رُک گیا "توبہ ہے" ۔ وہ بولا ۔ "حد ہوگئی حد" ۔

"کیا" ۔ مونچھوں والے نے بے تابی سے پوچھا ۔

"جب میں اپنی نئی دلہن کے پاس بیٹھا تھا تو دفعتاً میرا جی چاہنے لگا کہ کوئی آجائے اور میری بیوی مجھے گھسیٹ کر لے جائے اور کہیں چھپاتے ہوئے وہ آگئے ۔ چُپ کہے ۔ میری اپنی بیوی" ۔ وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا ۔ "اور آج تک ۔ آج تک میری یہی حالت ہے" وہ بولا ۔ "مگر کوئی نہیں آتا اور کوئی آبھی جائے تو وہ ایسا نہیں کرتی ۔ یہ نہیں کہتی وہ آگئے وہ ۔ وہ ۔ توبہ ہے ۔ توبہ ہے" وہ چلّایا "میں کتنا کمینہ ہوں ، کتنا کمینہ ہوں میں مگر یہ سب کچھ اس کے سحر کا نتیجہ ہے ۔ ہاں اسی کا ۔ اور آج ابھی جب میں اس کی قبر کے پاس بیٹھا تھا ۔ تو خدا کی قسم میں منتظر تھا کہ وہ باہر نکل کر کہے وہ آگئے وہ ۔" وہ دیوانہ وار ہنسنے لگا ۔

باہر ہوا درختوں کی ٹہنیوں میں رو رہی تھی ۔ جانی ندی بین کر رہی تھی ۔ بوندیاں چھم چھم گر رہی تھیں ۔ اور اس کی دیوانگی بھری ہنسی کس قدر خوفناک تھی ۔ پھر دفعتاً اُس کی ہنسی ایک کراہ کے ساتھ ختم ہوگئی ۔ اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر میز پر کہنیاں ٹیک کر بیٹھ گیا ۔ اور کمرے میں کرب ناک خاموشی چھا گئی ۔

"چائے بابوجی" ۔ چھوٹا لڑکا ٹرے پر چائے کے چار پیالے رکھے ہوئے داخل ہوا اور ایک ایک پیالہ ان کے سامنے رکھ کر باہر نکل گیا ۔

چائے آجانے سے کمرے کے ماحول میں کچھ تبدیلی سی ہوگئی ۔ "زندگی کس قدر عجیب ہے" کھدر پوش نے کہا ۔۔ "ان دکھوں اور غموں کے باوجود جو ہمیں برداشت کرنے پڑتے ہیں" ۔ اچکن پوش نے لمبی آہ بھری ۔ "بجا ہے" ۔ وہ بولے ۔ "لیکن صاحب انجامِ کار سب نے یہیں آجانا ہے" ۔ کھدّر پوش نے

مونچھوں والے ادھیڑ عمر کے مرد کی طرف دیکھا ۔ "معلوم ہوتا ہے آپ بڑے دکھی ہیں" ۔ وہ بولا ۔ "کوئی عزیز داغِ مفارقت دے گئے ہیں کیا" ۔

"میرے عزیز" مونچھوں والے نے سر اٹھایا ۔ نہیں عزیز تو نہیں ۔ اس کی مجھ سے رشتہ داری نہ تھی ۔ "تو" کھدر پوش مسکرایا "محبت" وہ فقرہ مکمل کئے بغیر چپ ہوگیا ۔

"محبت" مونچھوں والے نے آہ بھر کر دہرایا ۔ "کاش میں اس کی محبّت کی قدر کرتا ۔ میں نے قدر نہ کی" ۔ اس کی آواز بھر آئی ۔ "وہ میری محسن تھی صاحب محسن" ۔

"محسن تھی" ۔ اچکن والے بزرگ نے "تھی" پر زور دیتے ہوئے کہا ۔

"ہاں" مونچھوں والا بولا ۔ "وہ بھی عورت تھی ۔ اب تم سے کیا چھپانا ہے بھائی صاحب" ۔ اُس نے کہا ۔ "اس بات کو تو سب ہی جانتے ہیں ۔ ہمارے گھر میں اللہ کا فضل رہا ہمیشہ ۔ اپنا کاروبار ہے ۔ کام کرنے کے لئے کارندے ہیں ۔ مجھے صرف دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے اور باقی سارا وقت اپنے شغلوں میں صرف ہو جاتا ہے ۔ بے فکری ہے ۔ پیسہ عام ہے ۔ ساری عمر اپنی کھانے پینے اور عیش کرنے میں صرف ہوئی ہے ۔ جو چاہا مل گیا ۔ جس کی آرزو کی وہ حاصل ہوگئی ۔ محبّت کرنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی ۔ البتہ کبھی کبھار کسی پر طبیعت آگئی اور طبیعت اپنی ایسی کمبخت ہے کہ جب کسی پر آجائے تو" ۔ وہ ہنسنے لگا ۔ "میں اندھا ہو جاتا ہوں ۔ تمہاری قسم پھر کچھ نہیں سوجھتا ۔ جی چاہتا ہے چاہے ساری دولت ہی کیوں نہ لٹانی پڑے اسے حاصل کرلوں ، اور پھر جب حاصل ہو جائے تو چند ایک روز میں چاؤ اتر جاتا ہے اور پھر اپنی توجہ کسی اور طرف لگ جاتی ہے ۔ اللہ کا فضل ہے ۔ آج تک کبھی ناکامی نہیں ہوئی جو چاہا ملا ۔ جسے چاہا حاصل کرکے چھوڑا" وہ ہنسنے لگا ۔

"کوئی پانچ سال ہوئے ہوں گے ۔ جب اتفاق سے اپنی نظر ایک کالج کی لڑکی پر پڑ گئی تھی ۔ اور کیا بتاؤں تمہیں ایسی بری طرح مچل گئی طبیعت کہ میں پاگل ہوگیا ۔ بس بھائی صاحب ہر جتن کرکے دیکھ لیا ، اس کی منّتیں کیں ، لالچ

دیا ، کہلوا بھیجا میں دولت لنڈھا دوں گا ۔ صرف ایک بار مجھ سے مل جا ۔ بیسیوں کٹنیوں اور دلّالوں کو بیچ میں ڈالا ۔ مگر اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ پھر اُٹھا لے جانے کی دھمکیاں دیں ۔ سب بے کار ۔ اور جوں جوں مجھ میں ناکامی کا احساس بڑھتا توں ، توں میرا جنون اور بڑھتا ۔ حتیٰ کہ یہ حالت ہو گئی ۔ کہ مجھے وہ عیش و عشرت کھٹکنے لگا جس کا میں عادی تھا ۔"

"ان دنوں اس محلے میں جہاں وہ رہتی تھی عین اس کے گھر کے سامنے ایک مکان جو خالی ہوا تو میں نے جھٹ اُسے سرے سے خرید ہی لیا ۔ اور اس مکان کو اپنی بیٹھک بنا لیا کہ دیکھو شاید داؤ چل ہی جائے ۔ لیکن میری کوئی پیش نہ گئی ۔ وہ لڑکی نہ جانے کیا نام تھا اس کا ۔ عجیب سا نام تھا ۔ لیکن ہم چاریاری میں اُسے شہزادی کہا کرتے تھے ۔ وہ بالکل قابو میں نہ آئی ۔

"اسی محلّے میں ہمارے ساتھ والے مکان میں یہ عورت رہا کرتی تھی جس کی قبر پر میں آج یہاں آیا ہوں ۔

اس نے دو چار بار مجھے اپنی نوکرانی کے ہاتھ بلوا بھیجا عجیب عجیب بہانوں سے بلایا کرتی تھی ۔ پہلی مرتبہ نوکرانی نے کہا ۔ "ذرا ادھر آؤ تو ۔ بی بی بُلا رہی ہیں ان سے بات کر لیجئے ۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہیں" ۔ دوسری بار تھوڑی سی برانڈی منگوا بھیجی ۔ اسی طرح چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے پر اکسایا گیا ۔ لیکن اپنی طبیعت تو ان دنوں شہزادی پر مائل تھی ۔ اور سچ پوچھو تو بیاہی ہوئی عورت سے اپنے کو کبھی دلچسپی نہیں ہوئی طبیعت ہی ایسی ہے ۔

"پھر ایک روز جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے تو اس کی نوکرانی پرچی لے کر آگئی ۔ لکھا تھا "شہزادی سے ملنا ہو تو رات کے ایک بجے آؤ ۔" میں اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا مجھے یقین نہیں آتا تھا ۔ ڈر تھا کہ انتقام لینے کے لئے چال نہ چلی گئی ہو ۔ جس عورت کو آپ دھتکاریں" ۔ وہ کھدرپوش سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ۔ "وہ انتقام لینے پر آمادہ ہو جایا کرتی ہے ۔ بہر صورت چاریاری میں آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو ہمیں

آزمانا ضرور چاہیئے ۔ تو بھائی صاحب ہم نے حفاظتی تدابیر سوچ لیں اور میرے چاروں یار گھر کے چاروں طرف چوکنّے بیٹھے رہے کہ کوئی چال ہو تو مکان پر دھاوا بول دیں اور میں مکان کے اندر چلاگیا ۔ اس رات پہلی مرتبہ میں نے اسے دیکھا ۔ وہ بے حد خوبصورت تھی شہزادی سے بھی زیادہ خوبصورت تھی ۔ لیکن خوبصورتی کیا چیز ہے بھائی صاحب سارا کھیل تو طبیعت کا ہے ۔ وہ صرف دو ایک منٹ میرے پاس ٹھہری اور پھر شہزادی کو میرے حوالے کرکے آپ چلی گئی ۔ اور بھائی صاحب اس عورت نے کیا جادو کر دیا تھا اس لڑکی پر وہ تو بالکل رام ہو چکی تھی رام ۔ پھر ہم وہاں اکثر جانے لگے ۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ملانے کے بعد وہ اپنا تقاضہ شروع کر دے گی ۔ لیکن میرے شک بالکل ختم ہو گئے اس کی نگاہوں اور انداز میں بلا کی آن تھی ۔ آن اور بے تعلقی ۔ وہ میرے پاس صرف دو ایک منٹ کیلئے ٹھہرتی تھی ، لیکن جب میں وہاں جاتا اور جب وہاں سے لوٹتا تو وہ آتی ضرور اور ہنس کر مجھ سے کہتی تم آگئے تم جا رہے ۔ پھر کب آؤ گے ، وہ ہمیشہ مجھے تم کہا کرتی تھی ۔ عجیب عورت تھی وہ ۔ ہاں بھائی صاحب وہ آہ بھر کر بولا چار ایک ماہ تک ہم ملتے رہے ۔ لیکن پھر اپنی طبیعت اکتا گئی ۔ جیسے ہمیشہ اپنا طریقہ ہے ۔" وہ ہنسا "اور پھر وہ سلسلہ ختم ہوگیا ۔"

"کوئی چھ ماہ کے بعد ایک روز جب اپنی اسی بیٹھک میں مَیں ایک نئی لڑکی پھنسا کر لایا ہوا تھا تو نہ جانے کس نے مرا بھید فاش کر دیا ۔ اور لڑکی کے رشتہ دار پولیس لے کر وہاں آگئے اب وہ آدھی رات کے وقت نیچے میرا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں اور اوپر میں سخت گھبرایا ہوا ہوں ۔ بدنامی اور رسوائی کے ڈر سے ، لڑکی کو اِدھر اُدھر بھی نہیں کر سکتا ۔ سارے محلّے دار اپنے دشمن تھے ۔ کرتا کیا عجیب مصیبت میں گرفتار تھا کہ دھم سے وہ کوٹھا پھاند کر میرے گھر میں اتر آئی اور آتے ہی بولی تم چلے جاؤ جی وہاں اُس کمرے میں ، مَیں سنبھال لوں گی ۔ اس وقت اس نے عجیب سی پوشاک پہن رکھی تھی ۔ ساری اور بنڈی اور نہ جانے کیا کیا ۔ حالانکہ وہ ساری نہیں باندھتی تھی ۔ بال بھی عجیب سے بنا رکھے تھے ۔ پہچانی ہی نہیں جاتی ۔ غالباً وہ جان بوجھ کر بھیس بدل کر آئی تھی ۔

"اُف" اس نے آہ بھری بڑی دلیر عورت تھی وہ ۔ دلیری سے اس نے باہر کا صدر دروازہ کھولا اور سب کے سامنے کھڑی ہوگئی ۔ "کیا ہے" وہ بولی ۔ میرے میاں خود گھر پر نہیں ہیں ۔ میں ان کی بیگم ہوں" ۔ اسے یوں کھڑا دیکھ کر پولیس والے اور ان کے ساتھی چوہوں کی طرح دبک کر چلے گئے اور میں صاف بچ گیا ۔ صاف ۔

"اسی روز جب وہ مجھ سے اکیلے میں ملی تو اس کے لئے میرے دل میں شدید جذبہ تھا ۔ میں نے اس سے کہا اگر تمہارے خاوند کو معلوم ہوگیا تو ۔ بڑی دلیری کی ہے تم نے ۔ "تم میری فکر نہ کرو" ، وہ بڑی آن سے بولی ۔ اپنی بات کرو تم ، اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا ۔ میرے دل میں اس کے لئے محبّت کا ایک طوفان سا چل رہا تھا ۔ میں نے پہلی مرتبہ لپک کر اسے بازوؤں سے تھام لیا ، لیکن وہ تڑپ کر باہر نکل گئی ۔ میرا احسان اتار رہے ہو ۔ وہ بولی ، اونہوں ! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ۔ وہ ہماری آخری ملاقات تھی ۔

"پھر میں نے اس بیٹھک میں اپنا قیام چھوڑ دیا اور پھر جب میں نے کل ناگاہ سنا کہ وہ انتقال کر گئی ہے تو میں غم سے پاگل ہوگیا ۔ اور آج اس کی قبر پر بیٹھے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری واحد محبوب تھی ۔ اور جیسے وہ قبر سے نکل کر کہے گی ۔ "تم ، تم میرا فکر نہ کرو ، جاؤ گھر جاؤ" ۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی آنکھیں پونچھنے لگا ۔

دیر تک کمرے میں طویل خاموشی چھائی رہی ۔ پتلا دُبلا نوجوان ویسے ہی ٹھوڑی ہاتھوں میں رکھ کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ۔ کھدر پوش میز کو انگلی سے بجا رہا تھا ۔ اور اچکن پوش معمّر آدمی زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا ۔ اور ۔ اور آپ پتلا دُبلا نوجوان چونک کر بولا "آپ کیسے آئے ہیں ۔ یہاں آپ کا کون عزیز فوت ہوگیا ہے" ۔ وہ اچکن پوش اور کھدّر پوش دونوں اصحاب میں سے نہ جانے کس سے مخاطب تھا ۔

کھدّر پوش مسکرایا ۔ "میرا گرو" ۔ وہ بولا "میرا پیر سمجھ لو میرا سبھی کچھ ۔

وہ اس قبرستان میں دفن ہے ۔ اس نے مجھے وہ دولت بخشی ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے ۔ اگر میں اس سے نہ ملتا تو آج میں بھی عام نوجوانوں کی طرح سرخ ہونٹوں ، سیاہ بالوں ، متبسم آنکھوں اور سنہرے بدن کی ان بوتلوں میں کھویا ہوتا ۔ جو آج کل سڑکوں اور بازاروں میں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں ۔ شاید آپ نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ عورت کا وجود کتنا دبیز پردہ ہے ، جو ہماری عقل پر پڑا ہے اور آج کی تہذیب اسے اور رنگین اور دبیز بنانے میں شدّت سے مصروفِ کار ہے ۔ اس جیتے جاگتے رنگین بھنور کا صرف ایک مقصد ہے کہ وہ مرد کو لے ڈوبے اور اس کی کائناتی نگاہ کو ناکارہ کردے ، اسے زندگی سے بیگانہ بنادے ۔ اُف کتنا عظیم پردہ ہے ۔" وہ شانے ہلاتے ہوئے بولا ۔ ایسا پردہ جسے ہم بخوشی اپنی عقل پر ڈالنے کے مشتاق ہیں ۔ کتنی بڑی رکاوٹ ہے ۔ اگر میری اس سے ملاقات نہ ہوتی ، تو آج میری حسّیات پر بھی وہی پردہ پڑا ہوتا ۔ میرے بھی پَر کٹے ہوتے تمہاری طرح ۔"

اچکن پوش معمّر نے سر اٹھاکر غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کردیا ۔ مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا مرد حیرانی سے منہ کھولے بیٹھا تھا اور دُبلے پتلے نوجوان پر مایوسی سی چھائے جا رہی تھی ۔

"ہاں" کھدّر پوش بولا ۔ "یقین کیجئے ، یہ سب اسی کی دین ہے اسی کی ۔ حالانکہ مجھے صرف ایک مرتبہ ملی تھی ، صرف ایک مرتبہ" ۔

"ملی تھی" اچکن پوش کی دونوں آنکھیں گویا باہر نکل آئیں ۔ مونچھوں والوں کے کھلے ہونٹوں پر تبسّم دوڑ گیا ۔ دبلے پتلے نوجوان نے دفعتاً اضطراب سے پائپ کے کش لینے شروع کر دئے ۔

کھدّر پوش مسکرایا ۔ "ہاں" وہ بولا ۔ "میری گُرو بھی ایک عورت تھی بلکہ حسین عورت ۔ ایک رنگیں ترین بھنور ۔ ایک ایسی ناگن جس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا" ۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ کمرے پر گہری خاموشی چھاگئی ۔ باہر درختوں میں گویا بھوتنیاں ناچ رہی تھیں ۔ دور جاتی ندی سر ٹیک ٹیک کر رو رہی تھی ۔ درختوں کی ٹہنیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں ۔ اور چولھے پر رکھی

ہوئی چائے کی کیتلی ایک غم ناک دھن بجا رہی تھی ۔

"میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں" ، کھدّرپوش بولا ۔ "ہمارا گاؤں پہاڑ پر واقع ہے ۔ سمجھ لو کوئی چھ ہزار فٹ کی بلندی پر ۔ بچپنے سے ہی ہم پہاڑوں پر چڑھنے کے شوقین تھے اور اکثر بہت دور بہت اونچے نکل جایا کرتے تھے ۔ ہمارے گاؤں سے اوپر کوئی چار ہزار فٹ اوپر یا شاید زیادہ ایک غار ہے جسے قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے ۔ اس کا منہ تنگ ہے مگر اندر سے کافی وسیع و عریض ہے ۔ اس کی چھت بہت اونچی ہے اور فرش بہت صاف ۔ جس کے ایک طرف سے چشمہ نکلتا ہے اور وہیں تالاب سا بن جاتا ہے اور پھر نہ جانے اس کا پانی کدھر کو بہ نکلتا ہے گویا نیچے ہی نیچے غائب ہو جاتا ہے اور اس غار سے منظر اس قدر خوبصورت دکھائی دیتا ہے کہ ہم دیکھ کر دم بخود رہ جایا کرتے تھے ۔ پھر موسمِ سرما میں جب چاروں طرف برف پڑ جاتی تو اس غار سے ایک عجیب نظارہ دکھائی دیتا ۔ عجیب" ۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا لیکن موسمِ سرما میں راستے بند ہو جایا کرتے تھے اور وہاں پہنچنا محال ہو جاتا ۔ پھر بھی پہلی بار برف پڑتی تو ہم وہاں ضرور پہنچتے اور وہاں سے عجیب نظارہ نظر آتا جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو ۔ اور ہی جہان ہو ۔

"جب میں جوان ہوا تو نہ جانے کیوں میرے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی نئے فیشن کی حسین عورت ہو اور ہم دونوں موسم سرما میں اکیلے اس غار میں رہیں ۔ اکیلے نہ جانے یہ خواہش میرے دل میں کیسے پیدا ہوئی مجھے معلوم نہیں ۔ لیکن وہ بڑھتے بڑھتے جنون کی صورت اختیار کر گئی ۔ ویسے پہاڑ کی عورتیں تھیں ۔ مگر مجھے ان سے نفرت تھی ۔ میری نگاہ میں وہ عورتیں ہی نہیں تھیں ۔

پھر والد کے انتقال کے بعد میں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کردیں ۔ بات بڑی مشکل تھی ۔ ایسی عورت کو ڈھونڈنا بے حد مشکل تھا ۔ تو قصہ مختصر مَیں اکثر شہر جانے لگا ۔ کیونکہ شہر میں بہت سے لوگ میدانوں سے آتے تھے اور ان کے ساتھ وہ بیر بہوٹیاں ہوتی تھیں ۔ جن کے

ساتھ غار میں رہنے کا مجھے خبط تھا ۔ آہستہ آہستہ میں نے شہر کے دلّالوں سے راہ و رسم بڑھائی ، لیکن میری بات سن کر وہ ہنس دیتے ۔ "جی ایک دو دن کی بات کرو ۔ اکٹھا ایک ہفتہ اور وہ بھی برف کے دنوں میں اور پھر جناب اتنی دُور غار میں جانے کو کون تیار ہو گی" ۔

"پھر ایک دن جب میں شہر ہی میں تھا اور ابھی پہلی ہی برف پڑی تھی تو ایک دلّالہ بھاگی بھاگی آئی ۔ "کام بن گیا" وہ بولی ، "لیکن پیسہ بہت خرچ ہو گا ، نہ جانے کون ہے وہ ، یہاں اکیلی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے ۔ برف دیکھنے آئی ہے ۔ ساتھ نوکرانی ہے ۔ کوئی ایسی ویسی نہیں ۔ بڑے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے ۔ مگر اس کی نوکرانی کی جھولی بھر دو تو وہ کہتی ہے کہ میں منالوں گی اُسے ۔"

"اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا ۔ روپے کی تو مجھے پرواہی نہیں تھی ۔ میں نے کہا غار میں جائے گی ، ہاں وہ بولی اس کی نوکرانی کہتی ہے میں لے چلوں گی ۔ پر یہی دو تین دن کے لئے زیادہ نہیں تو خیر صاحب بات پکی ہو گئی اور ہم وہاں پہنچ گئے ۔ غار میں پہنچ کر جب اس نے برقعہ اتارا تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا ۔ اس کی بھویں چڑھی ہوئی تھیں ۔ اسکی آنکھیں اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں ۔ اور اس کے ہونٹ بے نیازی سے بھیگے ہوئے تھے ۔ جیسے اسے جسم سے کوئی تعلق ہی نہ ہو ۔ جیسے وہ زمین سے نہیں آکاش سے اتری ہوئی ہو"۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ پتلا دُبلا نوجوان منہ کھولے بیٹھا تھا ۔ اچکن پوش کی آنکھیں ابلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور مونچھوں والے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر ایک سفید لمبی ڈاڑھی اُگ آئی ہو ۔ ہوٹل کا لڑکا جو برتن اُٹھانے آیا تھا ۔ چُپ چاپ دروازے کے پٹ کے ساتھ چپکا کھڑا تھا ۔ جیسے کھو گیا ہو ۔

"تین دن ہم وہاں اکٹھے رہے ۔ تین دن" ۔ کھدّرپوش نے بات شروع کی ۔ "وہ غار نہیں رہا تھا ۔ اس کی آمد کے بعد گویا وہ ایک مندر میں بدل چکا تھا ۔ وہ عورت نہیں تھی ۔ وہ ایک دیوی تھی اور میں ہوس کار نہیں تھا ۔ وہ

مجھ سے بہت قریب ۔ بہت قریب ۔۔۔ لیکن نہیں وہ مجھ سے قریب نہیں تھی دُور ۔۔ بہت دُور ۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھے پڑا تھا ۔ میرے ہاتھ اس کی پنڈلیوں سے چُھو رہے تھے ۔ لیکن وہ گوشت پوست کی پنڈلیاں نہیں تھیں ۔ وہ نور کی بنی ہوئی تھیں ، اسی نور کی جو غار سے باہر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا چاروں طرف اور پھر نیچے سے اُوپر تک چوٹیوں سے اُوپر ۔ بادلوں سے اُوپر ۔ نیلے بادلوں سے اُوپر ۔ نیلے آسمان سے اُوپر" ۔ ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گیا ۔ پھر بولا ۔ "ان تین دنوں میں میں نے اس کے جسم کے ایک ایک حِصّے پر سجدے کئے ۔ اس کے بند بند پر آنکھیں ملیں ۔ اسکے روبرو بیٹھ کر بھجن گائے ۔ سب کچھ کیا ۔ لیکن نہ جانے کیوں میری خواہشات میں ہوس کا عنصر نہیں تھا ۔ ہمارے جسم گویا فنا ہو چکے تھے ۔ ہماری آرزوئیں اس پھیلی ہوئی سفیدی میں گویا ڈُھل چکی تھیں ۔ اس لطیف فضا میں محبّت اور تحیّر کے سوا کچھ نہ تھا ۔ بے غرض محبّت ۔ بے نام تحیّر ۔ لیکن آپ نہیں جانتے ۔ آپ نہیں سمجھ سکتے ۔" وہ بولا ۔ "آپ کبھی دس ہزار فٹ سے اوپر نہیں گئے ہونگے ۔ آپ نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہوتا ہے ۔ کیسے جان سکتے ہیں آپ" ایک ساعت کیلئے وہ خاموش ہو گیا ۔

"تیسرے دن جدائی کے خیال سے میری گھگھی بندھ گئی ۔ میں اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا تھا ۔ میں ہمیشہ کے لئے اسے دیوی بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا ۔ میں نے منّتیں کیں ۔ ہاتھ جوڑے ۔ سبھی جتن کئے ۔ لیکن جواب میں وہ خاموش رہی ، بالکل خاموش جیسے گونگی ہو ۔

"عمر بھر کے لئے ہونا منظور نہیں" میں نے کہا "تو صرف ایک بار پھر صرف ایک بار ایک مہینہ ۔ ایک ہفتہ ۔ ایک دن" ۔

"آخر میری مسلسل منّتوں کا یہ اثر ہوا کہ اس نے ایک بار پھر ملنے کا عدہ کر لیا ۔ ہم نے ایک تاریخ مقرر کرلی ۔ اور پھر وہ چلی گئی ۔

"اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ وہ ایک سال میں نے کیسے گزارا ۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ مقررہ دن میرے نزدیک اتنا اہم تھا جتنا کہ قتل کے ملزم کے لئے

فیصلہ کا دن ہوتا ہے میرے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی ۔ ضرور آئے گی اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا چاہے وہ ایک دن کے لئے آئے یا ایک ہفتہ کے لئے میں اسے واپس نہیں جانے دوں گا ۔ اور ہم موسمِ سرما وہیں گزاریں گے ۔ اسی خیال کے تحت میں نے چار مہینے کی جملہ ضروریات کی چیزیں اس غار میں پہلے ہی سے پہنچا دی تھیں اور بالآخر وہاں اپنی دیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا"۔

مونچھوں والے نے ڈھیلے ہونٹوں سے کہا "پھر ؟"

"لیکن وہ نہ آئی" ۔ وہ بولا "نہ آئی حتیٰ کہ راستے مسدود ہو گئے اور مَیں نے محسوس کیا کہ میں اتنے مہینوں کے لئے اِس برف خانے میں دفن کر دیا گیا ہوں ۔ پہلے دو تین دن تو میں غار کے اندر اس خیالی مجسمے کے سامنے کتّے کی طرح پڑا روتا رہا ۔ پھر جب وہ دیوانگی دور ہوئی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ وہ وہیں کھڑی تھی ۔ جہاں وہ پچھلے سال کھڑی ہوا کرتی تھی ۔ اس کی بھویں اٹھی ہوئی تھیں ۔ اس کی آنکھیں باہر اُوپر کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ یوں مسکرا رہی تھی ۔ جیسے مجھے بھی باہر اُوپر کی طرف دیکھنے کی ترغیب دے رہی ہو ۔ میں نے پہلی مرتبہ اطمینان اور سکون سے باہر دیکھا ۔ لیکن آپ" ۔ وہ بولا ۔ "آپ اس منظر کو ذہن میں نہیں لاسکتے ۔ آپ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہیں گئے کبھی"۔

"دس ہزار فٹ کی بلندی سے اُوپر اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرتے ہوئے کہا ۔ "فضا اس قدر لطیف ہوتی ہے اور عالم اس قدر نورانی ہوتا ہے جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں دُودھیا سویرا پھیلا ہوتا ہے ۔ اس بلندی پر یہاں صبح صادق کے دُودھیا سویرے کو قیام اور دوام مل جاتا ہے ۔ اس دُودھیا سویرے میں نگاہیں ہمیشہ اوپر کو اٹھتی ہیں ۔ اور انسان محسوس کرتا ہے جیسے وہ اڑ رہا ہو ۔ انسانی کثافت کا بوجھ گویا اس کی پیٹھ سے اتر گیا ہو ۔ اس کی آرزوؤں میں شدّت کی وہ دھار نہیں رہتی ، اس کے دکھوں اور حسرتوں میں تکلیف کا عنصر ختم ہو جاتا ہے ۔ اس کے بغض ، دشمنیاں ، نفرتیں سب یوں اپنی کثافت کھو بیٹھتی ہیں ، جیسے مشین سے دَبی ہوئی روئی کی گٹھڑی کو دھنک کر

صاف کر دیا گیا ہو ۔ وہاں روح سے بوجھ اتر جاتا ہے ۔ وہاں کوئی ہوس کاری کا شکار نہیں ہو سکتا وہاں کوئی جرم سرزد نہیں ہو سکتا ۔ وہاں کوئی گناہ سے آلودہ نہیں ہو سکتا ۔ جیسے یہاں صبح صادق کے وقت کوئی جرم نہیں کر سکتا ۔ عیش و نشاط کی محفلیں چار بجے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں ۔ حتّٰی کہ اس وقت محبوبہ کے لئے برہا کا راگ بھی گایا نہیں جاسکتا ۔ صرف حمد و ثنا صرف کائناتی جذبہ ہی اس وقت قیام حاصل کر سکتا ہے ۔ اس دُودھیا سویرے میں وہاں عشق جسم کے بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے اپنی انا اپنی ذات سے نکل کر کائنات کے ذرّے ذرّے پر بکھر جاتی ہے ۔ وہ بلندی اور پھر وہ پاکیزہ نورانی برف ، وہ چاروں طرف پھیلا ہوا نور ۔ اور وہ سکوت ۔ گہرا بے اتھاہ سکوت" ۔ وہ خاموش ہوگیا ۔ کمرے پر گویا دودھیا سویرا چھا گیا ۔

"تین مہینے کی اِس نور سے بھیگی ہوئی تنہائی نے مجھے اپنی انا سے نکال کر ساری کائنات پر مسلّط کر دیا" ۔ اس نے سلسلۂ کلام از سرِنو جاری کیا ۔ "اور وہ وجدان جو مجھ پر طاری رہا ۔ اس کی وجہ سے تین مہینے میں میری کایا پلٹ گئی ۔ پھر جب میں نیچے اترا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی جنون طاری ہوا ۔ اس کا جنون ۔ مَیں نے جگہ جگہ خاک چھانی کہ اسے ڈھونڈ نکالوں ۔ لیکن بے سُود وہ نہ ملی ۔ اس کا پتہ بھی نہ مل سکا"۔

"پھر جب موسمِ سرما آیا تو مجھ پر ایک نئی وحشت سوار ہوگئی ۔ وہ نورانی غار مجھے اپنی طرف بلانے لگا ۔ مجھے ہر وقت اسی منظر کا خیال رہنے لگا ۔ وہی نور کی چادر ۔ وہی اطمینان وہی گہری خاموشی ۔ یہ وحشت اِس حد تک میرے سر پر سوار ہو گئی کہ میں پھر موسمِ سرما کاٹنے وہیں جا پہنچا ۔ اور اب میں ہر سال موسمِ سرما وہیں گزارتا ہوں" ۔

"اور وہ وہ" پتلا دُبلا نوجوان چلّایا ۔ "وہ پھر نہ ملی" ۔

"وہ" کھدّر پوش ہنسنے لگا "اس نورانی سویرے نے مجھے نکھار نکھار کر بذاتِ خود دیوتا بنا دیا اور دیوی کے نقوش میرے دل سے دھو ڈالے ۔ اور چھ سال میں مَیں نے اس راز کو پالیا کہ عورت مرد کی راہ میں محض ایک رکاوٹ ہے ۔

ایک پردہ ہے ایک ایسا پردہ ہے جسے ہٹائے بغیر ہم کہیں پہنچ نہیں سکتے ۔ مَیں نے شدّت سے محسوس کیا کہ زندگی رکاوٹوں کو عبور کرنے کا نام ہے ۔ آرزوؤں کا غلام بننے کا نہیں ۔ میری طرف دیکھئے" وہ چلّایا ۔ "سردی ہو یا گرمی میں صرف اس کھدّر کے کرتے میں رہتا ہوں اور یقین جانو میرے بدن میں اس قدر قوّتِ دفاع پیدا ہو چکی ہے کہ میں سانس لیتا ہوں تو مجھے لذّت محسوس ہوتی ہے ، ایسی لذّت جو عورت کے رنگین قرب سے بھی میّسر نہیں ہو سکتی ۔"

"لیکن وہ ـــ" پتلے دُبلے نوجوان نے پھر اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے کی کوشش کی ۔

وہ مسکرایا ۔ "جب میں اس کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا تو ایک روز شہر میں اتفاقاً وہ مجھے مل گئی ۔ اس کے ساتھ وہی نوکرانی تھی" ۔

"مل گئی !" مونچھوں والے نے بیٹھے ہوئے گلے سے دہرایا ۔ "واقعی"۔

"ہاں" ۔ وہ بولا ۔ "اس نے مجھے پہچان لیا ۔ میں نے ہنس کر کہا دیوی تم پھر نہ آئیں ۔ اس نے جھرجھری لی اور بولی اس مندر میں دیوی کی جگہ نہیں ہے ۔ میں نے ازراہِ شرارت کہا کہ پھر پُجاری ہی کو بُلا لیا ہوتا ۔ وہ پھر ہنسی لیکن جلد ہی گویا کسی اثر سے بھیگ کر کہنے لگی ۔ اِس مندر کا پجاری کسی کے بلائے سے نہیں آتا ۔ میں خود ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہوں ۔ اس کی آنکھیں اوپر کی طرف اٹھ گئیں اور ان میں اس وقت وہی دودھیا اجالا چمک رہا تھا" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ کہنے لگا ۔ "ہاں وہ میری گُرو تھی ۔ میرا پیر تھی ۔ میرا سبھی کچھ تھی ۔ اور جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وفات پا گئی ہے تو میں یہاں آئے بغیر نہ رہ سکا ۔ لیکن" اس نے مسکرا کر کہا ۔ "اب کی سردیوں میں وہ وہاں ضرور آئے گی ۔ اب وہ پردہ نہیں رہا ۔ پردے سے نکل چکی ہے ۔ وہ یقیناً ابھی تک اسی مندر کی پجارن ہے ۔ ابھی تک" ۔ وہ خاموش ہو گیا ۔

دفعتاً ہوٹل کا لڑکا چلّایا ۔ "بابوجی بادل چھٹ گئے ہیں ۔ اور بس آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں" ۔

اور اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے مونچھوں والے نے اچکن پوش بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "اور صاحب آپ کا کون عزیز فوت ہوا ہے ـــ" اور سب کی نگاہیں اچکن پوش کی طرف اٹھ گئیں ۔

وہ گھبرا گیا ۔ پھر اچکن جھاڑتے ہوئے کہنے لگا ۔ "میں تو کسی عورت کے لئے یہاں نہیں آیا میں تو تقریباً ہر روز ہی آتا ہوں یہاں ۔ جب سے میری بیوی فوت ہوئی ہے روز فاتحہ کے لئے آتا ہوں" ۔

"بیوی" پتلے دُبلے نوجوان نے دہرایا۔

"اتنی وفادار اور خدمت گزار بیوی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو" ۔ وہ بولا ۔ "حالانکہ میں بوڑھا تھا اور وہ نوجوان تھی ۔ لیکن سبحان اللہ ، وہ گویا صرف میری خدمت کرنے کے لئے جیتی تھی" ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ "جنّتی روح تھی جنّتی" بھرّائی ہوئی آواز میں اس نے کہا اور خاموش ہو گیا اور وہ چاروں ملحقہ قبرستان کی طرف چل پڑے ۔

بادل واقعی چھٹ گئے تھے ۔ سورج مغرب میں تانبے کے تھال کی طرح ٹنگا ہوا تھا ۔ اس کی سنہری شعاعوں میں بدلیاں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں ۔

"وقت بہت کم ہے" کھدّر پوش بولا ۔ "شہر کے لئے یہ آخری بس ہے" ۔

پتلے دُبلے نوجوان نے کہا ۔ "لیکن قبر پر دیا تو جلانا چاہئے کم از کم" ۔

"ہاں ۔ ہاں" مونچھ والا بولا ۔ اور وہ تینوں سفید قبر کی طرف لپکے ۔ اور جب تینوں نے بیک وقت ایک ہی تربت کے طاق کی طرف ہاتھ بڑھائے تو تینوں کے سر آپس میں ٹکرا گئے ۔

"ہائیں" وہ تینوں بہ یک وقت چلّائے اور انہوں نے ایک نئے مفہوم سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے اچکن پوش بزرگ کی آواز سنائی دی ۔ "میاں تم کدھر آنکلے ہو" ۔ وہ کہہ رہا تھا "مجھے اپنی بیوی کے مزار کا دیا تو جلا لینے دو" ۔

وہ سب تعجب سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگے ۔ پتلے دُبلے اضطرابی نوجوان نے کچھ کہنے کی کوشش کی ۔ لیکن کھدر پوش نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر زیرِ لب کہا "اونہوں' دوسروں کو ننگا نہ کرو ۔ ہمیں پردہ اپنی عقل سے اٹھانا ہے ۔ اپنی عقل سے" ۔

"کتنا رنگین پردہ ہے"۔ مونچھوں والے نے آہ بھری ۔

"کتنی بڑی رکاوٹ ہے"۔ کھدّرپوش نے کہا ۔

اچکن پوش انہماک سے دیا جلانے میں مصروف تھا ۔ اس کے گال آنسوؤں سے تر تھے ۔ سورج کی آخری شعاعوں نے بادلوں سے چھن کر فضا میں نُور کی دھاریاں سی بنا دی تھیں ۔ جیسے نور کا ایک مینار کھڑا ہو اور چاروں طرف دودھیا سویرا پھیلا تھا ۔

..........○..........

سکارلٹ روڈ

عالیہ کے صرف دو مشاغل تھے ۔ وہ ہنستی تھی اور وہ روتی تھی ۔ معصومیت اور حسن کے علاوہ اسکی شخصیت کے یہ دونوں ہی پہلو بے حد جاذب تھے ۔ وہ بظاہر بے وجہ ہنستی تھی اور پھر دفعتاً بظاہر بے وجہ بیٹھ کر رونے لگتی ۔ اس وقت اسکی آنکھیں گہری جھیلیں بن جاتیں گویا دو سوتے بہہ نکلتے ۔ ناک اور بھی ستواں ہو جاتی اور ہونٹ یوں متکلم ہو جاتے جیسے کتھا کلی کی کسی فنکار کے ہاتھ ہوں ۔ جن کی مدد سے وہ غم کا فسانہ کہہ رہی ہو ۔ جب وہ روتی تو گرد و پیش کی ہر چیز بھیگ جاتی ۔ پھر دفعتاً بادل چھٹ جاتے اور سورج نکل آتا اور عالیہ یوں ہنسنے لگتی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو ۔ اسکا ہنسنا اور رونا پہاڑ کے موسم کی طرح تھے جہاں دفعتاً بادل یوں برسنا شروع کر دیتے ہیں جیسے کبھی دھوپ نکلے گی ہی نہیں اور پھر دفعتاً یوں چھٹ جاتے ہیں جیسے کبھی برسے ہی نہ ہوں ، لیکن چاہے وہ ہنستی ہو یا روتی ہو ۔ ہر صورت میں وہ پیاری لگتی تھی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہنستے ہوئے وہ زیادہ پیاری لگتی تھی یا روتے ہوئے ۔

بوٹا سا قد ۔ موزوں اور ستواں ناک نقشہ ۔ کتابی چہرہ اسکی یہ خصوصیات معصومیت کے نیلے آسمان پر تاروں کی طرح چمکتی تھیں ۔ مگر اسکے باوجود معصومیت کی نیلاہٹ چھائے رہتی ۔ وہ خلوص سے بلا وجہ ہنستی اور خلوص سے بلا وجہ روتی تھی ۔

اس زمانے میں عالیہ عنفوانِ شباب میں تھی ۔ ابھی بیداری کی پہلی کرن تک نہیں پھوٹی تھی اور نہ ہی اسکی زندگی کا کوئی مقصد متعین ہوا تھا ۔ ابھی اسکی زندگی بلا وجہ حسین تھی ۔ سحر اس لئے سہانی تھی کہ وہ سحر تھی ۔ شام اس لئے خوبصورت تھی کہ وہ شام تھی ۔ شہر اسلئے پیارا تھا کہ وہ بسا ہوا تھا ۔ ویرانہ

اسلئے دلکش تھا کہ وہ پھیلا ہوا تھا اور سہیلیاں ۔۔۔ سہیلیاں تو عنفوانِ شباب میں عزیز ہوتی ہی ہیں ۔ عالیہ کی بھی سہیلیاں تھیں مثلاً فرحت تھی جوجی تھی اور پھر وہ اسمارہ تھی وہ فرحت ہی تھی نا جو اس روز اسے سیسل ہوٹل میں لے جانے کی ذمہ دار تھی ۔

عمر میں تو فرحت عالیہ کے برابر تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ پہلے ہی بیدار ہوگئی تھی ۔ یا شاید کر دی گئی ہو ۔ لیکن گویا اس نے بیدار ہونے کے بعد پھر سے آنکھیں موند لیں تھیں جیسے کچھ معلوم ہی نہ ہو ۔ مگر اسکا راز اسکی آنکھوں کے کونوں سے جھانکتا تھا ۔

اس روز گاف روڈ پر سیسل ہوٹل کے قریب ٹہلتے ہوئے دفعتاً وہ بولی ۔ "ہائے عالی سنا ہے یہاں ایک بڑا مشہور جوتشی ٹھہرا ہوا ہے ۔ سنا ہے بڑے پتے کی باتیں بتاتا ہے" ۔ یہ بات اس نے یوں برسبیلِ تذکرہ کہی ۔ جیسے وہ جان بوجھ کر سیسل ہوٹل کی طرف آئی ہی نہ ہو ۔

عالیہ اسکی بات سنکر چونک کر بولی ۔ "پر اس سے پوچھیں گے کیا"۔

"لو" ۔ فرحت بولی ۔ "وہاں کیا پوچھنا پڑتا ہے وہ تو آپ ہی آپ بتاتا ہے سب کچھ" ۔

"سچ" عالیہ کا شوق ابھر آیا ۔ "کیا بتاتا ہے ۔"

"مجھے کیا معلوم" فرحت بولی جیسے اسے واقعی معلوم نہ ہو "ہٹئے چلو تو" ۔

وہ بولی "میرے پاس دس کا نوٹ ہے ۔ چلو نا ۔"

ڈی ۔ میرا حقیقت میں جیجووال کا مہردین تھا جسے گاؤں کے لوگ مہرا کہہ کر بلایا کرتے تھے ۔ وہ ان ہونہار بچوں میں سے تھا جو کمیٹی کی لالٹینوں تلے پڑھ کر وظیفے حاصل کر لیتے ہیں ۔ مہرے نے بھی وظیفہ حاصل کیا تھا اور اکمل پور کے سکول میں نویں جماعت تک تعلیم پائی تھی ۔ پھر اسکا باپ فوت ہوگیا اور اسے مجبوراً پنڈت وشواناتھ کے ہاں نوکری کرنا پڑی ۔ پنڈت جی مشہور نجومی تھے ۔ چوری چوری انکی کتابیں پڑھ پڑھ کر ۔ زائچے دیکھ دیکھ کر اور باتیں سن سن کر مہرے نے علمِ نجوم میں کچھ دسترس حاصل کر لی تھی اور پھر تقسیم کے

بعد بمبئی سے آکر وہ مہردین سے ڈی ۔ میرا بن گیا ۔ اس نے سیسل ہوٹل میں دو کمرے کرایہ پر لے لئے اور نجوم کی پریکٹس شروع کر دی ۔

ممکن ہے کہ ڈی ۔ میرا کے علم کو ستاروں سے بھی تعلق ہو لیکن بسا اوقات وہ لوگوں کی قسمت کا حال انہیں کی پیشانی آنکھوں اور پلکوں سے بھانپ لیا کرتا تھا ۔ اسکے پاس زیادہ تر عورتیں آتی تھیں کبھی کبھار کالج کے لڑکے بھی آتے محض تفریح کیلئے انہیں تو مستقبل کی نسبت حال سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے ۔ لیکن عورتیں وہ تو حال سے بیگانہ رہتی ہیں اور زمانہ حال میں بھی مستقبل کے خوابوں کے سہارے جیتی ہیں ۔ لڑکیاں ڈی ۔ میرا کے پاس یوں اثر سے بھیگی ہوئی پہنچتیں جیسے اک ذرا چھیڑنے کی کسر باقی ہو ۔ انکی پلکیں خوابوں کے بوجھ سے جھکی ہوتیں جن کے تلے سیاہ پیالے چھلکے جاتے ۔ ڈی ۔ میرا انکی چھلکی ہوئی آنکھوں کے رنگ سے انکے زائچے کے نقوش تیار کیا کرتا اُن سے باتیں کیا کرتا اُن سے باتیں کرتے ہوئے اسے اپنے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا تھا ۔ اسکے ہاتھوں میں وہ کمہار کے چکر کی مٹی کی طرح ہوتی تھیں ۔ البتہ مٹیار عورتوں کے روبرو وہ مشکل میں پڑ جاتا ۔ کیونکہ اثر سے بھیگے ہونے کی بجائے انکی آنکھیں اثر ڈالنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی تھیں ۔

بہر صورت ممکن ہے کہ ڈی ۔ میرا کے علم کو ستاوروں سے بھی تعلق ہو ۔ لیکن اسے یہ قطعی طور پر احساس نہ تھا کہ نجومی کی زبان سے نکلی ہوئی بات نوجوان لڑکیوں پر کس حد تک اثر رکھ سکتی ہے ۔ ورنہ عالیہ کا مستقبل بتاتے ہوئے وہ اسمیں وہ ڈرامائی تفصیل ٹانکنے سے گریز کرتا ۔

ڈی میرا نے اپنا معمل ملاقاتی کمرے سے الگ بنا رکھا تھا تا کہ کسی کے مستقبل کی بات مشتہر نہ ہو ۔ اصولی طور پر وہ معمل میں صرف متعلقہ فرد کو بلاتا تھا ۔ فرحت کو اس تفصیل کا علم تھا ۔ ورنہ شاید وہ عالی کو ساتھ لیکر نہ جاتی ۔

معمل میں ڈی ۔ میرا کے دو ایک رسمی سوالات کے جواب دینے کے بعد جب ڈی ۔ میرا کاغذ کے ٹکڑے پر آڑے ترچھے خطوط کھینچنے میں مشغول تھا ۔۔۔ عالی خالی الذہن بیٹھی کمرے کے عجیب و غریب سامان کی طرف غور

سے دیکھ رہی تھی ۔ اسکا دل دھک دھک کر رہا تھا اور جی چاہتا تھا کہ جلد وھاں سے مخلصی پاکر بھاگ جائے ۔ دفعتاً ڈی میرا نے سر اٹھایا ۔ "آپ کیا جاننا چاہتی ہیں" ۔ وہ بولا ۔ "میں ۔ میں" وہ گھبرا گئی ۔ "میں تو یعنی ـــ" ڈی میرا کے ہونٹوں پر عجیب سا تبسم کھیلنے لگا ۔ "میرا مطلب ہے" وہ بولا ۔ "کوئی ایسی بات جسکے بارے میں آپ جاننا چاہتی ہوں ۔"

"خاص بات" عالی نے دہرایا ۔ "کون سی خاص بات"

وہ ہنس پڑا ۔ خیر اس نے ضبط کر کے پھر کاروباری لہجہ اختیار کر لیا ۔

"آپ کی شادی کا آپ کی مرضی کے مطابق ہونا حساب میں پایا جاتا ہے" وہ زائچے کی طرف دیکھ کر بولا ۔

عالی کا چہرہ گلابی ہوگیا ۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں ۔

"حساب کے مطابق آپ اسکی پہلی محبت ہونگی" ۔ میرا نے کہا "وہ قبول صورت ہو گا ۔ حساب کے مطابق اسکی شکل ایسی ہوگی ۔ جیسے عورتیں پسند کرتی ہیں ۔ مثلاً جیسے فوجی افسر ہوتے ہیں ۔

عالی کی کنپٹیاں تھرک رہی تھیں ۔ آنکھیں ان جانے خمار سے لبریز محسوس ہو رہی تھیں ۔ گرد و پیش دھندلائے جا رہے تھے ۔

"لیکن" میرا نے کہا "اگر میرا وچار غلط نہیں تو وہ صرف آپ کا ہو کر جئے گا صرف آپ کا کیونکہ آپ کا ستارہ بہت روشن ہے ۔ محبت میں آپ کا بہت خوش قسمت ہونا حساب میں پایا جاتا ہے" ۔ عالیہ نے محسوس کیا گویا ایک ہوائی سی اسکے بدن میں چھوٹ گئی ہو پھر اسے معلوم نہیں ۔ نہ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا ۔ ستاروں کے برجوں میں داخل ہونے اور نکلنے کی بات ۔ خوش قسمتی اور بد قسمتی کی تاریخوں کے متعلق تفصیلات ۔ سفر کی بات ۔ احتیاطوں کی بات ۔ دولت کی بات ۔ پھر دفعتاً وہ خاموش ہوگیا ۔

وہ چونک پڑی ۔ وہ خلا جس میں وہ کھوئی ہوئی تھی ۔ سمٹ کر ناپید ہوگیا تھا ۔ کمرے کی چیزیں اس سنہرے دھندلکے سے نکل کر پھر سے تناسب میں آ چکی تھیں ۔ وہ اٹھ بیٹھی ۔ "ایک بات ہے" ۔ ڈی ۔ میرا نے ہچکچاہٹ بھرے انداز سے کہا ۔ وہ رک گئی ۔ اسکی ہچکچاہٹ کی وجہ سے گویا وہ بالکل بیدار ہو

گئی ۔

"میرا مطلب ہے" وہ ایک ساعت کے لئے گھبرایا لیکن پھر کاروباری انداز سے بولا ۔ "اگر آپ کا ستارہ زحل برج میں پھنس گیا جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے تو شادی کے دو سال کے اندر اندر دونوں کا علیحدہ ہونا عمل میں آ سکتا ہے ۔ میرا مطلب ہے اسکی بے وفائی کی وجہ سے نہیں" ۔ میرا نے گویا اسے تسلی دینے کے لئے کہا ۔ "ممکن ہے کہ کوئی حادثہ ہو یا زندگی وفا نہ کرے ۔ یا پھر سینکڑوں باتیں ہو سکتی ہیں" ۔

گھر کی طرف واپس جاتے ہوئے عالیہ اور فرحت دونوں خاموش تھیں ۔ اگرچہ دونوں کی خاموشی کی نوعیت ایک ہی تھی لیکن دونوں کے خیالات یکسر مختلف تھے ۔ عالی کی نگاہوں کے سامنے فوجی وردی میں ملبوس ایک اونچا لمبا حسین نوجوان کھڑا تھا ۔ وہ اسکی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا ۔ پھر دفعتاً ایک شور ـــ کے درمیان وہ گرا پڑا تھا ۔ چاروں طرف لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا اور پھر خون ۔ سرخ خون کی دھاریاں ـــ

کیپٹن نین کی شخصیت کی دلکشی زیادہ تر اسکی مسکراتی آنکھوں میں مضمر تھی ۔ اسکی مسکراہٹ میں بلا کی کشش تھی لیکن ساتھ ہی اسمیں اجتناب کی جھلک بھی تھی ۔ وہ دوسرے کو اپنی جانب کھینچے جاتا اور خود گویا ایک بے نیازی سے پیچھے ہٹ جاتا ۔ اسکا قد اونچا لمبا تھا لیکن پیشانی پر خلوص کا ایسا ہار سا بنا ہوا تھا کہ آپ محسوس کرتے تھے جیسے وہ آپ کے بے حد قریب ہو ۔ آپکے برابر کا ساتھی ہو جیسے اسکا اونچا لمبا قد درمیان میں حائل نہ ہو ۔

وہ پیدائشی طور پر سپاہی تھا ۔ بچپن ہی سے اُسے سپاہیوں کی طرح مارچ کرنے اور سلیوٹ مارنے کا شوق تھا ۔ دسویں جماعت میں "تھری مسکیٹرز" کا مطالعہ کرنے کے بعد اسکے ذہن پر "ڈارٹگنین" کا کردار اس قدر چھا گیا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے اپنے آپ کو "ڈارٹگنین" سمجھنے لگا تھا ۔ فرق صرف یہ تھا کہ اسکے پیش نظر کوئی ایسی حسینہ نہ تھی جسے اسے بدمعاشوں کی حراست سے بچانا ہوتا ۔ گھر والے اسے "نین" کہہ کر پکارتے تھے ۔ "ذوالقرنین" اتنا لمبا نام کون لے ۔

اس سے اسے اپنے آپ کو "ڈارٹگنین" سمجھنے میں اور بھی آسانی ہو گئی تھی ۔ پھر اسکے دو بڑے بھائی تھے مضبوط اور قوی ہیکل قسم کے جوان ۔ لہٰذا وہ ایتھاس پور تھاس تھے اور اسے ان سے بے حد محبت اور عقیدت تھی اور وہ ہر وقت انکے احکامات کا منتظر رہتا تھا ۔

فوج میں کمیشن ملنے کے بعد اسکی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اسے توپ خانے میں متعین کیا جائے ۔ صرف اس لئے کہ توپ خانے کے افسروں کی وردی نہایت خوبصورت ہوتی ہے ۔

شام کے وقت لان میں بیٹھے ہوئے عالی کے والد نے بلند قہقہہ لگایا ۔ اگرچہ وہ قہقہہ کچھ زیادہ ہی بلند تھا پھر بھی ملحقہ گراؤنڈ میں عالی اور فرحت انکی طرف متوجہ ہوئے بغیر بیڈمنٹن کھیلنے میں مصروف رہیں ۔ کیونکہ عالی کے والد ۔ والد ہونے کے باوجود بے تحاشہ قہقہے لگانے ۔ کھلی کھلی باتیں کرنے ۔ تیوری چڑھائے بغیر گھر میں داخل ہونے اور یہاں تک کہ بچوں کا ساتھی بن کر ان کے ساتھ کھیلنے کے عادی تھے ۔ انکی نفسیّت مستند باپ سے قطعاً مختلف تھی ۔

"ارے" وہ بچوں کی طرح تالی بجا کر چلّائے ۔ "بھئی حد ہو گئی ۔ بیگم ذرا سنئے انکی بات ۔ بیگم ۔ بیگم" وہ چلّانے لگے ۔ وہ ہر بات پر بیگم کو بلانے کے عادی تھے ۔ بیگم کو بات بتائے بغیر انکی بات نہ بنتی تھی ۔

"سنئے بیگم کیپٹن کیا کہہ رہے ہیں ۔ ہاہاہا" ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسے ۔ "کہتے ہیں شادی نہیں کرینگے ۔ کبھی نہیں ۔ کیونکہ پامسٹ نے انکا ہاتھ دیکھ کر بتایا ہے کہ شادی کے بعد دو سال کے اندر ایکسی ڈنٹ ہو گا ۔ جان کا خطرہ ہے ۔ ہاہاہا کہتے ہیں نہ شادی کروائیں گے نہ ایکسیڈنٹ ہو گا ۔ لہٰذا خطرے کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا"

"شادی کے بعد دو سال کے اندر اندر ایکسی ڈنٹ ہو گا" ۔ عالی نے مڑ کر دیکھا ۔ فوجی وردی میں ملبوس لمبا کپتان مسکرا رہا تھا ۔ ایک ہوائی سی چھوٹ گئی ۔ گردوپیش پر دھندلکا سا چھا گیا ۔ اس دھندلکے میں اونچے لمبے قد پر ایک مسکراہٹ روشن تھی اور گہری شربتی آنکھیں تمام دنیا کو جذب کیے جا رہی تھیں ۔

عالیہ بھاگی ۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور پھوٹ کر رونے لگی ۔

گھر والے حیران تھے ۔ عالی کو کیا ہوا ۔ اگرچہ پہلے بھی وہ رویا کرتی تھی لیکن اس دن کے بعد تو وہ کئی کئی بار رونے لگی اور وہ رونا بھی کس قدر شدت کا حامل تھا ۔ ماں نے کئی بار پوچھا ۔ ابا نے پوچھا ۔ بار بار پوچھا ۔ بات کیا ہے ۔ مگر اسے تو خود بھی معلوم نہ تھا کہ بات ہے کیا ۔ بیٹھے بیٹھے اسکے سامنے اونچے لمبے قد پر ایک مسکراہٹ روشن ہو جاتی اور کوئی چپکے سے اس سے کہتا شادی کے دو سال بعد ۔ اسکا دل بھر آتا اور خوامخواہ آنکھوں سے آنسو برسنے لگتے ۔ اب وہ کیا بتاتی انہیں ۔ پھر دفعتاً وہ سیلاب تھم جاتا ۔ دھلی دھلائی آنکھیں کٹورہ سی کھل جاتیں اور وہ مسکرا کر اُٹھ بیٹھتی اور پھر ہنسنے لگتی ۔ ہنسے چلی جاتی جیسے کوئی انمول خزانہ مل گیا ہو ۔

کیپٹن نین پہلے بھی کبھی کبھار انکے ہاں آیا کرتا تھا لیکن عالی نے کبھی اس کی طرف توجہ نہ کی تھی ۔ شاید اس لئے کہ وہ اسقدر خوبصورت اور اسقدر اونچا لمبا تھا کہ اسکی اُمید دل میں رچاتے ہوئے ڈر لگتا تھا ۔ اسکی وجہ کچھ بھی ہو عالی کے لئے تو وہ ابا کے ایک دوست تھے اور اس روز اگر وہ ڈی ۔ میرا سے نہ ملی ہوتی یا اسکے بابا پامسٹ کی پیشنگوئی کا ذکر نہ کرتے تو شاید وہ ہمیشہ کے لئے ابا کے دوست ہی رہتے ۔ لیکن اب تو بات ہی اور تھی ۔ اب وہ سمجھتی تھی کہ کیپٹن نین صرف اسکے لئے وہاں آتے تھے ۔ اسکے لئے مسکراتے تھے صرف اسکے لئے جیتے تھے ۔ جینے کا خیال آتے ہی دفعتاً اسکے دل کو ٹھیس لگتی اور نہ جانے کہاں سے ایک طوفان اٹھتا اور وہ دیوانہ وار اپنے کمرے کی طرف بھاگتی ۔

اسکے باوجود جب بھی کیپٹن نین وہاں آتے تو اسمیں آنکھ اٹھا کر انہیں دیکھنے تک کی ہمت نہ پڑتی ۔ الٹا ایک بے نام اثر کے تحت وہ خود مسحور سی ہو کر رہ جاتی تھی ۔ جیسے کسی پنچھی کے پر بھیگ گئے ہوں ۔

فطرتاً عالیہ اثر ڈالنے والی لڑکی نہ تھی ۔ الٹا وہ تو اثر قبول کرنے والی تھی اس لئے اس نے کبھی بڑھ کر کیپٹن نین سے آنکھیں ملا کر اسے ٹٹولنے کی کوشش نہ کی

تھی ۔ یہ بات نین کے لئے انوکھی سی تھی ۔ کیونکہ ہر عورت اسکے ساتھ آنکھیں
لڑانے کی مشتاق تھی ۔ ہر عورت اسے جانچنے کی کوشش کرتی تھی ۔ اسپر اثر
ڈالنے کی سعی کرتی تھی ۔ اسے وہ رنگین تتلیاں بے حد پسند تھیں ۔ جو اسکے
سامنے اپنے پر پھڑپھڑایا کرتی تھیں ۔ اپنی رنگینی اور اڑان کا مظاہرہ کرتی تھیں ۔
لیکن وہ اسے صرف پسند تھیں ۔ وہ ان سے اثر قبول نہ کرتا تھا ۔ انہیں دیکھ
کر اسکی مسکراہٹ اور رنگین ہو جاتی اور آنکھوں کی شربتی جاذبیت اور گاڑھی ہو
جاتی لیکن ساتھ ہی اجتناب کی وہ جھلک بھی نمایاں ہو جاتی تھی ۔ اثر ڈالنے کی
بجائے اسے اثر سے بھیگنے والی لڑکیاں زیادہ محبوب تھیں ۔ شاید اس لئے کہ نین
مغربی ساخت کا ایسا ساغر تھا جس میں مشرقی شراب بھری ہوئی تھی ۔

عالیہ کے اثر سے بھیگ جانے کی وجہ سے نین کو اسکے وجود کا احساس ہونے
لگا اور جلد ہی یہ احساس اسقدر شدت اختیار کر گیا کہ اسکا تبسم مخصوص اور اسکی
نگاہیں متلاشی ہو کر رہ گئیں ۔ اسکی آنکھیں اس خواہش کو جذب نہ کر سکیں اور
چھلک پڑیں ۔ پھر نین اسے تلاش کرنے میں سرگرداں ہو گیا اور روز بلا ناغہ عالی
کے گھر آتا اور ملاقاتی کمرے میں بیٹھ کر اسکا انتظار کرنے کی بجائے براہ راست
عالیہ کی جستجو میں گھر میں چاروں طرف گھومتا پھرتا ۔ پھر ایک روز بات اسکے
ہونٹوں تک آ گئی ۔ "عالی" بغیر کسی تمہید کے وہ بولا "مجھ سے شادی کرو گی"۔
عالیہ کا رنگ فق ہو گیا ۔ اس نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی ۔
ڈاکٹر نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہسٹریا ہے ۔

اگلے روز نین آیا تو وہ صوفے پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی ۔ دیر تک وہ اسکے
پاس چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ پھر جب اس نے کہنے کے لئے منہ کھولا تو پہلی مرتبہ
عالی نے بڑھ کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی "اونہوں ایسا نہ کہیئے"۔ وہ بولی
"کیوں" وہ مسکرا دیا۔

"بس کہہ جو دیا"۔ وہ آنکھیں جھپکا کر بولی ۔ اسکی جھکی جھکی آنکھیں خود
اپنی بات جھٹلا رہی تھیں ۔

"اوہ" وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور پھر سنجیدگی سے بولا "عالی تمہارے ساتھ دو

سال کے ساتھ کے لئے میں بخوشی اپنی زندگی قربان کر سکتا ہوں"۔
زندگی قربان کر سکتا ہوں ! زندگی قربان کر سکتا ہوں ! عالیہ کے جسم کے
روئیں روئیں میں ایک لہر دوڑ گئی ۔ فضا پر ایک دھندلکا نشہ بن کر چھا گیا ۔ ایک
عورت کے لئے اس سے زیادہ کیف آور بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک خوبرو
جوان اس کے لئے اپنی زندگی قربان کرنے کو تیار ہو جائے ۔

شادی کے بعد وہ نشہ عالیہ کی روح کی گہرائیوں سے نکل کر جسم کے انگ
انگ میں رچ گیا اور اسکے اعضا گویا کیفیت سے سرشار ہو گئے ۔ جب بھی وہ اکیلے
میں بیٹھتے ۔ عالیہ دیوانہ وار نین کی طرف دیکھتی اور پھر اسکی آنکھیں بھر آتیں اور
نین قہقہے مار کر اسکے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارنے لگتا ۔ "پھر وہی بات"۔
وہ کہتا "فضول وہم" پھر دفعتاً وہ سنجیدہ ہو جاتا "تمہارے لیے میں کیا نہیں دے
سکتا ۔ عالی زندگی تو ایک معمولی چیز ہے ۔ یہ جملہ سن کر عالیہ پر پھر وہی نشہ کی
سی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ وہی ریشمی دھندلکا چاروں طرف سے اسے لپیٹ
لیتا ۔ اسے اس دھندلکے سے خوف آتا تھا لیکن ساتھ ہی عجیب سی لذت محسوس
ہوتی ۔ چوری چوری اسکا دل چاہتا کہ اسکے کان نین کی زبان سے پھر وہی فقرا
سنیں ۔ وہی دھندلکا اسے اپنی آغوش میں لے لے اور وہی نشیلی کیفیت اسکے
انگ انگ سے چھلکے ۔

شادی کے بعد عالیہ کا ہنسنا اور رونا بھی شدت اختیار کر گئے ۔ سارا دن وہ
دونوں بچوں کی طرح ہنستے لیکن ہنستے ہنستے دفعتاً عالیہ ٹکٹکی باندھ کر اسکی طرف دیکھنے
لگتی پھر وہی بات وہی جذباتی تناؤ ۔ وہی گہری شدید لذت ۔

جلد ہی عالی کے لئے وہ جملہ ایسا ہی ضروری ہو گیا جیسا کہ سر درد کے مریض
کیلئے اسپرین کی ٹکیا وہ نشیلی کیفیت پیدا کرنے کیلئے اسے تگ و دو کرنے کی
ضرورت نہ تھی آنسوؤں سے چھلکتی ہوئی آنکھیں اور بس اس طرح ڈیڑھ سال گزر
گیا ۔

لیکن ڈیڑھ سال کے بعد حالات نے یکا یک پلٹا کھایا ۔ کیپٹن نین کو محاذ
پر جانے کا حکم مل گیا ۔ عالیہ نے جو سنا تو سر پیٹ لیا ۔ اسے ہسٹریا کے

دورے پڑنے لگے ۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ مریضہ سے ہمدردی جتانے سے احتراز کیا جائے ۔ اس لئے عالیہ اپنے کمرے میں پڑی روتی رہی اور نین تیاری میں مصروف رہا ۔

رخصت کے وقت عالیہ یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بھیڑ اپنے ریوڑ سے جدا ہوگئی ہو ۔ نین اسکی ڈھارس بندھانے کیلئے قہقہے لگا رہا تھا ۔ "پھر وہی بات" ۔ وہ چلّا رہا تھا ۔ "فضول وہم پگلی تم سمجھتی ہو میں لوٹ کر نہیں آؤں گا ۔ ہاہاہا ! لو سن لو میں آؤں گا عالی ۔ ایسے نہیں بلکہ یہاں ستاروں کی جگہ سٹرپیس لگی ہونگی ۔ ہاتھوں میں فتح کا جھنڈا لہراتا ہوا گیت گاتا ہوا دیکھ لینا تم ۔ اور دو اکتوبر کو ہماری شادی ہوئے پورے دو سال ہو جائیں گے نا ۔ دو اکتوبر کو تمہیں میرا پیغام ملے گا ۔ تمہارا نین بالکل خیریت سے ہے ۔ ایسے"۔ اس نے اسے اکڑ کر سلیوٹ مارا اور پھر مارچ پاسٹ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا ۔

عالیہ حیران بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ۔ صبح سویرے سے دوپہر ہوگئی ۔ دوپہر سے شام ۔ حتی کہ چراغ روشن ہو گئے ۔ لیکن وہ جوں کی توں بیٹھی رہی ۔

نین کے جانے کے بعد عالیہ کی دنیا ویران ہوگئی ۔ وہ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہتی ۔ اسکے سامنے کرسی پر وہ آ بیٹھتا ۔ وہی روشن مسکراہٹ شریر نگاہیں ، عالی میں تمہارے لئے کیا نہیں دے سکتا۔ ہاہاہا اسکے جسم میں وہی رنگین جھرجھری پیدا ہوتی وہی تناؤ وہی دھندلکا اسے گھیر لیتا لیکن یہ کیفیت روز بروز اپنی شدت کھوئے جا رہی تھی ۔

پھر ایک روز عالی میں تمہارے لئے کیا نہیں دے سکتا ہاہاہا ۔ اس فقرے کو سن کر اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ اسکا تمسخر اڑا رہا ہو ۔ دفعتاً نین اٹھ بیٹھا ۔ میں لوٹ کر آؤں گا ۔ وہ بولا ۔ دو اکتوبر کو تمہیں میرا پیغام ملے گا تمہارا نین خیریت سے ہے خیریت سے ہاہاہا ۔ وہ قہقہے لگاتا ہوا مارچ پاسٹ کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ تنہا رہ گئی ۔ ویران اور تنہا ۔ خیریت سے ہے ۔ خیریت سے ۔ عالیہ پر اس جملے کا نیا مفہوم واضح ہونے لگا ۔ یکسر وہ

دھندلکا ختم ہوگیا ۔ مایوسی نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا ۔ مایوسی ویرانی تنہائی ۔

اس تنہائی اور ویرانی سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے وہ باہر نکل گئی اور لوگوں سے میل ملاپ میں تسکین ڈھونڈنے لگی ۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ زندگی کا دامن اسکے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا ہے لیکن لوگوں سے میل ملاپ بھی اسے تسکین نہ دے سکا ۔ وہ مایوس ہو کر تھک گئی ۔

ایک رات جب عالم مایوسی میں وہ اکیلی ڈرائینگ روم میں بیٹھی تھی تو دروازے پر دستک ہوئی ۔ "اِسوقت" اس نے سوچا ۔ "آ جائیے" ۔ وہ بولی اور ہارون اندر آ گیا ۔

ہارون کیپٹن نین کا دوست تھا ۔ وہ ایک مالدار تاجر تھا اور سکارلٹ روڈ پر اسکی ایک شاندار کوٹھی تھی ۔ شادی کے بعد وہ چار ایک مرتبہ انکے ہاں آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں عالیہ اسے دیکھکر خوف محسوس کرتی تھی ۔ اسکی نگاہوں سے وحشت برستی تھی اور اسکا انداز بے حد بے باک تھا ۔

"آپ ۔۔۔" اس نے حیرانی سے ہارون کی طرف دیکھا ۔

"ہاں" وہ بولا "میں ہندوستان گیا ہوا تھا ۔ آج ہی لوٹا ہوں ۔ کاروبار کے سلسلے میں گیا تھا ۔ صرف دو ماہ کیلئے ۔ لیکن پانچ ماہ رکا رہا ۔ مجبوری ۔۔۔" وہ بیٹھ گیا ۔

"وہ تو یہاں نہیں ۔ انہیں گئے ہوئے تو چار مہینے ہو گئے" ۔ عالیہ اسے بیٹھتے دیکھکر گھبرا گئی ۔

"مجھے معلوم ہے" وہ بولا ۔ "خیال تھا نین کے جانے سے پہلے اسے ملوں گا مجھے وہاں اسکے جانے کی خبر مل گئی تھی ۔ لیکن کاروباری مجبوری" ۔

"اوہ" عالیہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی ۔ چند منٹ وہ دونوں خاموش رہے ۔ عالیہ نے محسوس کیا ۔ جیسے وہ خاموشی ایک بوجھ ہو ۔ جس کے تلے اسکا دم گھٹ رہا ہو ۔ کیا وقت ہو گا" عالیہ کچھ کہنے کی غرض سے بولی ۔

"میں تمہاری بات سمجھتا ہوں"۔ ہارون نے کہا "لیکن یہاں میں ایک خاص مقصد کیلئے آیا ہوں"۔

"خاص مقصد کیلئے ۔۔۔" وہ گھبرا گئی۔

"ہاں مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"۔ وہ بولا۔

"کہیئے"۔

"مجھے اسکی پرواہ نہیں کہ تم کیا کروگی ۔۔ اب نہیں" وہ بولا۔ دفعتاً اسکی بھونڈی آواز میں ایک خوفناک عنصر پیدا ہوگیا۔ "میں نے بارہا تم سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ہمیشہ ناکام رہا"۔

ہارون نے کہا۔ "تم کیپٹن نین میں اسقدر کھوئی ہوئی تھیں کہ میرے واضح اشارے بھی تم نے نظر انداز کر دیئے"۔ عالیہ کے جسم پر ایک عجیب سی کپکپی طاری ہوگئی۔

"مجھے افسوس ہے"۔ وہ بولا "کہ جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تو تمہاری شادی ہو چکی تھی۔ ورنہ ۔۔۔۔۔۔۔" وہ خاموش رہا

عالیہ کی نگاہ دھندلا گئی وہ گھٹن اور بھی شدت اختیار کر گئی۔ "افسوس ہے" وہ بولا "کہ نین میرا دوست ہے ورنہ ابتک وہ ۔۔۔" عالیہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"میں تمہیں پانے کیلئے کیا نہیں کر سکتا عالی"۔ ہارون بولا۔ "قتل کر سکتا ہوں اور یاد رکھو ۔۔۔" وہ اٹھ بیٹھا "اگر میں تمہیں حاصل کرنے میں ناکام رہا تو اپنی زندگی ختم کر دونگا۔ میری طرف دیکھو عالیہ۔ یہ دھمکی نہیں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور ہارون آجتک قدم بڑھا کر پیچھے نہیں ہٹا"۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک کھولتے ہوئے خونیں خلا میں ڈوبے جا رہی تھی۔ ٹھک دروازہ بند ہوگیا۔ خون کا ایک فوارہ چھوٹا۔ اسکے کپڑے شرابور ہو گئے۔ وہ شب خوابی کے کمرے کی طرف بھاگی اور چارپائی پر گر پڑی۔ لیکن سامنے کرسی پر وہ بیٹھا تھا۔ وہی

خونخوار انداز اس نے آنکھیں ہٹا لیں۔ "میری طرف دیکھو" وہ بولا۔ "میں قتل بھی کر سکتا ہوں۔ ورنہ اپنی زندگی ختم کر لونگا"۔ پھر وہی فوارہ وہی لذت وہی تناؤ ۔۔ اور ہسٹریا کا دورہ۔

اس روز کے بعد بیٹھے بٹھائے عالیہ کو خیال آتا توبہ کس قدر خونخوار آدمی ہے۔ قتل کر دونگا۔ "ہونہہ"۔ غصے سے وہ بھوت بن جاتی اور پھر وہ غصہ گویا خون کے فوارے میں تبدیل ہو جاتا اور وہ شرابور ہو جاتی۔ دو اور تین اکتوبر کے دن وہ بے حد مضطرب رہی۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ ہر آہٹ پر وہ چونک پڑتی۔ تار تو نہیں آیا۔ وہ اپنی خادمہ سے پوچھتی۔ "جا دیکھ تو۔ جا" آخر چار تاریخ کو شام کے وقت نین کا تار موصول ہوا۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے تار کھولا۔ لکھا تھا۔ میں خیریت سے ہوں۔ نین۔"

تار پڑھتے ہی اسپر مردنی سی چھا گئی۔ اس نے بڑھ کر کرسی کا سہارا لیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ جیسے کسی حادثے کی خبر موصول ہوئی ہو۔ پھر وہ لیٹ گئی اور تنہائی اور مایوسی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اگلے روز اسکے خیالات ایک نئی رَو میں بہہ رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو۔ اگرچہ وہ خوشی محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسکی کوشش کا اثر متضاد تھا۔ اس پر مایوسی چھائی جا رہی تھی۔ غم حاوی ہوئے جا رہا تھا جیسے اس نے سب کچھ کھو دیا ہو۔ جیسے نین کو اس سے قطعی محبت نہ ہو۔ جیسے وہ وعدہ ۔۔۔ کہ میں تمہارے لئے کیا نہیں دے سکتا۔ محض ایک فریب ہو۔

وہ دیوانہ وار اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔ سوچ رہی تھی۔ گویا ڈوبنے سے بچنے کے لیے تنکے تلاش کر رہی ہو۔ دفعتاً اس کی نگاہوں کے سامنے ایک خوفناک چہرہ آ کھڑا ہوا۔ "ہاں میں قتل بھی کر سکتا ہوں"۔ کسی نے بھدّی آواز میں کہا۔ وہ رک گئی "اور یاد رکھو"۔ وہ بولا ۔۔ ہارون نے انگلی دبائی ۔۔۔ ڈز ۔۔۔ ایک خوفناک آواز آئی۔ خونیں فوارہ چھوٹ پڑا۔

"ٹیکسی آپ نے منگوائی ہے کیا"۔ خادمہ نے آکر عالیہ سے پوچھا۔

"ہاں" عالیہ نے جواب دیا ۔

کہیں جا رہی ہیں آپ ؟"

"ہاں" وہ بولی ۔

"اکیلی جائینگی" ۔

"ہوں" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا ۔

"بازار جانا ہے کیا" خادمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں" وہ بولی ۔

"آپ نے تو ناشتہ بھی نہیں کیا ابھی" ۔

"ہاں" اس نے جواب دیا ۔ اور باہر کیطرف چل پڑی ۔

"کھانا کس وقت کھائیں گی آپ "خادمہ نے پوچھا ۔

"کھانا" وہ چونکی ۔ "پتہ نہیں" ۔

وہ موٹر میں بیٹھ گئی "تم اندر چلو" ۔ اس نے خادمہ سے کہا ۔

"کہاں بیگم صاحب" ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا ۔

ایک ساعت کیلئے وہ ہچکچائی پھر ۔۔۔۔ مدھم اور بھیانک آواز میں بولی ۔

"سکارلٹ روڈ ہاں سکارلٹ روڈ" ۔

..........○..........

نیلی رگ

اسوقت شام کے پانچ یا چھ ہونگے ۔ میں ، صفیہ ، ارجمند اور ثریا انگیٹھی کے گرد خاموش بیٹھے تھے ۔ باہر شفق کیوجہ سے مطلع سُرخی آلود ہو رہا تھا ۔ کیونکہ سرخ بادلوں کا عکس زمین پر بچھی ہوئی برف پر پڑ رہا تھا ۔ نیچے سواں کی وادی میں اندھیرا چھا چکا تھا ۔ اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف بڑھتا آ رہا تھا ۔ وادی میں ڈھلانوں پر بنے ہوئے مٹی کے گھروندوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغ یوں دکھائی دے رہے تھے ۔ جیسے سسکیاں بھر رہے ہوں ۔ کتنی اداس تھی وہ شام !

وہ ٹیلا چاروں طرف سے برف سے ڈھکا ہوا تھا ۔ جس پر وہ مختصر سا ہوٹل "وی اوکس" واقع تھا ۔ اسوقت اس ہوٹل میں چند ایک لوگ مقیم تھے ۔ غالباً ہماری طرح سب برف کا منظر دیکھنے کیلئے مری آئے ہوئے تھے ۔ نمبر ۳۲ میں میں ، ثریا اور ارجمند بیگم مقیم تھیں ۔ نمبر ۱۶ میں مسٹر حیدر اور اُنکی بیگم تھیں ۔ انکے ساتھ والے کمرے میں وہ نووارد جوڑا تھا جو اسی روز وہاں آکر ٹھہرا تھا ۔ اور جس سے ابھی تک ہماری ملاقات بھی نہ ہوئی تھی اور مغربی کونے کے کمرے میں ایک بوڑھا تھا ، اسے آئے صرف چند ایک گھنٹے ہوئے تھے ۔

ہم تینوں چپ چاپ بیٹھی تھیں ۔ ثریا کی آنکھیں حسب معمول خواب آلود تھیں ۔ اسکی تو عادت ہے ۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے خواب دیکھتی رہتی ہے ۔ اسکی موٹی سیاہ آنکھیں گویا بنی ہی خواب دیکھنے کے لئے ہیں ۔ وہ تو حقیقت کو بھی خواب کے سانچے میں ڈھال کر دیکھنے کی عادی ہے ۔

ان دنوں وہ حقیقت جسے وہ خواب کے سانچے میں ڈھال کر دیکھ رہی تھی ۔ مسٹر ریاض تھے ۔ مسٹر ریاض ایک تاجر تھے ۔ دو اور دو چار قسم کے تاجر ۔ پھر وہ پیاری بیگم ارجمند تھی جسے میں صفیہ کہکر پکارتی تھی اُسے ماضی

سے عشق تھا اور مستقبل کا ڈر اور حال کو تو وہ کوئی اہمیت ہی نہ دیتی تھی ۔ صفیہ مستقبل کے متعلق ایک نہ ایک شکایت پالتو کتے کی طرح پالے رکھتی تھی ۔ ان دنوں اسکی پالتو شکایت یہ تھی ۔ "ہائے ! کہیں میرا پیٹ نہ بڑھ جائے" ۔ میں نے اسے بارہا سمجھایا تھا ۔ بنّو کل کی مصیبت پر آج ہی آنسو بہانے سے فائدہ اور پھر وہ بھی محض خیالی جس کا کوئی وجود نہیں ۔ امکان نہیں ۔ لیکن کوئی نہ سمجھنے پر مصر ہو تو ـــ وہ عادت سے مجبور ہے ۔ پہلے تو موہوم خطرے پر روتی رہتی اور پھر جب وہ ظہور میں نہ آتا تو اس بات پر ہاتھ ملتی ۔ "ہائے ! میں نے اتنی دیر خوامخواہ فکر کیا ۔ اب کیا ہو گا ؟ نجمہ میری صحت پر اثر تو نہ پڑے گا اسکا" ؟ اس لحاظ سے بیگم ارجمند ایک مصیبت تھی لیکن اسے مجھ سے کتنی محبت تھی ۔ جان چھڑکتی تھی مجھ پر ۔ ان دونوں کی موجودگی نے شام کو اور بھی اداس کر رکھا تھا ۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے ۔ وہاں میری بیگم حیدر سے ملاقات ہو گئی ورنہ وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ۔

بیگم حیدر تو ہنسی کا گول گپا تھی ۔ اگرچہ اسکے نقوش ستواں تھے اور گولائیاں خاصی مختصر تھیں لیکن اسکی ہنسی تو چشمے کی طرح اُبلتی رہتی تھی ۔ مسکراہٹ ہر وقت ہونٹوں میں دبی رہتی اور پھر بات بات پر "ہی ہی ہی ہی" مجھ سے کہتی ، "نجمہ ! کتنی اداس شام ہے آج !! اور پھر یوں بے ساختہ ہنستی جیسے شام کی اداسی ایک فرحت بخش چیز ہو ۔ "توبہ کیا مصیبت ہے اس برف پر چلنا"! ۔ اور پھر پھسل کر گرتے ہی "ہی ہی ہی" کرنے لگتی ۔ جیسے برف پر گرنا ایک عشرت ہو ۔ ہنسی کے علاوہ اسے "کچھ سنا تم نے؟" سے عشق تھا ۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہتی ۔ "کچھ سنا تم نے نجمہ" ؟ اور پھر ہوٹل کی خبروں کا ضمیمہ شروع ہو جاتا ۔

اس شام بھی وہ آتے ہی بولی ۔ "کچھ خبر بھی ہے یا یوں ہی گم سم بیٹھی چائے ہی پیتی رہو گی ؟ آج میاں لیلیٰ مجنوں بنفس نفیس آئے ہوئے ہیں ۔ اسی ہوٹل میں" ۔ وہی ! وہ چلائی ۔ "جو دوپہر کے قریب آئے تھے ۔ جب ہم کمرے میں بیٹھی تھیں ۔ مسٹر وحید اور بیگم" ۔

"نام بھی پوچھ لیا تم نے "! میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا ۔

"لو نام تو بیرے سے پوچھا تھا ۔ ویسے میں تو دو بار مل بھی آئی ہوں" ۔

"سچ" ؟ ثریّا نے خواب آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا ۔

"ہائے ! کیا بتاؤں ثریّا ۔" وہ بولی "بالکل لیلیٰ مجنوں ہیں ۔ توبہ اتنا بھی کیا ۔ سارا دن بیگم کا بازو تھام کر کمرے میں بیٹھا رہا ۔ یوں بازو کو الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا جیسے کوئی انوکھی چیز ہو اور وہ بھی بازو ہاتھ میں تھمائے مسرور بیٹھی تھی جیسے اسے ایک نعمتِ عظمیٰ بخش رکھی ہو ۔ حالانکہ عمر میں کافی بڑی ہے ۔ مگر سکول کی لڑکی کی طرح ہنستی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ میاں بالکل نوجوان ہے ۔ جیسے کسی کالج سے پکڑ کر لائی ہو ۔ زبردستی ۔ "میاں متوالی" قسم کی مٹیار عورت ہے ۔ ہاں پر نجمہ ! وہ ہنس کر بولی" ہے بڑی پیاری خوش خلق ہے ، ملنسار ہے اور ٹک لگاؤ نہیں جانتی ۔ بنتی ذرا نہیں ، ابھی آئے گی یہاں میں نے بلایا ہے اُسے ۔"

"یہاں آنے دینگے کیا" ؟ صفیہ بولی ۔

"ہی ہی ہی" وہ ہنسنے لگی ۔ "مذاق نہیں ۔ یوں شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھے رہتے ہیں جیسے سکول کے بچے مدرسے سے بھاگ کر آئے ہوں ۔"

چائے پیتے ہوئے بیگم حیدر پھر چلّانے لگی "ہائے ! میں تو بھول ہی گئی ۔ معلوم ہے آج یہاں کون آیا ہے ـــ ۔ مسٹر مارووالا !"

"مارووالا؟" ثریا نے حیرانی سے دہرایا۔

"مارووالا کو نہیں جانتی ؟" وہ ہنسنے لگی ۔ "وہ تو پاکستان کا مانا ہوا پامسٹ ہے ۔" ثریا کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکیں۔

پامسٹ کا نام سن کر صفیہ نے پُرامید انداز سے اپنے پیٹ کی طرف دیکھا جیسے پامسٹ کسی حکیم کا نام ہو ۔

میں نے انہیں چھیڑنے کیلئے پامسٹری پر بحث شروع کر دی "تو کیا تمہارا خیال ہے کہ ہاتھوں کی لکیروں میں انسان کا مستقبل چھپا ہوتا ہے" میں نے پوچھا ۔

ابھی بحث شروع ہی ہوئی تھی کہ بیگم وحید آگئیں۔

"آئیے آئیے"، بیگم حیدر اسے دیکھکر اچک کر اٹھی۔ "آپ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ تعارف کرا دوں پہلے۔ یہ میری سہیلی نجمہ ہیں۔ یہ ہیں ثریا اور آپ بیگم ارجمند ہیں۔ آپ کے بارے میں تو سبھی جانتی ہیں۔ چائے پیئں گی آپ یا کافی؟"

نووارد ادھیڑ عمر کی ہوگی۔ اسکے انداز میں وقار اور تمکنت تھی۔ آنکھوں میں دکھ کا عنصر واضح تھا مگر جب وہ بات کرتی تو گویا خلوص کا دھارا بہنے لگتا۔ شخصیت میں عجیب چمک اور جاذبیّت تھی۔

بیگم وحید نے آتے ہی بے تکلّف انداز اختیار کر لیا۔ "پریشان نہ ہوں آپ۔" وہ بولی "چائے کا پیالہ میں خود بنا لوں گی۔ آپ اپنی بات جاری رکھیں۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ میں مخل ہوئی۔"

بحث پھر شروع ہوگئی میں نے ہاتھ کی لکیروں کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا۔ اس پر بیگم ارجمند پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی اور بیگم حیدر نے بات بدلنے کے لئے بیگم وحید سے پوچھا۔" آپ کا کیا خیال ہے۔ بیگم وحید؟ کیا ہاتھ کی لکیروں میں انسان کا کردار اور مستقبل کندہ ہوتے ہیں؟"

اس سوال پر بیگم وحید جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسکا رنگ زرد ہوگیا۔ ایک ساعت کے لئے اسکے ہونٹ کانپے لیکن اس نے منہ سے کچھ جواب نہ دیا۔

"تو کیا آپ ہمارے ساتھ مارووالا کو ہاتھ دکھانے نہ جائیں گی؟" بیگم ارجمند بات کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

"مجھے مستقبل سے ڈر لگتا ہے۔" بیگم وحید کانپتے ہوئے بولی۔ "میں مستقبل کے متعلق کچھ جاننا نہیں چاہتی۔ نہیں نہیں"، دفعتاً اسکے جذبات یوں برانگیختہ ہو گئے جیسے بھس میں آگ لگ گئی ہو۔" نہیں نہیں، میں نے مستقبل کے متعلق جان کر بہت دکھ سہا ہے! بہت دکھ سہا ہے!!"

"بیگم وحید!" میں نے پھر وہی بنیادی اعتراض پیش کرنے کی کوشش کی۔ "کیا آپ بھی یہ سمجھتی ہیں کہ ہاتھ کی لکیروں میں انسان کا مستقبل کندہ

ہوتا ہے؟"

"ہاتھ ۔۔۔ ہاتھ کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن" ایک ساعت کے لئے وہ جھجکی، پھر اس نے جوش میں اپنا بازو ننگا کر کے بڑھا دیا۔ یہ دیکھئے، یہ میری لوح تقدیر!"

"لوح تقدیر؟" ہم سب نے حیرانی سے اسکی طرف دیکھا۔

"ہاں" وہ بولی۔ "میری قسمت کا ایک ورق میرے بازو پر کندہ ہے!"

ہم سب کی نگاہیں اس کے بازو پر مرکوز ہوگئیں۔ بھرے ہوئے سڈول بازو پر ایک نیلی رگ اُبھری ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔ نہ جانے جسم کی مرمریں سفیدی کی وجہ سے یا ویسے ہی ابھری ہوئی رگ کا رنگ بے حد شوخ تھا۔

بیگم وحید کی بات سن کر ہم سب بوکھلا گئیں۔ ثریا کی آنکھیں خوابوں کی دنیا کو چھوڑ کر حقائق کو دیکھنے کے لئے گویا اپنے خانوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ بیگم ارجمند کو اپنے پیٹ کی سدھ بدھ نہ رہی تھی اور بیگم حیدر کی مخصوص مسکراہٹ کافور ہو چکی تھی۔

"یہ نیلی رگ نہیں ہے۔" بیگم وحید نے لمبے وقفے کے بعد کہا۔ غور سے دیکھئے یہ واؤ ہے واؤ۔ میرے خاوند کے نام کا پہلا حرف واؤ۔"

"ہائے اللہ!" ثریا نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

بیگم ارجمند نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیگم وحید کی طرف دیکھا۔

بیگم حیدر کے ہونٹوں پر ایک تمسخر آمیز ہنسی جھلکی جیسے الف لیلیٰ کا قصہ سن رہی ہو۔

بیگم وحید کے دودھیا بازو پر وہ نیلی واؤ یوں واضح تھی جیسے چکنے کاغذ پر کاتب نے نیلی سیاہی سے نسخ میں لکھی ہو۔

"یہ بازو میری تقدیر کا ایک ورق ہے۔ صرف ایک ورق!" یہ کہتے ہوئے بیگم وحید کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے یوں آہ بھری جیسے دہکتے ہوئے انگارے کو پانی میں ڈالنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔" ایک ماہ پہلے تقریباً ایک ماہ۔" بیگم وحید نے کہا۔ "میرے ہونے والے شوہر کے نام کا پہلا حرف آہستہ آہستہ

اس بازو پر ابھرتا ہے اور پھر علیحدگی سے کچھ دیر پہلے یوں مٹ جاتا ہے جیسے کبھی ابھرا ہی نہ ہو ۔ جیسے میرے بازو میں کوئی نیلی رگ ہی نہ ہو ۔"

"علیحدگی ۔۔۔" ثریا نے زیرِ لب دہرایا ۔

"ہاں ۔۔۔" بیگم وحید نے حسرت بھری نگاہ ثریا پر ڈالی ۔ کتنی بے بسی تھی اسکی منظر میں ۔ "یہ میرا چھٹا شوہر ہے ۔" وہ بولی ۔

محفل پر گویا سکتہ طاری ہوگیا ۔

باہر شفق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو چکی تھی ۔ دور ننھے ننھے چراغ سسکیاں بھر رہے تھے ۔ نیچے وادی کے جنگل میں گیدڑ چیخیں مار رہے تھے ۔

دیر تک بیگم وحید آگ کے شعلوں کو گھورتی رہی ۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی ۔ "بارہ سال ہوئے" اس نے ایک لمبی آہ بھری ۔ "بارہ سال جب میری پہلی شادی ہوئی تھی ۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی ۔ میرے والدین نے مجھے نواب زادہ ظاہر بیگ سے بیاہ دیا ۔ لیکن دو سال کے اندر اندر وہ تباہ کن حادثہ واقعہ ہوا ۔"

"ایک رات ایک خوفناک زلزلہ آیا ۔ ہماری قدیم حویلی گر گئی اور وہ سب ہلاک ہو گئے ۔ میری والدہ ، والد ، بھائی ، اور میرے شوہر ، نہ جانے میں کیسے بچ گئی ۔ مگر میں بچ گئی ۔ بلکہ مجھے خراش تک نہ آئی ۔ اف کس قدر قیامت خیز منظر تھا !" اس نے گہری آہ بھری اور پھر آگ کے شعلوں کو گھورنے لگی ۔

بیگم حیدر منہ پر انگلی رکھے حیرت سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی ۔ ثریا نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام رکھا تھا اور بیگم ارجمند کا منہ یوں کھلا تھا جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھی ہو ۔

"اس سانحہ کے بعد میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی ۔" بیگم وحید نے پھر بات شروع کی ۔ "والد صاحب کی جائداد کافی تھی ۔ گزر اوقات کے متعلق فکر نہ تھا لیکن ایک دکھ تھا کہ میرے سر پر کسی کا سایہ نہ تھا ۔ کوئی مشورہ دینے والا نہ تھا ۔ دل کا حال کسی سے نہ کہہ سکتی تھی ۔ اسوقت مجھے اس لوحِ تقدیر کا احساس نہ تھا ۔ مجھے معلوم نہیں ۔ ممکن ہے ان دنوں بھی میرے بازو پر کوئی

نیلا حرف کندہ ہو ۔ ممکن ہے ۔"

"اس سانحہ کے چھ مہینے بعد میں نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ میرے بائیں بازو پر نیلی رگ ابھری ہوئی ہے ۔ اسے دیکھ کر میں ڈر گئی ۔ بھاگی بھاگی ڈاکٹر کے پاس گئی ۔ چار ایک ڈاکٹروں کو دکھایا ، انہوں نے کہا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ۔ ویسے ہی رگ ابھر آئی ہے ۔ ان دنوں میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اسکی شکل کیسی ہے ۔ آیا وہ کسی حرف سے ملتی جلتی ہے یا ویسے ہی مڑی ہوئی ہے ۔"

"اسکے دو ماہ بعد میرے دوسرے شوہر کیپٹن رفیع نے ایک روز میرا بازو دیکھکر قہقہہ لگایا ۔ "ارے !" وہ بولے ! ۔۔۔۔۔ یہ تو صاف طور پر رے لکھا ہے ۔ بالکل ایسے جیسے میں اپنے دستخط میں رے لکھتا ہوں ۔ شروی ۔" وہ مجھ سے کہنے لگے ۔ تم پر تو ازلی طور پر ہماری چھاپ لگی ہوئی ہے ۔"

"کیپٹن رفیع ایک خوش باش فوجی افسر تھے ۔ وہ طبعاً ہر بات پر قہقہہ لگایا کرتے تھے ۔ لیکن" اس نے ایک آہ بھری ۔ "ہم صرف چھ ماہ اکٹھے رہے ! مجھے یاد ہے جب ایک روز میں غسل کر رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ نیلی رگ غائب ہو چکی ہے ! چونکہ ابھی تک مجھے یہ شعور نہ تھا کہ اس کے مٹ جانے کا مطلب کیا ہے ، میں خوشی خوشی رفیع صاحب کے پاس گئی اور بازو دکھا کر بولی ۔ "دیکھ لو جی ! ہم پر کسی کی چھاپ نہیں لگی ۔" انھوں نے از راہِ مذاق بُرا سا منہ بنا لیا ۔ کہنے لگے "شروی ! یہ تو بہت بُرا ہو ، ہماری املاک ہم سے چھن گئی ۔ اب ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ہماری ہو ۔"

"چند ہی روز کے بعد انہیں محاذ پر جانے کا حکم مل گیا ۔ جانے سے پہلے وہ مجھے تسلیاں دیتے رہے لیکن الوداع کہتے وقت انکا ضبط ٹوٹ گیا ۔ ٹھنڈی آہ بھر کر بولے "شروی اب کیا ہے جبکہ ہماری چھاپ ہی نہ رہی ۔ بہر حال چاہے کسی کی بنو خوش رہو ۔ خداحافظ!" پیشتر اسکے کہ میں کچھ کہتی وہ جا چکے تھے ۔"

"ایک مہینے کے اندر اندر خبر آگئی کہ رفیع مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں ۔ اسوقت دفعتاً مجھے یہ خیال آیا کہ نیلی رگ کا غائب ہونا ایک اشارہ تھا

اس روز سے مجھے اپنے بازو سے ڈر آنے لگا اور میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میری زندگی سحرزدہ تھی اور کوئی انجانا ہاتھ اسے بنا اور بگاڑ رہا تھا ۔ لیکن خوف کے باوجود میں بار بار اپنے بازو کو دیکھتی تھی ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بازو ننگا کر کے اسے گھورنا شروع کیا۔

ثریّا چپکے سے اٹھی اور بیگم وحید کی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو کر یوں اس نیلی واؤ کو دیکھنے لگی جیسے پیناٹزم کے زیر اثر ہو ۔ صرف ثریّا ہی کیا ہم سب گویا اسے دیکھنے پر مجبور تھیں ۔ اور وہ نیلی واؤ پھیل رہی تھی اور ہم پر مسلّط و محیط ہوتی جا رہی تھی ۔

باہر ستارے سسکیاں بھر رہے تھے ۔ ہوا کراہ رہی تھی ۔ گیدڑ رو رہے تھے دفعتاً بیگم وحید نے سر اٹھایا اور بولی ۔ "پھر نیلی رگ پھر سے ابھرنے لگی ۔ اسے دیکھکر میرا دل تشویش سے دھڑکنے لگا ۔ چند ہی دنوں میں اس نے واضح شکل اختیار کر لی ۔ میم ۔ اس میم کو دیکھکر میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسے شخص سے شادی کرنے پر مجبور ہوں جس کا نام میم سے شروع ہوتا ہے ۔ اس خیال سے ہی مجھے وحشت ہوتی اور میں ہر اس شخص سے دور بھاگنے لگی جس کا نام میم سے شروع ہوتا تھا ۔ نہیں نہیں میں آپ ہی آپ چلاتی "نہیں نہیں میں کٹ پتلی نہ بنوں گی ۔ میں اپنی زندگی کی آپ مالک ہوں ۔"

"ان دنوں ایک اور فوجی مجھ سے شادی کرنے کا متمنی تھا لیکن میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا ۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی ایسے شخص سے شادی نہ کروں گی جس کے نام میں میم کا حرف موجود ہو ۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ اس نیلی تحریر کے سحر سے آزاد ہو جاؤں ۔"

" پھر مَیں نے ایک ادیب سے شادی کر لی انکا نام کیف ناصری تھا ۔ لیکن میری خوشی صرف چند روزہ تھی ۔ کیونکہ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ انکا اصلی نام منظور تھا اور کیف ناصری محض ادبی نام تھا جو انہوں نے اپنا رکھا تھا ۔ اس نئے انکشاف کے بعد مجھ پر مایوسی چھا گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ نیلی تحریر سے فرار ممکن نہ تھا ۔"

"کیپٹن رفیع کی وفات کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ نیلی رگ کے راز سے اپنے شوہر کو کبھی آگاہ نہ کرونگی ۔ اسلئے میں نے کبھی اپنے بازو کے اسرار کے متعلق اپنے شوہر سے بات نہ کی تھی ۔"

"دو سال کے بعد وہ میم بھی میرے بازو سے مٹ گئی اور اس ڈر سے کہ وہ مجھ سے الگ نہ ہو جائیں ، میں نے ان سے والہانہ محبت کا اظہار شروع کر دیا۔ میں ان سے یوں چمٹ گئی جیسے گرتا ہوا شخص چمٹتا ہے لیکن ---" بیگم وحید نے زہرخند آواز میں کہا "وہی والہانہ محبت ہماری علیحدگی کا باعث بن گئی ۔ وہ اکتا گئے اور انہوں نے ایک گری ہوئی عورت سے تعلق پیدا کر لیا اور انجام کار ہم الگ ہو گئے ۔ اس کے بعد لوح تقدیر پر ڈاکٹر اجمل اور میں نے تین سال اکٹھی زندگی بسر کی ۔ اب کی بار جب الف مٹا تو میں نے والہانہ محبت کے اظہار سے احتراز کیا ۔ میں نے بڑے جبر سے بے پروائی کا روپ دھارے رکھا ۔ لیکن اس مرتبہ میری یہی ظاہری بے پروائی ہماری جدائی کا باعث ہوئی ۔ ڈاکٹر اجمل نے اپنی نرس سے شادی کر لی ۔"

"پہلے تو مجھے ان تبدیلیوں پر بڑا دکھ ہوتا تھا ۔ لیکن یہ دیکھکر کہ حالات پر میری کوششوں کا کچھ اثر نہیں ۔ اپنی بے بسی کو محسوس کر کے میں حالات پر قانع ہو گئی ۔ اور اپنی زندگی کے واقعات کو یوں بے تعلقی سے دیکھنے لگی جیسے پردۂ سیمیں پر کوئی کھیل کھیلا جا رہا ہو ۔ جسے دیکھنے پر گویا میں مجبور تھی ۔ ہر ایک یا دو سال کے بعد کسی انجانے پروجیکٹر سے ایک نیلے حرف کی تصویر میرے بازو پر ابھرتی اور پھر دو ایک سال کے اندر اندر آپ ہی آپ مٹ جاتی ۔ اور پھر خارجی واقعات اس محور کے گرد گھومتے ۔ میں خود ہی تماشہ تھی اور خود ہی تماشبین ۔ میرے اللہ ! اس نے دونوں ہاتھوں میں سر کو تھام لیا ۔ محفل پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا ۔ کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا ۔ ثریّا بیگم وحید کی کرسی کے پیچھے بت بنی کھڑی تھی ۔ صفیہ پاگلوں کی طرح بیگم وحید کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

باہر دھوڑی نے منظر کو چھپا لیا تھا اور ایک گہرا سکوت طاری تھا ۔ دفعتاً

ایک خوفناک گرج سے ہم سب چونک پڑیں ۔

"میرا پانچواں خاوند" وہ اپنی ہی دھن میں بولی "داؤد ایک اوباش آدمی تھا ۔ مجھ سے عقد کرنے سے اسکا مقصد میری جائداد پر قبضہ کرنا تھا ۔ اس نے دو بار جعلی دستخط کر کے بینک سے روپیہ بھی نکلوایا تھا ۔ یہ باتیں مجھے مینجر سے معلوم ہوئی تھیں ۔ اپنی جائداد کے تحفظ کے لئے میں نے ایک مینجر مقرر کر لیا تھا ۔ وہی مینجر اب میرا شوہر ہے ۔"

"مسٹر وحید ؟" بیگم حیدر نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں" اس نے سر اثبات میں ہلا کر کہا ۔ "داؤد صاحب وحید کی تقرری پر بہت برہم ہوئے تھے ۔ پہلے روز ہی وہ وحید کے خلاف ہو گئے تھے ۔ چونکہ انکا مقصد ہی روپیہ بٹورنا تھا اس لئے وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انکے سوا کوئی اور میرے مالی معاملات کی دیکھ بھال کرے" ۔

"حالانکہ میں جانتی تھی انکا مقصد مجھے لوٹنا ہے پھر بھی میں نہیں چاہتی تھی کہ جان بوجھ کر ان سے قطع تعلق کروں ۔ یقین کرنا میں نے کبھی نہ چاہا تھا کہ علیحدگی ہو جائے سچ کہہ رہی ہوں ۔" اس نے اپیل بھری نگاہ ہماری طرف ڈالی ۔ ویسے داؤد نے وحید کے خلاف بغض رکھنے کا جواز پیدا کر لیا تھا ۔ خیالی جواز ۔ وہ ہم دونوں پر شک کرتے تھے ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وحید کی طرف سے کبھی ایسی حرکت سرزد ہوئی تھی اور نہ انکے ذہن میں کوئی ایسی بات تھی ۔ مجھے تو کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ ایسی بات ممکن ہو سکتی ہے ۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وحید صاحب مجھے داؤد سے ہوشیار رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے ۔ اور وہ بھی صرف مالی معاملات کے متعلق ۔"

" پھر ایک دن وہی ہؤا ۔ میرے بازو سے دال کا حرف مٹ گیا اور اسکی جگہ آہستہ آہستہ واؤ ابھر آئی ۔ اسے دیکھکر میرا دل دھک سے رہ گیا ۔ لیکن میں نے یہ راز اپنے دل ہی دل میں دفن رکھا ۔ سچ پوچھو تو اب مجھ میں ایک عجیب سی سپردگی پیدا ہو چکی تھی میں سوچتی تھی دیکھوں اب حالات کیسے بدلتے ہیں ۔ میں سوچنے لگی ۔ داؤد مجھ سے علیحدگی پر آمادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے تو دولت

سے پیار ہے ۔ اس لئے وہ آسانی سے مجھے ہاتھ سے جانے نہ دے گا ۔"

"پھر ایک روز جب داؤد صاحب سینما دیکھنے گئے ہوئے تھے ۔ میں اور وحید ڈرائینگ روم میں بیٹھے حساب کی پڑتال کر رہے تھے تو واقعات نے عجیب پلٹا کھایا ۔ عجیب ۔۔۔ !" اس نے آہ بھر کر ہماری طرف دیکھا "حالات کو بدلتے دیر نہیں لگتی ۔" وہ مسکرائی ، وہ مسکراہٹ گویا آنسوؤں میں ڈھلی ہوئی تھی ۔

"اسوقت رات کے بارہ بجے ہونگے ۔ ہم التزاماً داؤد کا انتظار کرنے کیلئے حساب میں لگے ہوئے تھے ۔۔۔ دفعتاً تمام بتیاں بجھ گئیں ۔ اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا" "کیا ہوا" میں نے گھبرا کر وحید سے پوچھا ۔

"شاید فیوز اڑ گیا ہے ۔" وہ بولے ۔ "میں ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں ۔"

"اس وقت میں صوفے پر بیٹھی تھی اور اس سے کچھ دور ایک تپائی پر وحید کام کر رہے تھے ۔ دروازہ پرلی جانب تھا ۔ وحید اٹھے اور دروازے کی جانب بڑھے ۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا ۔ وحید صاحب کا بیان ہے کہ وہ واقعی دروازے کی جانب گئے تھے ۔ جو کوچ سے برعکس سمت میں تھا ۔ انھوں نے چکر سا محسوس کیا اور پھر گویا ان کو اٹھا کر کسی نے پھینک دیا اور وہ دھڑام سے مجھ پر آ گرے اور میں ڈر گئی ۔ عین اسوقت بتیاں روشن ہو گئیں اور داؤد صاحب اندر داخل ہوئے ۔ توبہ کس قدر فتنہ و فساد برپا کیا داؤد نے ۔ ہم نے لاکھ سمجھایا مگر بے سود ۔ انہیں تو بہانہ ہاتھ آ گیا اور وہ اس بات پر اڑ گئے کہ وحید کو فوراً موقوف کر دیا جائے ۔ پیشتر اسکے کہ میں کچھ کہتی وحید صاحب بولے ۔ "میں خود ہی جانا چاہتا ہوں بیگم صاحبہ مجھ سے حساب لے لیجئے ۔ میں اسی وقت جا رہا ہوں ۔ مجھے دے دو حساب" داؤد بولے لیکن وحید نے انہیں حساب دینے سے انکار کر دیا ۔ بیگم صاحبہ چاہے آپ ہی کو دے دیں وہ بولے لیکن میں آپکو حساب نہ دونگا ۔ مجھے معلوم ہے آپ کا مقصد کیا ہے ۔"

"اِس پر پھر بات بگڑ گئی ۔ داؤد نے غصے میں وحید پر ہاتھ اٹھایا ۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے دھکا دیکر گرا دیا ۔ اس پر مجھے بھی طیش آ گیا ۔ میں نے کہا کہ داؤد صاحب ابھی میرے گھر سے نکل جائیے ابھی !

داؤد نے نکلنے سے انکار کر دیا اور خطرناک عزائم سے میری طرف بڑھے ۔ اسپر
وحید نے فوراً ٹیلیفون اٹھا لیا اور داؤد کو پولیس کی دھمکی دی ۔ اگر آپ فوراً باہر
نہ نکلے تو جعلی چیکوں کا کیس پولیس کو دیا جائے گا ۔ داؤد صاحب گھبرا گئے اور
مصالحت کی کوشش کرنے لگے لیکن وحید اڑ گئے ۔ جب داؤد کو معلوم ہو گیا کہ
انکا بھید کھل چکا ہے تو وہ چپکے سے باہر نکل گئے اور پھر جلد ہی تنسیخِ نکاح کا
فیصلہ ہو گیا ۔ اسکے بعد معلوم نہیں کیسے ، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہنا تھا ۔
وحید صاحب کی مجھ سے شادی ہو گئی !"

وہ خاموش ہو گئی ۔ اسکی آنکھوں میں ایک مسرت بھری چمک تھی ۔ اگرچہ
اس کے پس منظر میں اب بھی بے بسی اور ہراس کی جھلک تھی ۔ لیکن وہ
مسرت بے حد پیاری تھی جیسے ندی میں کنول کا پھول بہے جا رہا ہو ۔

"وحید کو مجھ سے بے حد محبت ہو چکی ہے ۔ وہ بار بار کہتے ہیں ثروی !
میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہونگا ۔ انکی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دل
کی گہرائیوں سے بات کر رہے ہیں ۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مَیں نے جانا ہے کہ
محبت کسے کہتے ہیں ، مسرّت کیا چیز ہے ۔"

ثریا کی آنکھوں میں پھر سے خوابوں کی "دھوڑی" چھا گئی ۔ صفیہ مسکرانے
لگی اور بیگم حیدر کا چہرہ فرطِ انبساط سے کِھل گیا ۔ "جبھی وہ تمہارا بازو تھامے
بیٹھے رہتے ہیں ۔" وہ چلائی ۔

"ہاں ۔۔۔" بیگم وحید نے فخریہ انداز سے کہا ۔ "انہیں مجھ سے والہانہ
محبت ہے ۔ اور میں کوئی بات ان سے چھپا نہیں سکتی ۔ اسلئے میں نے نیلی
رگ کا راز ان سے کہہ دیا ہے ۔ صبح و شام اُٹھتے بیٹھتے وہ مجھ سے کہتے ہیں ثروی
ذرا دکھانا تو میری قسمت کا نوشتہ ، کہیں اسکی آب و تاب میں فرق تو نہیں آ
گیا اور میں ہنس کر کہتی ہوں اگر آ گیا ہو تو؟ ۔۔۔ اسپر وہ سنجیدہ ہو جاتے
ہیں ۔ "ثروی ! تم مجھے زندہ نہ پاؤ گی اس روز ۔ تمہاری قسم ! وہ جیب سے
پستول نکال کر یوں قسمیں کھانے لگتے ہیں جیسے وہ کوئی صحیفہ ہو ۔" بیگم وحید
ہنسنے لگی ۔ "بڑے وہمی ہیں وہ ۔ انہیں بیٹھے بٹھائے وہم ہو جاتا ہے کہ واؤ مٹ

تو نہیں گئی اور پھر میری طرف بھاگتے ہیں ۔ بیگم ذرا ایک منٹ معاف کرنا میں
مخل ہوا آدھی رات کو جگا جگا کر ٹارچ جلا جلا کر میرا بازو دیکھتے ہیں ۔ باہر کام پر
جاتے جاتے لوٹ آتے ہیں اور پھر ملتجیانہ انداز سے کہتے ہیں کہ بیگم معاف کرنا
مجھے ، ذرا بازو ادھر کرنا اور وہ میرا بازو تنگا کر کے دیکھتے ہیں ۔" یہ کہتے ہوئے بیگم
وحید ہنسنے لگی ۔ ہنستے ہنستے اس نے اپنا بازو آگے نکالا ۔۔ دفعتاً اس کی ہنسی رک
گئی اور وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی ۔ نیلی واؤ نے شنگرفی رنگ اختیار کر لیا تھا
اور وہ یوں چمک رہی تھی جیسے جلتا ہوا انگارہ ہو ۔

ثریّا کی آنکھیں ابل آئیں ۔ بیگم ارجمند ڈر کر پیچھے ہٹ گئیں اور بیگم حیدر
اضطراب میں اُٹھ بیٹھی ۔

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا ۔" بیگم وحید دیوانوں کی
طرح بڑبڑانے لگی ۔ دفعتاً ایک مہیب گرج کی آواز آئی ۔ اسکے ساتھ ہی مسٹر وحید
دروازہ کھول کر اندر آ گئے ۔ ۔ "معاف کرنا ۔ معاف کرنا" ، وہ گھبراہٹ سے
بولے ایک منٹ بیگم صرف ایک منٹ مجھے افسوس ہے کہ میں مخل ہوا ۔"

بیگم وحید نے انہیں دیکھکر جھٹ بازو چھپا لیا اور خاموش کھڑی رہی ۔

کچھ دیر تک وہ بیگم وحید کی طرف ملتجیانہ نگاہ سے دیکھتے رہے ۔ پھر دفعتاً
گھبرا کر بولے ۔ "اوہ ! تو تو یعنی ۔۔۔ ختم ہو گیا !" یہ کہہ کر وہ مڑے ۔

انہیں واپس جاتے ہوئے دیکھکر بیگم وحید اضطراب میں چلائی ۔ "نہیں
نہیں کچھ بھی تو نہیں ہوا ۔ کچھ بھی نہیں ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بازو
آگے کو بڑھا دیا ۔ وہ رک گئے ۔ انہوں نے مڑ کر بیگم کے بازو کی طرف دیکھا ۔
دفعتاً انکا رنگ فق ہو گیا ۔ لپک کر انہوں نے بازو کو ہاتھ میں پکڑ لیا پھر انکے منہ
سے ایک چیخ نکلی جیسے کوئی زخمی پرندہ دم توڑ رہا ہو ۔ پھر وہ دیوانہ وار باہر نکل
گئے ۔

ہم سب نے حیرانی سے بیگم وحید کے بازو کی طرف دیکھا ۔ اسپر نیلے رنگ
کے نشان کا وجود تک نہیں تھا ۔ صرف بیگم وحید ہی اس حقیقت سے بے خبر
تھی کیونکہ وہ حیرانی سے وحید کی طرف دیکھ رہی تھی ۔

دفعتاً باہر گولی چلنے کی آواز آئی ۔ ہم سب دیوانہ وار باہر نکلیں ۔
برآمدے میں وحید ڈھیر ہو رہے تھے ۔ ہاتھ میں ابھی تک پستول پکڑا ہوا
تھا۔ کنپٹی سے خون کا فوارہ جاری تھا ، شنگرفی خون !

..........○..........

عطیہ

شاید اسکی یہ وجہ ہو کہ اسکا نام عطیہ تھا اور اسلئے وہ سمجھنے لگی تھی کہ اللہ نے اسے بنی نوع انسان پر نعمت بنا کر اتارا ہے یا شاید اس لئے کہ اسکے چہرے کے خطوط عام چہروں سے مختلف تھے ۔ جیسے وہ مکعبوں سے بنا ہو جسے دیکھکر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو ۔ "حواس کیوں باختہ ہو گئے جناب کے" ۔ اسکے جسم کے خطوط میں بھی قوسوں کی بھرمار تھی ۔ اسکے حسن میں حجاب غم یا اداسی کی جھلک نہ تھی ۔ اگر وہ آنکھیں جھکا بھی لیتی تو احساس نہ ہوتا تھا کہ اس نے آنکھیں جھکا لی ہیں بلکہ ایسے محسوس ہوتا کہ اسکی ہنسی میں تمسخر کی جھلک ہو ۔

اسکا چہرہ کتابی نہ تھا ۔ وہ سوچنے یا آہیں بھرنے کی بجائے عمل پر مائل کرتا تھا ۔ جی چاہتا کہ اسکی کلائی تھام لیں ۔ راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں یا اسے پکڑ کر پیٹیں یا اسکے ہاتھوں پٹ جائیں تو بڑا مزا رہے ۔ اور یہ سب کچھ اسکے چہرے کی ہڈیوں کے زاویوں کی وجہ سے تھا ۔ اسکی پیشانی ابھری ہوئی تھی جیسے اسمیں ہوا بھری ہو ۔ اُسکے گال گول نہیں تھے ۔ چھوٹے چھوٹے مکعبوں کے بنے ہوئے تھے اور اسکے جبڑے تلے عزم دبا ہوا تھا جیسے کلّے میں پان دبایا ہوتا ہے اور اسکی ٹھوڑی یوں معلّق تھی جیسے مغلوں کے باغ میں سنگ مرمر کی بارہ دری معلق ہوتی ہے ۔ اور ان انوکھے زاویوں کے درمیان دو حسّاس ہونٹ دو ہنستی ہوئی شریر آنکھیں اور ایک ستواں ناک جو نسائیت سے بھیگی بھیگی تھیں ۔

یا شاید اسکی وجہ اُس ماحول سے تعلق رکھتی ہو جسمیں وہ پل کر جوان ہوئی تھی اسکا والد ایّوب ریلوے کے سفری سٹاف میں تھا اور چونکہ اُسے مسلسل حرکت سے تعلق تھا ۔ اس لئے ایّوب کو رسم و رواج سے یکسر نفرت تھی اور اسکی تمام تر زندگی روایت سے خالی تھی ۔

ایّوب کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر بات پر بیوی کے شانوں پر سر رکھ کر رو دیتا تھا ۔ بیوی کے شانوں پر سر رکھ کر رو دینا اُسکے لئے سب سے بڑی نعمت تھی ۔ سب سے بڑی تسکین تھی اور اسکی دانست میں وہ ہر مشکل کا حل تھا ۔ وہ اسٹیشن پر صاحب سے لڑ پڑتا ۔ چند ایک ساعت کے لئے غصے کی وجہ سے اسکا جسم کانپتا ۔ آنکھوں میں سُرخ ڈورے دوڑتے ۔ لیکن جلد ہی وہ وہاں سے گھر کی طرف بھاگتا اور پھر بیوی کے شانے پر سر رکھ کر روتا ۔ حتیٰ کہ وہ تلخی کافور ہو جاتی اور پھر وہ یوں سو جاتا جیسے اسے لوری دی گئی ہو ۔ لیکن اسکے اس روّیے کی وجہ سے اسکی بیوی کی زندگی تلخ ہو چکی تھی ۔ کیونکہ اسکا شوہر نہ تو اس قابل تھا کہ بیوی کو ڈانٹے ڈپٹے اور نہ ہی بیوی کے لئے یہ ممکن رہا تھا کہ میاں کو آنکھیں دکھائے ۔ جو پہلے ہی شانے پر سر رکھ کر رو رہا ہو ۔ اُسے ڈانٹنا آسان کام نہیں ہوتا ۔

شادی کے بعد دو ایک سال تو دلہن اسے تسلیاں دیتی رہی ۔ لیکن کوئی کب تک اس شغل میں دلچسپی لے سکتا ہے ۔ تسلی دینے کے خشک شغل سے ایک روز وہ اکتا گئی ۔ اسے یہ گلہ پیدا ہو گیا کہ میاں کو ایسا وطیرہ اختیار کرنا چاہیے تھا کہ جس میں بیوی کے لئے کچھ کرنے یا کہنے کی گنجائش باقی رہے ۔ صرف رونے کے بل بوتے پر پہاڑ سی زندگی کیسے بسر کی جا سکتی ہے ۔ بہر حال بیوی کے دل میں اس شانے پر سر رکھ کر رونے والے میاں سے نفرت ہو گئی ۔ وہ اسے کمتر سمجھنے لگی اور احساس برتری سے اس کی پیشانی بلند ہو گئی اور اسکے ہونٹوں میں تمسخر بھری مسکراہٹ ہمیشہ کیلئے دب کے رہ گئی ۔ اور عطیہ نے ماں کا یہ اندازِ برتری سلب کر لیا اور اسکے چہرے کے خطوط ابھرے اور تحکمانہ زاویے قائم کر لئے اور عطیہ کی ٹھوڑی یوں معلق ہو گئی جیسے سنگ مرمر کی بارہ دری ہو اور عطیہ یہ سمجھنے لگی کہ مرد صرف اسلئے بنے ہیں کہ عورتوں کے شانوں پر سر رکھ کر رو دیں اور عورت کا یہ فرض ہے کہ مرد کے لئے شانے پر سر رکھ کر رو دینے کی عشرت کے سامان مہیا کرے ۔

بہر صورت چاہے اسکی کوئی بھی وجہ ہو ، یہ ایک حقیقت تھی کہ عطیہ اپنے

آپ کو ایک نعمت سمجھتی تھی جو بنی نوع انسان پر اتاری گئی ہو جیسے کہ ہر نوجوان لڑکی آجکل سمجھتی ہے ۔

عطیہ کو یہ احساس دینے کی ذمہ داری زیادہ تر سکول کے چوکیدار پر عاید ہوتی ہے کیونکہ سب سے پہلے چوکیدار کی نگاہوں نے اپنی زبان میں اس راز کا عطیہ پر انکشاف کیا ۔ جب بھی وہ سکول کے دروازے میں داخل ہوتی تو دور کھڑے چوکیدار کریم داد کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چلنے لگتیں وہ اک جوش سے آگے بڑھتا ۔ وہ محسوس کرتی جیسے کریم داد کی نگاہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر اٹھا لیا ہو ۔ پھر وہ اسکے قریب آ جاتا ۔ بہت قریب اور عطیہ انجانے میں ادھر اُدھر کسی اور چیز کی طرف دیکھکر مسکراتی ۔ اسکی ایڑیاں اوپر کو اٹھ جاتیں اور شانے ہوا میں معلق ہو جاتے اور چہرے کے خطوط تن جاتے ۔ پھر دور پہنچ کر وہ کسی نہ کسی بہانے منہ موڑ کر پیچھے ضرور دیکھتی ۔ دور دروازے کے پاس کریم داد مغموم کھڑا ہوتا ۔ اس پر عطیہ کے شانے اور ابھرتے شاید اس لئے کہ کریم داد کو ان پر سر رکھنے کے لئے زیادہ جھکنا نہ پڑے اور عطیہ کی بے نیاز مسکراہٹ اور کِھلتی ۔ پھر انکے گھر میں ایک نیا نوکر دتّا آ گیا ۔ اور عطیہ نے اسے دیکھکر محسوس کیا جیسے کریم داد روپ بدل کر انکے گھر آ پہنچا ہو ۔ دتّے نے عطیہ کو دیکھا اور آنکھیں جھپکنے لگا اور اسکا نچلا ہونٹ لٹکتا گیا ۔ حتیٰ کہ اس میں سے رال ٹپکنے لگی ۔ عطیّہ یہ دیکھ کر جُھوٹ موٹ غصّے میں چلّانے لگی ۔ "کیا دیکھتا ہے تو میری طرف" ۔ اس پر دتّے کی آنکھیں بالکل ہی چندھیا گئیں اور ہونٹ سمٹ کر بٹوا بن گئے ۔ "جی بی بی جی" وہ یوں گنگنایا جیسے اُسکی تعریف کی گئی ہو ۔

اسکے بعد جب بھی عطیہ دتّے کے سامنے آتی تو اسکی نگاہوں کی دوربین کا فوکس گڈ مڈ ہو جاتا اور وہ گھبرا کر آنکھیں جھپکنے لگتا ۔ اور اُسکا ہونٹ لٹک جاتا اور اس میں سے رال ٹپکتی جیسے عطیہ میٹھی چیز ہو ۔ یہ دیکھکر اس میٹھی سی چیز میں تلخی پیدا ہو جاتی اور وہ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی جسے سن کر بے چارہ دتا جامے میں پھولا نہ سماتا ۔ عطیہ کی تلخی اسے اور بھی شیریں بنا دیتی اور وہ ہونٹوں کی رال چاٹنے لگتا اور عطیہ خوش ہو کر اسے گھورتی ۔ "پاگل تو نہیں تُو" ۔ اور دتّے کی آنکھیں

جھپک جھپک کر اسے کہتیں ۔ "یہی میں سوچ رہا ہوں بی بی جی" ۔ اور عطیہ بظاہر جل کر کہتی ۔ "تُو تو بالکل پاگل ہے" اور دتّے کے ہونٹ فرطِ مسرّت سے کھل جاتے جیسے بی بی نے یہ بات تسلیم کر کے اسے بڑا اعزاز بخش دیا ہو ۔

دتّے کی آمد عظیم نتائج کی حامل تھی ۔ اس کی جھپکنے والی آنکھوں نے عطیہ کی آنکھوں میں اک شانِ استغنا پیدا کر دی ۔ اسکے لٹکتے ہوئے ہونٹ نے عطیہ کے خوبصورت ہونٹوں میں بے نیازی بھری مسکراہٹ دبا دی ۔ دتّے کے وجود نے عطیہ کی ایڑیاں اور اونچی کر دیں ۔ شانے ابھار دیے ۔ اور باالآخر دتّے کی دوربین کے بگڑتے بنتے فوکس نے عطیہ کے شفاف جسم کو یوں الٹ پلٹ کر رکھدیا کہ مختلف مقامات پر قوسیں ابھرنے لگیں ۔ واضح خطوط دھندلا گئے ۔ اعضا پُھولنے لگے ۔ جلد پھیلنے لگی اور زاویے سمٹنے لگے ۔

ان تبدیلیوں پر پہلے تو وہ ڈر گئی پھر آہستہ آہستہ اسے احساس ہوتا گیا کہ وہ نشانات دراصل اس کی جاذبیت کے نشان تھے ۔

اب سکول اور گھر کے درمیانی راستے پر نئے نئے دتّے اور کریم داد پیدا ہونے لگے ۔ جیسے جیکسن کی کہانی میں جنّاتی دانتوں کو بونے سے سورما پیدا ہوئے تھے ۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ راہ چلتے چلتے سورما تلوار سنبھال کر لڑنے کی بجائے ہتھیار ڈالکر آنکھیں جھپکاتے تھے ۔ یا انکی آنکھیں حیرت سے یوں کھلی کی کھلی رہ جاتیں جیسے ابھی اپنے خانوں سے نکل کر عطیہ کے پاؤں میں گر پڑیں گی ۔

راہ چلتے لوگوں کی عینی دوربین بگڑتے دیکھنے میں ایک عجیب راحت تھی ۔ مگر اس راحت کے حصول کے لئے وہ ہوا کے چلنے کی محتاج تھی ۔ جو اسکے برقعے کے پردے کو ایک ساعت کے لئے ہٹا دیتی تھی ۔

پھر آہستہ آہستہ اس نے ہوا کی عدم موجودگی میں پردے کو اڑانے کا فن سیکھ لیا اور بائیسکل سواروں اور پیدل چلنے والوں کے لئے راہ چلنا مشکل ہو گیا اور لوگوں کی نظروں پر چڑھ کر عطیہ کے پاؤں میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی ۔ اور وہ شوقیہ طور پر رقص کی مشق کرنے لگی ۔

گھر میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ، چھت پر ٹہلتے ہوئے صحن میں گھر کا کام

کرتے ہوئے رقص کا شغل خوب چلتا تھا ۔ غالباً اسی شغل کی وجہ سے اڑوس پڑوس کی چھتوں پر کئی ایک دتّے آ پہنچے ۔ حتّٰی کہ نگاہوں کا ایک تخت بن گیا جس پر عطیہ تاج پہن کر بیٹھ گئی اور اسکے قدموں میں ساری دنیا ایستادہ ہو گئی اور نگاہوں نے طلب کے دامن پھیلا دئے ۔

جوانی کی آمد کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئے اور عجیب سے احساس سے واقف ہوئی تھی یہ نیا احساس چنداں خوش کن نہیں تھا اور اسکے اس تفریحی رقص میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرتا تھا ۔ ویسے بھی تو اسکی نوعیّت مبہم سی تھی ۔ بیٹھے بٹھائے وہ دل میں ایک کسک سی محسوس کرتی ، نہ جانے کہاں سے ایک میٹھا سا درد چپکے سے ابھرتا ۔ پھر وہ چیونٹی کی طرح رینگتا ۔ ایک اداسی چاروں طرف سے اسے گھیرنے کی کوشش کرتی ۔ پتہ نہیں وہ درد کیوں ہوتا تھا ۔ کہاں ہوتا تھا اور وہ اداسی کیوں بوند بوند اسکے دل کی گہرائیوں میں ٹپکتی تھی ۔ دُکھ کی دھنکی کیوں بجتی تھی اور ان سارے دتّوں کی نگاہوں کی بچھی ہوئی مسند کے باوجود وہ اُداسی کیوں بوند بوند گرتی رہتی تھی ۔ جیسے گلاب کے پھول پر اوس کے قطرے گر رہے ہوں ۔ مگر عطیہ نے اس بڑھتے ہوئے احساس کا واضح طور پر کبھی اعتراف نہ کیا تھا ۔ بلکہ ایسے وقت اسکے رقص میں اور بھی شدّت پیدا ہو جاتی ۔ اسکی بے نیاز مسکراہٹوں میں ایک نئی چمک ابھر آتی ۔ اس طرح اسکے جسم کا بند بند اس دکھ کے مبہم احساس سے آزاد ہونے کی کوشش میں لگ جاتا ۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ منڈیروں پر دتّے حیرانی سے اسکی طرف دیکھتے ، بازاروں میں دتّوں کی آنکھیں ابلتیں اور وہ سائیکلوں سے گرگر کر اسکے قدموں میں آ پڑتے اور پھر یوں مظلوم نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتے جیسے سڑک کا کتّا کار تلے آ کر چیختا ہے ۔

پھر ایک واقعہ رونما ہوا ۔

ایک روز عطیہ کا والد ایوب بھاگا بھاگا گھر آیا ۔ اسکے ہاتھ میں ایک تار تھا ۔ "یہ سن لیا آپ نے جی" ۔ وہ چلّانے لگا ۔ "جاہ ڈھاکے سے یہاں تبدیل ہو گیا ہے وہ آج کی گاڑی سے یہاں پہنچ رہا ہے" ۔ ہائیں عطیہ کی ماں نے فرط خوشی سے سینہ پیٹ لیا ۔ "جاہ یہاں آ رہا ہے !"

عطیہ کے لئے جاہ محض ایک نام تھا کیونکہ اس نے اپنے اس خالہ زاد کو کبھی نہ دیکھا تھا ۔ چند ایک ابن عم سے تو واقف تھی ۔ جب وہ ماموں سرور کے پاس دس روز کے لئے گئے تھے ۔ وہ دس دن بھی عجیب دن تھے ۔ ماموں سرور نیل کوٹ میں رہتے تھے ۔ ان دنوں ۔۔ نیل کوٹ ایک قصبہ تھا ۔ جونہی عطیہ نے نیل کوٹ کی گلیوں میں قدم رکھا چاروں طرف سے حیرت زدہ نگاہیں اس پر پڑنے لگیں ۔ عورتوں نے اسے دیکھکر ناک پر انگلیاں رکھ لیں ۔ بوڑھوں نے ہاتھوں سے سینے سنبھالے "بوا کون ہے یہ لڑکی ۔"

"کیا کہا اپنی نوراں کی ہے ! توبہ ان شہر والیوں نے تو حد کر دی" ۔ مانی نے دیکھا ۔ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں ۔ ہائے یہ میری عطی ہے کیا ۔ ہائے میں قربان جاؤں ۔"

ایوب کی آمد کی خبر سن کر عطیہ کے ماموں زاد بھاگے بھاگے آئے ۔ رحمت علی دفعتاً عطیہ کو دیکھکر رک گیا ۔ سہم کر پیچھے ہٹا اور پھر سر کھجاتا ہوا واپس چلا گیا ۔ امانت علی نے باہر ہی سے جھانک کر دیکھا اور پھر وہیں چارپائی پر بیٹھ کر آنکھیں جھپکنے لگا ۔ اور عطیہ نے محسوس کیا جیسے نیل کوٹ میں دتّے ہی دتّے آباد ہوں ۔ اسکے ہونٹوں پر تمسخر بھری مسکراہٹ آگئی ۔ اور پھر وہ بے تکلّف اپنے رقص کی نمائش کرنے لگی ۔

ہاں ابنِ عم سے وہ اچھی طرح واقف تھی ، اسلئے جاہ کا نام سنکر اس نے محسوس کیا جیسے دور ریل گاڑی میں ایک نیا دتّا آنکھیں جھپکتا آ رہا ہو ۔ بہر حال ان دتّوں میں ایک خوبی ضرور تھی ۔ پس منظر میں ان کے وجود سے عطیہ کے رقص میں ایک نیا جوش پیدا ہو جاتا تھا ۔ اسکی حرکات میں ایک تازگی عود کر آتی ۔ اور چہرے کے سبھی زاویے ابھر ابھر کر نمایاں ہو جاتے اور یہ احساس شدّت سے تقویت حاصل کر لیتا کہ وہ بنی نوع انسان پر عطیہ کے طور پر اتاری گئی ہے ۔

اگلے روز جب وہ سو کر اٹھی تو اسے معلوم ہوا کہ جاہ انکے گھر آ پہنچا ہے اور اسکی والدہ کے ساتھ باتوں میں مشغول ہے ۔ یہ خبر پانے کے بعد عطیہ نے بے

پرواہی سے غسل کیا ۔ چہرے کے زاویے ابھارے وائل کے پھولوں میں قوسوں کو ابھارا اور پھر دونوں چوٹیاں اِدھر اُدھر لٹکا کر یوں باہر نکلی جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ کوئی آیا ہے ۔

صحن میں جا کر اس نے ایک غلط انداز نگاہ سے ملاقاتی کمرے کے کھلے دروازے کیطرف دیکھا ۔ جہاں جاہ اور اسکی والدہ باتوں میں مشغول تھے ۔ اور پھر وہ پڑوسیوں کی بچی عصمہ سے جو اتفاق سے اسوقت انکے صحن میں موجود تھی ۔ کھیلنے کے بہانے اپنے کلاسیکی رقص میں مشغول ہو گئی ۔ بے نیازی کے باوجود اس نے اپنی ماں کی آواز سنی ۔ "اے ہے اپنی عطی ہے" ۔ جاہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر عطیہ کی ماں سے یوں باتوں میں مشغول ہو گیا ۔ جیسے کچھ ہؤا ہی نہ ہو ۔ جیسے عطی عطیہ ہی نہ ہو ۔

عطیہ کے دل پر ٹھیس لگی ۔ لیکن وہ اور بھی شدت سے عصمہ کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو گئی ۔ اسکی حرکات میں اور بھی روانی پیدا ہو گئی ۔ اسکے چہرے کے خطوط اور بھی مکعبی ہو گئے ۔ اسکی ہنسی میں رنگینی اور بھی بڑھ گئی ۔ لیکن اسکے باوجود جاہ اسکی ماں سے باتیں کرنے میں یوں مصروف رہا جیسے اسے اس رنگینی ، ان خطوط ، اور اس رقص سے کوئی دلچسپی نہ ہو ۔ پھر آہستہ آہستہ عطیہ کی نظر دھندلانے لگی ۔ مکان کی دیواریں چاروں طرف سے اسکی طرف بڑھنے لگیں ۔ جیسے اسے گھیر لینے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں ۔ پاؤں ٹھوکریں کھانے لگے ۔ پھر گھبرا کر وہ بھاگی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر دوپٹہ دور پھینک کر اوندھے منہ بستر پر گر گئی ۔ اس کی مژگان کانٹوں کی طرح چُبھ رہی تھی ۔ کنپٹیاں تھرک رہی تھیں ۔ دل دھک دھک کر رہا تھا ۔ اسکا تاج سر سے گر چکا تھا اور تخت ٹوٹ چکا تھا ۔ جاہ میں اتنی جرأت کہ وہ اسے خاطر میں نہ لائے اور جاہ کی آنکھیں اسے دیکھنے کے باوجود اپنے خانوں میں قائم رہیں ۔ اور اسکے ہونٹ ویسے ہی بند رہیں ۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ وہ تو عطیہ تھی عطیہ ۔ جسے بنی نوع انسان پر اتارا گیا تھا ۔ کیا جاہ بنی نوع انسان نہ تھا ۔

وہ پہلا دن تھا جب عطیہ کی آنکھوں میں نمی سی چھلک رہی تھی ۔ نہ جانے

کہاں سے نکل کر دکھ اس کی روح میں رینگنے لگا تھا ۔ وہی دکھ جسے وہ اپنے رقص سے دبا دیا کرتی تھی ۔ وہی دکھ جسے دتّوں کی نگاہیں چھلنی کی طرح چھان کر باہر نکال دیا کرتی تھی ۔

پھر غصے کی لہر اسکے تن بدن میں لہرائی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ اسے جھکنا ہی ہو گا ، قدموں میں نہ سہی شانوں پر سہی ۔ میں عطیہ ہوں عطیہ ۔ اسے سمجھنا ہی ہو گا ۔

جاہ ایک جرنلسٹ تھا ۔ جسے نئی خبروں اور پرانی قدروں سے دلچسپی تھی ۔ اسے نئی شراب اور پرانے جاموں سے کوفت ہوتی تھی ۔ اسکے چہرے پر ایک اطمینان کی سی کیفیت طاری رہتی تھی ۔ طنز اور تجسس ہونٹوں میں دبے دبے رہتے اور مزاح کی حِس آنکھوں کے کونوں سے جھانکتی ۔ لیکن عام نگاہیں اسکے چہرے پر اطمینان کے غلاف کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں ۔

ممکن ہے عطیہ کو دیکھکر جاہ کے ہونٹوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی ہو لیکن وہ جنبش دبی دبی رہی اور اطمینان کا غلاف چھایا رہا ۔

اِدھر عطیہ کی نگاہوں میں گھر کی دیواریں دھندلائی رہیں ۔ اب تو اسے رقص میں بھی دلچسپی نہ رہی تھی ۔ بلکہ بسا اوقات جاہ کے کمرے کے سامنے چلتے ہوئے وہ ٹھوکر کھا جاتی جیسے وہ اسمِ اعظم اسکے ہاتھ سے کھو چکا ہو جو اسکی حرکات کی روانی اور رقص کی رنگینی کا ضامن تھا لیکن اسکے باوجود عطیہ ابھی مایوس نہیں ہوئی تھی ۔

جب ماں نے جاہ سے اسکا تعارف کروایا تو عطیہ بے نیازی کا ایک عجیب سا پوز بنا کر کھڑی ہو گئی ۔ لیکن جاہ نے ایک نگاہ غلط انداز ڈالکر کہا ۔ "ہوں تو یہ ہے عطی" ۔ عطیہ کے لئے جاہ کا یہ انداز قطعی طور پر ناقابلِ قبول تھا لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی : اسلام علیکم جاہ صاحب ۔ اس نے جان بوجھ کر اسے جاہ صاحب کہکر اپنی بلوغت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کی لیکن جاہ پھر سے ممانی کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو چکا تھا ۔

"شادی کے متعلق" وہ بولا "ممانی صاحبہ میں نے آج تک اس بارے میں

سوچا ہی نہیں" ۔ "آخر سوچنا ہی پڑے گا اسکے متعلق" ۔ وہ بولی ۔ "کب تک بے نیاز رہو گے تم" ۔ "سوچنا کیا ہے" ۔ وہ ہنسا ۔ "جب ہو جائیگی ہو جائیگی ۔ اللہ اللہ خیر سلا ۔"

"آخر اپنی پسند کی کرو گے نا ۔"

"میری پسند" اُس نے قہقہہ لگایا ۔ "میری پسند کا کیا ہے ۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ کوئی عورت ہو ۔ بس ۔"

"عورت ہو" ؟ ۔ نوراں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی ۔ "تو کیا لڑکی سے بیاہ نہ کرو گے عورت سے کرو گے" ۔ نہ جانے کیوں وہ شرما گئی ۔

"نہیں نہیں" ۔ وہ گھبرا کر بولا ۔ "مطلب ہے کہ ہو گی تو لڑکی سے ۔ مگر لڑکی ایسی ہو جسمیں نسائیت ہو ۔ آجکل کی لڑکیاں تو عورت بننے اور کہلانے سے شرماتی ہیں ۔"

"کوئی بہت ہی پڑھی لکھی کرو گے ۔"

"کیوں" ۔ وہ چونکا ۔ "ضروری ہے کیا ؟"

"آخر آجکل کے لڑکے یہی تو چاہتے ہیں کہ لڑکی تعلیم یافتہ ہو ۔"

"لیکن ممانی" ۔ وہ ہنسا ۔ "تعلیم لڑکیوں کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکتی ۔"

"نہ جانے کیا کہہ رہا ہے تُو" ۔ نوراں سٹپٹا گئی ۔

عطیہ غصّے سے کھول رہی تھی ۔ "ہونہہ عورت" ۔ اور وہ یوں کھڑی دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے میں محو تھی جیسے اسے عورت ہونے سے قطعی دلچسپی نہ ہو ۔ لیکن اسکے دل کی گہرائیوں میں غصّہ کھول رہا تھا ۔ "ہونہہ عورت ! پھر وہاں کھڑے رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا اور وہ باہر نکل گئی اور پھر صحن میں جا کر ربڑ کے گیند کو بچیوں کیطرح اچھال اچھال کر ہنسنے لگی ۔ "ہونہہ عورت ۔۔۔"

اس روز سارا دن عطیہ یوں ناچتی رہی جیسے "لکلی کلیر دی" کھیل رہی ہو ۔ ہونہہ عورت ! ہونہہ عورت ۔

پتہ نہیں کیوں عطیہ کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا ۔ سکول سے آتے

ہوئے اب وہ برقعے کا پردہ اڑانے میں بھی دلچسپی نہ لیتی تھی اور جب کوئی سائیکل سوار دھم سے اسکے قدموں میں آ گرتا تو جیسے وہ چونک جاتی اور حسبِ دستور مسکرانے کی بجائے اسکی پیشانی پر تیوری چڑھ جاتی ۔ سکول میں جب کبھی استانیاں اسے رقص کرنے کو کہہ دیتیں تو وہ صاف انکار کر دیتی ۔

ایک روز جب جاہ گھر پر نہیں تھا تو عطیہ کی ماں کو نہ جانے کیا سوجھی ۔ کہنے لگی "عطی آج تو ذرا ناچ کے دکھا دے ۔ بہت دن ہو گئے ۔"

"واہ اماں" وہ چڑ گئی ۔ "میں کیا ناچی ہوں ۔"

"ارے" اسکے ابا دوسرے کمرے سے بولے ۔ "یہ عطی کو کیا ہوگیا ہے جو ایسی باتیں کر رہی ہے ۔ اس نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی ۔ واہ بیٹا ناچنا تو فن ہے فن ۔"

اسکے بعد وہ دونوں عطی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے اور بالآخر اسے ناچ کرنا ہی پڑا جیسے کہ اکثر وہ ماں باپ کے سامنے کیا کرتی تھی ۔ اسکے بازو بل کھاتے ہوئے لہرائے ۔ چتون کمان کی طرح تن گئی ۔ مژگان ڈھلک گئیں اور پاؤں چلنے لگے ۔ اس روز اسکے ناچ میں شوخی نہ تھی اسکی حرکات میں جمال کی نسبت درد کا عنصر حاوی تھا ۔ جیسے وہ کسی کو دکھانے کی بجائے اپنے دکھ کا اظہار کرنے کیلئے ناچ رہی ہو ۔ یا جیسے وہ پہلی مرتبہ کسی دیوتا کو منانے کے لئے رقص کر رہی ہو ۔

جاہ نے اُسے رقص کرتے ہوئے دیکھا تو وہ دروازے ہی میں رُک گیا ۔ عطیہ کی ماں نے جاہ کو دیکھکر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور ایوب نے مسکرا کر منہ موڑ لیا ۔ صرف عطی کو جاہ کی آمد کا پتہ نہ چلا ۔

جب اُس نے رقص ختم کیا تو باپ نے کہا ۔ "اب تو میری بیٹی کو واقعی رقص کرنا آگیا ۔ کتنی ترقی کی ہے اس نے ۔ کیوں جاہ تم نے دیکھا ؟"

جاہ کا نام سنکر وہ چونکی ۔ اور گھبرا کر مڑی ۔ اسکے چہرے پر سرخی دوڑ گئی پھر وہ دانتوں میں اُنگلی رکھ کر بھاگی ۔

"ہا ہا ہا" ۔ ایوب نے قہقہہ لگایا ۔ عطی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ جاہ بھی

دیکھ رہا ہے ۔ ماں زیرِ لب بولی ۔ "لو یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے" ۔ ایوب دفعتاً خاموش ہو گیا جیسے واقعی وہ ہنسنے کی بات نہ ہو اور پھر کچھ کہنے کے لئے بولا ۔ "عطی کا رقص سارے سکول میں بہترین قرار دیا گیا ہے ۔ انعام لیا ہے اس نے ۔"

"اوہ ؟ ۔۔۔" جاہ نے تعجب کا اظہار کرنے کی کوشش کی ۔

"پسند آیا تمہیں ۔"

"ہاں اچھا ہے" ۔ جاہ نے سرسری طور پر کہا ۔ "لیکن ابھی تو محض جمالی حرکات ہیں ۔ ابھی ان میں دل کی دھڑکنیں شامل نہیں ہوئیں ۔"

"ہائیں ۔۔۔" ایوب جاہ کی طرف جوش میں لپکا ۔ "واہ واہ کیا بات کہی ہے ۔ ابھی دل کی دھڑکنیں شامل نہیں ہوئیں ۔ بڑے فن شناس ہو جاہ ۔ واہ واہ واہ ۔"

"لیکن ابھی عطی ہے بھی تو بچّی" ۔ ماں بولی ۔

"ہاں" ایوب نے قہقہہ لگایا ۔ "ابھی سے دل کی دھڑکنیں کیسے شامل ہو جائیں ۔"

"جی !" جاہ نے زیرِ لب کہا ۔ "رقص وہ پھول ہے جو جب تک نسائیت کی شبنم سے نہ بھیگے خوشبو نہیں دیتا ۔"

"اونہہ نسائیت" اندر عطیہ غصّے میں کھول رہی تھی ۔ اسے ماں باپ پر غصہ تھا ۔ انہوں نے جاہ کو اسکا رقص دیکھنے کا موقع ہی کیوں دیا ۔ بڑا نسائیت کا متوالا تو دیکھو ۔ دل کی دھڑکنیں شامل نہیں ۔ ہونہہ ۔

آخر ہار کر وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی اور مطالعہ کی میز پر بیٹھ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسکی آنکھوں میں لفظ دھندلا گئے اور اس نے اپنا سر کتاب پر رکھ دیا ۔

عطیہ کے دل میں جاہ کے لئے نفرت سی پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ اُسے دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی ۔ جاہ کو گھر سے نکالنا اسکے بس میں نہ تھا ۔ اور جاہ کے وہاں ہوتے ہوئے عطیہ کا اسکے وجود سے بے پروا رہنا ممکن

نہ تھا ۔ نہ ہی اب وہ اپنے پرانے مشاغل کو اپنا سکتی تھی ۔ کوشش تو اس نے کئی بار کی تھی ۔ لیکن نہ جانے کہاں سے ایک آواز سی آتی ۔ "اونہہ" اور وہ محسوس کرتی جیسے وہ نگاہوں پر چڑھنے اور رقص کرنے کا کھیل ایک عام سا مشغلہ ہو ۔ اور وہ دتّے ! دتّوں سے تو اب اسے منفرت ہوئی جا رہی تھی ۔

پھر ایک روز جرأت کر کے وہ جاہ کے کمرے میں جا داخل ہوئی ۔ اُس نے ہاتھ میں کتاب پکڑی ہوئی تھی اور چہرہ یوں سنجیدہ بنا رکھا تھا جیسے واقعی کسی کتابی مسئلے میں کھوئی ہو اور اس انداز کو تقویت دینے کے لئے اس نے پنسل منہ میں ڈال رکھی تھی ۔ جاہ نے اسے دیکھا ایک ساعت کے لئے اسکی آنکھوں کے کونوں میں ننھے سے دئے روشن ہوئے اور پھر بُجھ گئے ۔

چند ایک باتیں کرنے کے بعد جلد ہی عطیہ اسے اس مسئلے پر لے آئی جس پر جاہ سے بات کرنے کے لئے وہ عرصہ دراز سے بے تاب تھی ۔ "دیکھئے نا جاہ صاحب" ۔ اس نے معصومیّت بھرے انداز سے کہا ۔ "ایک عورت کی حیثیت سے جہاں تک میں سمجھتی ہوں ۔۔۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔

"تو کیا میں عورت نہیں ہوں ۔" عطیہ نے معصومیّت سے مسکرا کر پوچھا ۔

"شاید ہو جاؤ کسی روز" ۔ وہ ہنسا ۔ "فی الحال تو ایسے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے تم پک نِک پہ آئی ہو ۔"

"اچھا تو مجھے بتائیے" ۔ اس نے بھوؤں کو تان کر کہا ۔ "وہ کیا چیز ہوتی ہے جسے آپ عورت کہتے ہیں ۔"

"اوہ ۔" وہ سنجیدہ ہو گیا ۔ "یہ بتایا نہیں جا سکتا ۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے" ۔ "یعنی" وہ ایک ساعت رک کر بولی ۔ "آپ کا خیال ہے کہ آجکل کی لڑکیاں سبھی پک نِک پر آئی ہوئی ہیں ۔"

"نہیں" جاہ نے ہاتھ کی کتاب کی ورق گردانی شروع کر دی ۔ "سبھی تو نہیں لیکن یہ پک نِک کی روش تحریک بنتی جا رہی ہے ۔"

عطیہ کو غصہ آنا شروع ہوگیا ۔ تو کیا جاہ کے خیال میں وہ میلے پر آئی ہوئی تھی ۔ بہت بنتا ہے ۔۔ دفعتاً اسکی ایڑیاں اٹھیں اور اک شان بے نیازی سے گھوم کر وہ باہر نکل گئی ۔

اس روز سارا دن عطیہ یوں رقص کرتی رہی جیسے واقعی پک نِک پر آئی ہو ۔ سکول کے راستے میں اس نے کئی ایک سائیکل سواروں کو اپنے قدموں میں گرنے پر مجبور کر دیا ۔ واپس گھر پہنچ کر وہ کوٹھے پر گھومتی پھری ۔ صرف یہی نہیں اس روز اس نے انتقامی جذبے کے تحت چھت پر کھڑے ہو کر رسہ کھیلنا شروع کر دیا ۔

جاہ اس دوران میں دو ایک مرتبہ کمرے سے باہر نکلا ۔ لیکن اس نے عطیہ کی طرف توجہ نہ دی اور نہ ہی اس نے چھت کی طرف سر اٹھا کر دیکھا ۔ اس روز اسکے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہت مصروف ہو ۔ جیسے اسے ادھر ادھر کی تفریحی باتوں کا جائزہ لینے کی فرصت نہ ہو ۔

جاہ کی عدم توجہی محسوس کر کے عطیہ کو ایک دھچکا لگا اور وہ چاروں طرف لگا ہوا دتّوں کا میلہ اسکی نگاہ میں دھندلا گیا ۔ اُس نے محسوس کیا جیسے وہ گڑیوں کا کھیل ہو اور وہ منڈیروں پر ٹنگے ہوئے گڈّے بے معنی بے مصرف اپنی آنکھیں پھاڑنے میں اور دانت نکالنے میں مصروف ہوں ۔ اُس نے رسّہ پرے پھینک دیا اور بھاگ کر نیچے اتر آئی ۔ اور پھر غسل خانے میں جا کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی ۔

دفعتاً غسل خانے کا دروازہ کھُلا ۔ اسے ایک بھاری مگر دبی دبی آواز سُنائی دی ۔ "تم ۔۔۔ عطیہ ۔۔۔۔"

عطیہ نے پُرنم نگاہیں اوپر اٹھائیں ۔

"تم ۔۔۔ عطیہ" ۔ جاہ کی آواز جذبات سے بھیگی ہوئی تھی ۔

............○............

نومان اور منیرہ

رات کے وقت جب وال کلاک بارہ بجاتا ہے تو ملحقہ کمرے سے اسکی آواز آتی ہے ۔ "منیرہ ، منیرہ" ۔ اور ایک ساعت کے بعد نومان کمرے کے دروازے میں آکھڑا ہوتا ہے اور اس کونے کی طرف خالی نگاہوں سے دیکھتا ہے جہاں ریشمیں بستر پر ایک ہی لحاف میں ، میں اور منیرہ لیٹے ہوتے ہیں ۔ اسے سامنے کھڑے دیکھکر میں چونک کر منیرہ کیطرف دیکھتا ہوں ۔ اسکا منہ سرخ ہو جاتا ہے ۔ مژگاں جھک جاتی ہیں ۔ جیسے وہ اپنی نمناک آنکھوں کو چھپانا چاہتی ہو ۔

"سو گئی منیرہ" وہ زیرِ لب بڑبڑانے لگتا ہے ۔ "سو گئی !" وہ کمرے میں داخل ہو کر کھوئے ہوئے الفاظ میں اپنے آپ سے کہتا ہے ۔ "ابھی سے سو گئی ۔ کتنی جلدی سو جاتی ہے ۔ بے چاری تھک جاتی ہے نا ۔ سو جاتی ہے ۔ اچھا ہوا سو گئی ، سوئی رہو ۔ سوئی رہو منیرہ ، سوئی رہو ۔ میں تو ویسے ہی آگیا تھا ویسے ہی چلو صبح سہی ۔ صبح ، سوئی رہو" ۔ چند ساعت کے لئے وہ برآمدے میں ٹٹول ٹٹول کر اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا رہتا ہے ۔

اسکی آواز جذبہ محبّت سے لرز رہی ہوتی ہے ۔ اسکا انداز دیکھکر میرے دل میں ترس پیدا ہوتا ہے ۔ اور میں محسوس کرتا ہوں جیسے میں نے کسی اندھے اپاہج بھکاری کے کاسہ سے نقدی چرائی ہو ۔ اسوقت میرا جی چاہتا ہے کہ میں چیخ کر کہوں نہیں نہیں تمہاری بیوی سو نہیں رہی وہ میرے پاس بیٹھی ہے ۔ میرے پاس ۔ میں گھبرا کر منیرہ کی طرف دیکھتا ہوں ۔ اسوقت اسکے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت اور پاکیزگی چھا جاتی ہے اور اسکے سر کے گرد ایک نورانی حلقہ بن جاتا ہے ۔ جیسے ہوس کاری سے اسکا دور کا واسطہ نہ ہو ۔ جیسے بیچنے کے لئے اسکے پاس جسم ہی نہ ہو ۔ اسکی آنکھوں میں نمناک منّت بھری ہوتی ہے اور

اسکے گال پر ڈھلکا ہوا آنسو اس خاموش منّت کو پکاروں میں بدل دیتا ہے ۔

"سو گئی ! سو گئی ! منیرہ سو گئی" ! اسکا خاوند یوں گنگناتا ہوا باہر نکل جاتا ہے جیسے لوری گا رہا ہو ۔ منیرہ کا سر جھک جاتا ہے اور پھر ایک ہلکی سی آواز جیسے کوئی تار ٹوٹ گیا ہو ۔ معاً میری نگاہ آتشدان پر رکھی ہوئی تصویر "امید" پر جا پڑتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسکے رباب کا آخری تار ٹوٹ گیا ہو اور اسکا سر اور بھی جھک گیا ہو ۔ اسوقت کمرے کی ہر چیز سسکیاں بھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ پھر میرا جی چاہتا ہے کہ میں دلّالہ حشمت کو ادا کی ہوئی رقم کا مطالبہ کئے بغیر دودھ کیلئے دو روپے منیرہ کے سامنے پھینک کر دیوانہ وار باہر نکل جاؤں اور گلی میں پہنچ کر چلّا چلّا کر یہ کہوں ۔ "میں الو کا پٹھا ہوں ۔ پاگل ہوں کہ بیس تیس روپے خرچ کر کے اس گھر میں عیش کرنے کے لئے آتا ہوں ۔ اس گھر میں جہاں ہر چیز سسکیاں بھرتی ہے ۔ جہاں گھڑی ٹک ٹک کرنے کی بجائے کراہتی ہے ۔ اور کسی کے سر پر یوں نور کا ہالہ دکھائی دیتا ہے جیسے وہ راہبہ ہو ۔"

ہر ہفتے کی رات یہی واقعہ دہرایا جاتا ہے ۔ حشمت دلّالہ روپے لیتے ہوئے مجھ سے کہتی ہے تم اسکی پرواہ نہ کرنا وہ تو اندھا ہے ۔ ہر ہفتے کی رات کو وہ میرے کمرے میں آکر ہماری طرف دیکھتا ہے ۔ لیکن نہیں دیکھتا ۔ منیرہ اپنے خاوند کو دیکھکر ڈرتی نہیں ۔ اسکے چہرے پر نفرت نہیں جھلکتی بلکہ اسکی نمناک آنکھوں سے ایک آنسو ڈھلک آتا ہے اور چیخ چیخ کر اپنی حماقت کا اعلان کرنے کی شدید خواہش کے باوجود میں چپ چاپ بیٹھا منیرہ کا منہ تکتا رہتا ہوں ۔ اور عیشؔ نشاط کی محفل سجانے کی جگہ ہم دونوں غم کھاتے ہیں ۔ منیرہ اپنے اندھے خاوند کا غم کھاتی ہے اور میں منیرہ کا ۔ ہر ہفتے کی رات کو ۔

آپ جانتے ہیں میں افسانہ نویس ہوں ۔ آج تک میں افسانوں کی دنیا میں رہا ہوں ۔ نہ جانے وہ کتنا منحوس لمحہ تھا جب میرے ایک دوست نے مجھے افسانوں کی دنیا میں رہنے کا طعنہ دیا تھا اور حقائق سے روشناس ہونے پر اکسایا تھا۔ اور آج میں نومان اور منیرہ کا واقعہ قلمبند کر رہا ہوں ۔ لیکن یقین جانئے

یہ پہلا اور آخری واقعہ ہے ۔ جسے میں قلمبند کروں گا ۔ واقعات سے تو افسانے ہی بہتر ہیں ۔

واقعات کی دنیا کو قریب سے دیکھنے کے لئے مجھے کئی ایک مقامات پر جانا پڑا ۔ ممکن ہے اسمیں ہوس کاری کا عنصر بھی شامل ہو ۔ لیکن جب آپ دیکھنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں تو آپ کے احساسات ایک ایسی پگڈنڈی پر چل نکلتے ہیں جو عیش و نشاط کی شاہراہ سے ہٹ کر جاتی ہے ۔

واقعات کی جستجو میں پہلی "پرائیویٹ" جسے دیکھنے کا مجھے موقع ملا ایک کم عمر زرد ڈری ہوئی بچّی تھی ۔ جس وقت اسکی گرگ طبیعت دلّالہ اسکے دام ٹھہرا رہی تھی تو وہ سردی کی شدت سے کانپ رہی تھی کیونکہ اسکے جسم پر ایک قمیض تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اپنا سویٹر اتار کر اسکے کندھے پر رکھدیا اور خود بات کئے بغیر باہر نکل آیا ۔

دوسری پرائیویٹ ، ایک غلیظ گھسی ہوئی کسبی تھی جو اسقدر چل چکی تھی کہ اسمیں روح کا عنصر ختم ہو چکا تھا اور صرف بھدا بھونڈا غلیظ جسم باقی رہ گیا تھا ۔ ایک جونک میری طرف رینگ رہی تھی ۔

تیسری مرتبہ جب دلّالہ حشمت پُر پیچ گلیوں میں میرے آگے آگے آ رہی تھی ، تو میں سوچ رہا تھا نہ جانے اس بار کیا سامنے آئیگا ۔

دفعتاً وہ رکی اور ایک مکان میں داخل ہو گئی ۔ کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلی اور مجھے اشارہ کیا آ جاؤ ۔ میں اندر چلا گیا ۔

پہلی مرتبہ شریفانہ گھر کو دیکھکر میں گھبرا گیا ۔ شاید ہم غلط مکان میں آ گئے ہیں ۔ میں نے سوچا ۔ لیکن جب منیرہ میرے سامنے آئی تو میں حیرانی سے اسکا منہ تکنے لگا ۔ اسکی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں ۔ ناک سرخ ہو رہی تھی ۔ بازو لٹک رہے تھے ۔

"تیس روپے ہونگے" ۔ حشمت بولی ۔

اور اُس نے ہاتھ پھیلا دیا ۔ منیرہ بت بنی کھڑی تھی جیسے اسے اس سودے

سے کوئی تعلق نہ ہو ۔ اسکا جسم ابھر کر مجھے اپنی لپیٹ میں لینے کی بجائے سمٹ رہا تھا جیسے معدوم ہونے کی کوشش کر رہا ہو ۔

اسکے منہ پر ایک مایوس مسکراہٹ جھلکتی اور مجھے محسوس ہوتا جیسے اگر وہ مسکرا نہ دے تو یقیناً اسکی چیخیں نکل جائیں گی ۔ جیسے وہ مسکراہٹ چیخوں کو روکنے کا ایک انوکھا طریقہ ہو ۔ مسکرا کر وہ پھر چھت کی طرف دیکھنے لگتی تھی ۔ اسکے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میری طرف سے تحریک کی منتظر تھی اور مجھے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر اسکی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی ۔ اور پھر دفعتاً دروازے میں وہ آ کھڑا ہوا ۔ اسکا خاوند نومان ۔ اور میری گھبراہٹ دیکھ کر منیرہ کی مسکراہٹ منّت میں بدل گئی ۔ نمناک منّت ، ایک خاموش پکار ۔ اور پھر جب وہ اپنی پوری لوری گنگنا کر چلا گیا تو منیرہ کے چہرے کا تناؤ ٹوٹ گیا ۔

منیرہ میں عجیب سی لطافت تھی ، جیسے فضا میں ایک رنگین سا جالا تنا ہوا ہو ۔ جیسے نسائیت سے روح کشید کر کے پھوک پھینک دیا گیا ہو ۔ اسکی تمام تر کشش اسکی شخصیت سے وابستہ تھی اور اسکی شخصیت میں کوئی ایسا پہلو نہ تھا جو اسکے جسم کی طرف اشارہ کرتا ہو ۔ بلکہ اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا جیسے اسے ہاتھ لگایا تو وہ میلی ہو جائیگی ۔ یہی نہیں اسے دیکھ کر اپنے ہاتھ میلے محسوس ہوتے تھے اور بڑھانے کی بجائے اُنہیں سمیٹ کر چھپا لینے کو جی چاہتا ۔

شادی سے پہلے دو ایک نوجوانوں نے اُسے اشارے بھی کئے تھے ۔ ایسے اشارے جو عنفوان شباب میں کیے جاتے ہیں اور جو مفہوم سے لبریز ہوتے ہیں ۔ جنھیں دیکھ کر لڑکیوں میں اور کچھ نہیں تو شوخی کا ایک چشمہ ابل پڑتا ہے اور سنجیدگی سے اسے خاطر میں لائے بغیر وہ یوں خوش ہو جاتی ہیں جیسے کوئی نعمت مل گئی ہو ۔

لیکن منیرہ ان کی طرف یوں حیرانی سے دیکھتی رہی تھی جیسے ان اشاروں میں خوش ہونے یا بگڑنے کی کوئی بات ہی نہ ہو ۔ اور یہ دیکھ کر اشارہ کرنے والوں میں بات بڑھانے کی ہمت ہی نہ پڑی تھی ۔ پھر اسکی شادی نومان سے ہو گئی تھی اور شادی کے فوراً بعد اس ۔۔۔ کی والدہ انتقال کر گئی اور وہ تنہا رہ گئی

تھی کیونکہ نہ تو اسکا کوئی بھائی تھا نہ بہن ۔

نومان ایک مہاجر لڑکا تھا ۔ جس کے عزیز و اقارب پیچھے رہ گئے تھے ۔ وہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ وہ انکے گاؤں میں جا نکلا تھا اور بڑھیا اسکی کم گوئی سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ اسکے ساتھ کرنا منظور کر لیا تھا ۔

نومان کا قد چھوٹا تھا ۔ جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا ۔ مزاج بلغمی تھا ۔ ہونٹ موٹے تھے اور طبیعت میں نہ تو تیزی تھی اور نہ تلخی ۔ بہر حال وہ ایک غریب لڑکا تھا اور اپنی غربت پر گویا مطمئن تھا ۔ منیرہ کے گھر آنے کے بعد اسکے اطمینان میں مسرّت کا عنصر پیدا ہوگیا تھا ۔

نومان دفتر میں ٹائپسٹ تھا ۔ اسکی تنخواہ سوا سو سے زیادہ نہ تھی ۔ لیکن اسے اس بات کا کوئی ملال نہ تھا ۔ تنخواہ لیکر وہ سیدھا گھر آتا تھا اور ساری تنخواہ منیرہ کے ہاتھ میں دیدیتا۔ پھر ہنس کر کہتا لو اب تم جانو اور تمہارا کام اور منیرہ اسے بار بار گنتی جیسے قارون کی دولت ہاتھ آگئی ہو ۔ اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ اسکے خاوند کی تنخواہ بہت کم ہے ۔ الٹا وہ تو تنخواہ وصول کر کے بے حد خوشی محسوس کرتی تھی ۔ پھر جب نومان کو بس میں بیٹھ کر کہیں جانا ہوتا یا بازار سے پان کھانے کے لئے ایک آنہ مانگنا ہوتا یا بلیڈوں کے پیکٹ کے لئے پانچ آنے طلب کرنے ہوتے تو وہ کہتا ۔ ”خزانچی صاحبہ ذرا خزانے کا منہ ڈھیلا کرو نا ۔ ایک آنہ پان کیلئے چھ پیسے بس کے اور پانچ آنے بلیڈوں کے نکالو نا ساڑھے سات آنے“ ۔ ”صرف ساڑھے سات آنے“ ۔ وہ مسکرا کر کہتی ۔
اور صندوقچی سے سگریٹ کا ڈبہ نکالتے ہوئے جس میں وہ اپنا خزانہ رکھا کرتی تھی ، یوں اسکی طرف دیکھتی جیسے اس نے بہت کم پیسے مانگے ہوں ۔ صرف ساڑھے سات آنے ۔ وہ ہنستی ۔ مانگنا ہی تھا تو کچھ اور مانگا ہوتا ۔

”اچھا“ وہ کہتا ”تو ساڑھے آٹھ آنے دے دو ۔ ایک آنے کا عشق کریں گے“ ۔ اس پر وہ ہنستی ۔ ”اونہوں اب نہیں اجابت کا لمحہ ختم ہوگیا “۔ اس پر وہ دونوں ہنستے ۔ حساب کتاب پر عام طور پر میاں بیوی لڑا کرتے ہیں لیکن

وہ اس بات پر ہنسا کرتے تھے ۔ صرف حساب کتاب کی ہی بات نہیں وہ تو ہر بات پر ہنسا کرتے تھے ۔ حتیٰ کہ اس بات پر بھی کہ شادی کے بعد پہلے پہل جب وہ اس محلے میں آکر رہے تھے تو محلے کے نوجوانوں کی نگاہیں منیرہ کی جانب اٹھیں اور وہ حیران رہ گئے ۔ اوّل تو منیرہ کا حسن ہی ایسا تھا کہ ایک لطیف اور خوشگوار سا اثر چھوڑ جاتا تھا جیسے جلتی ہوئی اگربتی پاس سے گزر گئی ہو یا جیسے بلیک میجک چاکلیٹ کا اشتہار ہو ۔ جس پر جلی حروف میں ”عام سے ہٹ کر“ لکھا ہوتا ہے ۔ دوسرے وہ سوچتے تھے اِس بھدّے بھونڈے اور چمک سے عاری مہاجر لڑکے کو ایسی لڑکی کہاں سے مل گئی ۔ دو ایک نے تو یہانتک جسارت کر دی کہ انکے روبرو گنگنانے لگے ۔ زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت ۔ پھر محلے میں شور مچ گیا ۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے ۔ عورتیں بہانے بہانے آکر اُسے دیکھنے لگیں ۔ نوجوان کوٹھوں پر چڑھ کر اسے دیکھنے لگے ۔ شوقین مزاج دھوپ میں کھڑے ہو کر مونچھیں مروڑنے لگے اور بوڑھے چھپ چھپ کر اُدھر جھانکنے لگے ۔ اِس پر عورتوں نے ہنگامہ مچا دیا ۔ گھروں میں بات بات پر لڑائیاں ہونے لگیں ۔ برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں خوفناک حد تک بڑھ گئیں ۔ وہ تو منیرہ کی طبیعت کا خدا بھلا کرے کہ بات بڑھنے نہ پائی ۔ ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا محلے میں ۔

عورتیں غصے سے بھری ہوئی منیرہ کے ہاں آتیں لیکن منیرہ کی سادگی اور عجز کو دیکھکر ٹھنڈی ہو جاتیں اور لاشعوری طور پر انکے دل میں یقین ہو جاتا کہ اسمیں شعلہ بھڑکانے کی صلاحیت نہیں ہے ۔ کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھکر محلے والوں کو دکھتی ضرور تھی مگر اس میں دکھانے یا دیکھنے کی خواہش نہ تھی ۔ ”بیچاری !“ منیرہ کو دیکھ کر وہ زیرِلب کہتیں اور چلی جاتیں ۔

عورتوں کے مطمئن ہونے کے بعد وہ ہنگامہ آہستہ آہستہ ختم ہوگیا اور محلہ معمول پر لوٹ آیا ۔ لیکن عورت کے متعلق بات ہو تو مرد کو بڑی دیر کے بعد سمجھ میں آتی ہے اور بسا اوقات آتی ہی نہیں ۔ اسکے علاوہ عورتیں خوب جانتی ہیں کہ جس عورت میں دکھانے اور دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں وہ تو محض بے

جاری ہے ۔ لیکن مرد صلاحیتوں پر نہیں جاتے وہ اُمید پر جیتے ہیں ۔ لہذا انہوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں ۔

منیرہ نے ان سرگرمیوں کو محسوس ضرور کیا تھا اور ممکن ہے سوچا بھی ہو کہ اس ہنگامے کا مطلب کیا ہے لیکن سرسری توجہ کے بعد وہ مسکرا کے پھر سے اپنی دنیا میں کھو گئی ۔ البتہ اِس موضوع پر نومان اور منیرہ میں بات ضرور ہوا کرتی تھی ۔

جب وہ دونوں کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھے ہوتے منیرہ سینے پرونے کے کام میں مصروف ہوتی اور نومان اخبار کی سرخیاں دیکھ رہا ہوتا تو دفعتاً وہ اخبار ایک طرف رکھ کر "تت تت" کرنے لگتا ۔ "کیا ہے" وہ سر اٹھائے بغیر پوچھتی ۔ "بے چارہ" ۔ وہ آہ بھر کر کہتا ۔ "کون بے چارہ" ۔ وہ پوچھتی "تمہاری جانے بلا" وہ ہنستا ۔ "آخر بات کیا ہے" ۔ وہ کام الگ رکھ کر اسکی طرف دیکھتی اور مسکراتی "کچھ بھی نہیں" ۔ وہ آہ بھر کر کہتا ۔ "بے چارہ فیل ہو جائیگا ۔"

"کون فیل ہو جائیگا ۔"

"یہ چودھری صاحب کا بیٹا اور کون "۔ وہ ملحقہ گھر کی طرف اشارہ کرتا ۔ "بے چارہ پردوں کے نیچے بیٹھ کر کتاب سامنے کھول کر تمہیں دیکھتا رہتا ہے" ۔ وہ زیر لب ہنسا ۔

"خواہ مخواہ" ۔ وہ ہنسکر چلائی ۔ "آپ بھی حد کرتے ہیں ۔"

"دیکھ لو چاہے" ۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کہتا ۔ "لیکن خیال رکھنا اسے معلوم نہ ہو۔ دیکھو جھروکے کے پیچھے وہ سایہ سا جو ہے ۔ دیکھا ۔"

"آپ تو خوامخواہ پیچھے پڑے ہوئے ہیں اس بات کے" وہ کہتی ۔ "پیچھے تو وہ پڑا ہوا ہے ۔" وہ جواب دیتا ۔ "میں تو کچھ کہتا ہی نہیں ۔"

"تو کہیئے نا" ۔ وہ ہنستی ۔ "اسے کہیئے نا ۔"

"چلو دیکھنے دو ہمارا کیا لیتا ہے ۔" وہ زیر لب کہتا ۔ "بیچارہ دیکھ ہی لیتا ہے نا ۔ اور کیا ۔ اور یہی اکیلا تو نہیں سبھی دیکھتے ہیں ۔ جسکا داؤ چلتا ہے وہی دیکھتا ہے ۔ کیا کیا جائے ۔"

اس پر وہ چڑ جاتی ، "توبہ آپ تو حد ہیں ۔"

"میں حد ہوتا تو وہ مجھے دیکھتے" ۔ وہ چپکے سے کہتا ۔

"تو کیا میں ہوں حد ۔"

اس پر وہ ہنستے رہتے ۔

پھر مونچھوں والا پنواڑی کوٹھے پر آ کر یوں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلنے لگتا جیسے کسی گھڑی کا پنڈولم ہو اور وہ یوں مونچھیں مروڑتا اور مسکراتا جیسے اپنے مرد ہونے کا ثبوت پیش کر رہا ہو اور اس حقیقت پر نازاں ہو ۔ پھر دُور سفید منزل کا لکھ پتی تاجر دور سے آنکھیں مٹکاتا ماتھے پر ہاتھ رکھکر سلام پہنچاتا اور پھر سر کھجانے لگتا جیسے ماتھے پر ہاتھ رکھنا بھی سر کھجانے کے عمل کا ایک حصّہ ہو ۔

لکھ پتی شیخ دُور سے منیرہ کو سبز نوٹ بھی دکھایا کرتا تھا ۔ منیرہ کو تو بات سمجھ میں نہ آئی تھی پھر ایک روز جب اس نے نومان سے بات کی تو وہ ہنسنے لگا ۔ بولا "حد ہو گئی ۔ وہ نیلا کاغذ نہیں ۔ وہ تمہیں سو کا نوٹ دکھاتا ہے ۔"

"نوٹ ۔" وہ چلائی ۔

"ہاں ہاں نوٹ ۔" وہ بولا ۔ "اور وہ بھی پانچ دس کا نہیں سو کا ۔ دیکھا کتنی قیمت ڈالتا ہے وہ تمہاری ۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ" وہ نیم تبسّم نیم غصّے سے بولی ۔

"بے چارہ بڑی تکلیف میں ہے ۔" نومان نے کہا ۔

"خدا کے لئے اب بس کیجئے ۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی ۔

"اچھا تمہاری مرضی ۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا ۔ "ویسے بات تو بس کرنے والی نہیں ۔ اچھا تو اسی بات پر سینما دکھا دو مجھے ۔"

"اونہہ سینما نہیں ۔" وہ ہنسنے لگی ۔ "خزانہ خالی ہو رہا ہے ۔"

"اچھا" ۔ اس نے آہ بھری "تو ہم باہر لگی ہوئی تصویروں پر گزارہ کر لینگے ۔"

اس طرح وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہتے ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی

اور وہ اپنی عادت کے مطابق ہونٹ ڈھیلے کر کے دانت نکالتا ۔ یوں وہ دونوں خوش و خرم رہتے اور انہوں نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ انکی آمدنی کافی نہیں ۔ انہوں نے اپنے اخراجات یوں حساب سے قائم کر رکھے تھے کہ انہیں مالی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کبھی ۔

پھر ایک نیا واقعہ پیش آیا ۔ بظاہر وہ واقعہ انکے لئے اتنا اہم نہیں تھا اس لئے کسی کو خیال ہی پیدا نہ ہوا کہ وہ خوشگوار سا واقعہ مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا ۔

ایک روز نومان حسب عادت ہونٹ سمیٹ کر کہنے لگا ۔ "منیرہ میری تبدیلی ہو گئی ہے ۔" تبدیلی کا نام سُن کر منیرہ گھبرا گئی "بولی ۔ تو کیا ہمیں یہاں سے جانا ہو گا ۔" "گھبراؤ نہیں" ۔ اس نے جواب دیا ۔ "جانا وانا کہیں نہیں صرف اتنا ہوا ہے کہ عام دفتر سے نکال کر مجھے صاحب کے ساتھ لگا دیا گیا ہے ۔ یعنی صاحب کا پی ۔ اے یعنی پرسنل اسسٹنٹ"

"اس سے کیا فرق پڑے گا ۔" منیرہ نے پوچھا ۔

"فرق کیا پڑنا ہے ۔" وہ بولا ۔ "صرف یہی ہو گا کہ یہاں سے اڑایا وہاں جا بیٹھا ۔ البتہ کہتے ہیں معلوم نہیں سچ ہے یا جھوٹ کہتے ہیں ۔ وہاں بالائی آمدنی ہو جاتی ہے کچھ ۔"

"بالائی آمدنی" منیرہ نے دہرایا ۔ "وہ کیا ہوتی ہے جی ۔"

"یعنی" نومان نے کہا "حاجتمند لوگ اب ہمیں بھی رنگدار کاغذ دکھایا کریں گے ۔ سبز نہ سہی ۔ پھر بھی رنگدار تو ہونگے ۔"

اسوقت تو بات مذاق میں ٹل گئی لیکن جلد ہی نومان و منیرہ کے حالات تیزی سے بدلنے لگے ۔

تبدیلی کے چند ایک روز بعد جب وہ دفتر سے واپس آیا تو اسکے ہاتھ میں پیکٹ تھا ۔ منیرہ نے جب اسے کھولا تو وہ حیران رہ گئی ۔ اسمیں کریپ کی ایک خوبصورت قمیض تھی ۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دوپٹہ آ گیا ۔ پھر ایک لفٹی اور بالآخر ایک سنگھار دان جس میں پاوڈر سُرخی ، ناخون پالش کی بوتل اور جانے کیا کیا تھا ۔

سنگھاردان منیرہ کو دیتے ہوئے وہ مسکرا کر، زیرِ لب مسکرا کر بولا ۔ "سمجھ لو ۔ بے چارے اب بالکل تباہ ہو گئے ۔"

"کون تباہ ہو گئے" ۔ منیرہ نے ہنستے ہوئے پوچھا ۔

"وہ کالج کا لڑکا ، مونچھوں والا پنواڑی اور سبز نوٹ دکھانے والا سبھی تباہ ہو گئے ۔ پہلے ہی بیچاروں کی جان پر بنی تھی ۔ اب تو رہی سہی کسر بھی نکل جائے گی ۔ ذرا چل جائے نا پاوڈر سُرخی کا ایک دَور کل ۔ کیا یاد کرینگے سالے ۔" وہ زیرِ لب ہنسنے لگا ۔

پھر ایک روز زبردستی منیرہ کے منہ پر پاوڈر سرخی تھوپ کر وہ اسے سینما لے گیا ۔ اور وہاں اسکا برقعہ اتار کر ایک طرف رکھدیا ۔ منیرہ نے اسپر بہت احتجاج کیا ۔ لیکن نومان نے بات ہنسی میں ٹال دی ۔ "چلو انکا بھی بھلا ہو جائے کیا یاد کرینگے ۔" وہ زیر لب ہنستا رہا ۔

چند ہی دنوں میں نومان نے منیرہ کو بیر بہوٹی بنا کر رکھدیا لیکن اسکے باوجود وہ اسکی روح کو نہ بدل سکا ۔ شاید اسی لئے یا شاید اسکی کوئی اور وجہ ہو بہر صورت نومان منیرہ سے ناامید ہو کر گھر سے غیر حاضر رہنے لگا ۔ شام کو آتا تو وہ سینما چلا جاتا یا سیر و تفریح میں وقت گزارتا اور بہت رات گئے گھر آتا ۔ اور منیرہ سارا دن اکیلی بیٹھی رہتی ۔ پھر آہستہ آہستہ وہ رات کے وقت بھی غیر حاضر رہنے لگا ۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ اسکے گھر موجود ہونے کے باوجود بھی منیرہ تنہا رہنے لگی ۔ چونکہ نومان کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ منیرہ کے پاس آ کر بیٹھے یا اس سے بات کرے ۔

اس تبدیلی پر پہلے تو منیرہ حیران ہوئی ۔ پھر سنبھل گئی اور سوچنے لگی کوئی مجبوری ہو گی ۔ چلو پھر کیا ہوا سب ٹھیک ہو جائیگا اور نومان بھی تو کبھی کبھار کہا کرتا تھا ۔ "بھئی میں کیا کروں نوکری کروں یا تمہارے پاس بیٹھوں ۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے ۔" اسکا لہجہ بھی خشک ہو چکا تھا اور وہ راز دارانہ انداز سے زیرِ لب باتیں کرنے کا سلسلہ تو بالکل منقطع ہو گیا تھا ۔

پھر اس روز جب اس نے اپنی چارپائی منیرہ کے کمرے سے اٹھوا کر بیٹھک

میں لگوا دی تو منیرہ کا ماتھا ٹھنکا اور منیرہ نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بستر کی وہ تبدیلی معمولی اور چند روزہ نہ تھی ۔

پھر انکے گھر میں ایک نوکرانی آگئی اور منیرہ کی رہی سہی حیثیت بھی ختم ہو گئی ۔ اسکا نام حشمت تھا مگر انداز شہزادیوں کا سا تھا ۔ وہ بلا ناغہ دانتوں پر اخروٹ کا چھلکا ملتی تھی ۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی تھی ۔ دن میں بار بار صابن سے منہ دھوتی تھی اور بال کھلے رکھتی تھی ۔

پہلے چار ایک دن تو وہ بی بی کے احکامات پر عمل کرتی رہی پھر اس نے احکامات پر عمل کرنے کے بجائے احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے ۔ چلو بی بی چل کر ہنڈیا دیکھ لو ۔ چلو بی بی اب تم کوٹھے پر جا کر بیٹھو ۔ چلو بی بی میں بابو جی کو کھلا کر لے آؤنگی تمہارا کھانا ۔ تم چلو اپنے کمرے میں ۔

حالات کو اتنی تیزی سے بدلتے دیکھکر منیرہ سہم گئی ۔ اسقدر سہم گئی کہ نوکرانی سے بھی ڈرنے لگی ۔ اس لئے اسکے احکام بجا لانے کے سوا چارہ ہی نہ تھا ۔

پھر جب ایک روز آدھی رات کے وقت اس نے حشمت کی آواز نومان کے کمرے میں سنی تو اسکی سمجھ میں آیا کہ اسکا انداز تحکمانہ کیوں تھا اور وہ اخروٹ کا چھلکا کیوں ملتی تھی ۔

اسکے بعد گھر کے تمام کام کاج کے لئے نومان حشمت ہی کو بلانے لگا اور گھر کا خرچ بھی اسی کے ذریعے ہونے لگا ۔ ایک دن نومان چوری چوری اسے سو سو کے دو نوٹ دے رہا تھا تو منیرہ نے دیکھ لیا اور وہ نیلے کاغذ اسکی آنکھوں سے آنسو بن کر ڈھلک آئے ۔

اس روز وہ موقع پاکر نومان کے کمرے میں چلی گئی اور روتے ہوئے حال دل کہہ دیا ۔ پہلے تو نومان نے بات ہنس کر ٹالنے کی کوشش کی ۔ پھر دفعتاً حشمت کو صحن میں کھڑے دیکھ کر وہ طیش میں آگیا ۔ بولا ۔ ”لوگ تمہیں سو سو کے نوٹ دکھائیں تو کوئی بات نہیں ۔ میں کسی کو دکھاؤں تو تمہارے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ۔ یہ میری کمائی ہے میری اور مَیں جسے چاہوں دوں ۔

اگر روپے لینے کی خواہش ہے تو لو جا کر اس سے جو دکھایا کرتا ہے تمہیں سو سو کے نوٹ ۔ جاؤ میں نے روکا ہے تمہیں ۔“

سامنے حشمت کا سینہ ابھرا ہوا تھا ۔ سیاہ گھنے بالوں میں اسکا شہوانی چہرہ سوجا ہوا تھا ۔ اور اخروٹ کے رنگ میں سے سفید دانت نکلے ہوئے تھے ۔ حشمت کی وہ مسکراہٹ دیکھ کر منیرہ نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسکے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو ۔ وہ زخمی پرندے کی طرح بھاگی ۔ اسکے عقب میں نومان اور حشمت کی ہنسی کا زہر سے بجھا ہوا تیر گویا اسکا پیچھا کر رہا تھا ۔

پھر وہ خاموش ہو گئی ۔ گویا اسکی زبان گنگ ہو گئی تھی ۔ اسکی قوتِ سماعت دھندلا گئی تھی ۔ صرف دو حیران آنکھیں اور آنسوؤں کی ایک مسلسل لڑی ۔ لیکن ان سب حالات کی وجہ اسکی سمجھ میں نہ آتی تھی ۔ ایک معمولی تبدیلی اتنے بڑے بڑے نتائج کیسے پیدا کر سکتی تھی ۔ کاش کہ بالائی آمدنی کی وہ سفید دانتوں والی چڑیل اسکے گھر قدم نہ رکھتی ۔

پھر دفعتاً نہ جانے کیا ہوا ۔ نومان نے دفتر جانا چھوڑ دیا ۔ سارا دن وہ کمرے میں لیٹا رہتا ۔ اور حشمت اسکے پاؤں دباتی رہتی اور شوخ باتیں کرتی رہتی ۔ پھر ان شوخ باتوں کا انداز بدل گیا ۔ جیسے وہ اسے ڈانٹ رہی ہو ۔ چلے جانے کی دھمکیاں دے رہی ہو ۔

ایک روز اس نے حشمت سے پوچھا ۔ ”وہ بیمار ہیں کیا ؟“

”مجھے کیا معلوم ۔“ حشمت ناک چڑھا کر بولی ۔

”کیا تکلیف ہے انہیں ؟“

”میں کیا جانوں ۔“ وہ بولی ۔ ”اپنے گھر والے کے متعلق مجھ سے پوچھتی ہو ۔“

منیرہ خاموش ہو گئی تو وہ آپ ہی آپ بولنے لگی ۔ ”کہتا ہے کہ میری نظر خراب ہو گئی ہے اور رات کے وقت تو بالکل ہی نہیں دِکھتا ۔“ ”نظر خراب ہو گئی ہے ۔“ منیرہ نے دہرایا۔

وہ اخروٹی رنگ میں سفید دانت چمکا کر بولی ۔ "تمہارے لئے تو اچھا ہی ہے ۔ شوق سے رات کے وقت اپنے خریداروں اور یاروں کو بلاؤ ۔ اس اندھے کو کیا پتہ چلے گا ۔ عیش کرو تم ۔ تمہیں کیا پروا ۔ منیرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک گئیں ۔

اُدھر گھر کے حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے ۔ اب وہ عیش و عشرت کے خرچ ختم ہو چکے تھے ۔ گھر میں نہ تو پھل آتے تھے نہ مٹھائیاں حتّٰی کہ گوشت کی جگہ بھی دال پکنے لگی تھی اور یار دوستوں نے آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا ۔

پھر ایک روز نہ جانے کس بات پر حشمت چلّا کر کہنے لگی ۔ "کب تک میں بیوی میاں کو پکا کر کھلاؤں گی ۔ نہ بھئی مجھ سے نہیں ہوتا ۔ میں کیا پیشہ کرواتی ہوں کہ اپنی کمائی تمہیں کھلاؤں ۔"

منیرہ اسکی بات نہ سمجھی لیکن خاموش رہی ۔

"خاوند تمہارا دو مہینے سے معطل بیٹھا ہے ۔ دفتر سے جواب مل چکا ہے ۔"

منیرہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ معطل ہو گئے ہیں ؟

"نہ بھائی میں باز آئی ایسی نوکری سے ۔" وہ بولی "تم جانو اور تمہارے میاں جانیں"۔ اور اس نے یہ بات اس قدر چلّا کر کہی کہ نومان سُن کر اندر آ گیا ۔

اسے سامنے کھڑے دیکھکر وہ اور بپھری ۔ بولی "اسکے میاں کی خدمت کروں اور پھر اسی کے طعنے سہوں ۔ دراصل اسکا مطلب یہ ہے کہ میں چلی جاؤں اور یہ رانی گلچھرے اڑائے اپنے یاروں کے ساتھ جو اسے سبز نوٹ دکھاتے ہیں کوٹھے پر سے اور یہ میاں آپ اپنے منہ سے کہتے ہیں ۔ مجھے دِکھتا نہیں کچھ بھی رات کے وقت پھر ڈر کس کا ۔"

دفعتاً نومان نے محسوس کیا جیسے اُسکی نگاہ کی روشنی گُل ہو گئی ہو ۔

در حقیقت نظر کی کمزوری تو اس نے لوگوں سے اپنی معطلی کی حقیقت کو چھپانے کے لئے ایک بہانہ بنا رکھا تھا ۔ لیکن اسوقت اس نے محسوس کیا جیسے وہ

واقعی اندھا ہو ۔ اسکے باوجود اسوقت ان اندھی آنکھوں میں ایک شعاع سی لپکی جیسے اندھے کو راستہ مل گیا ہو ۔

اسے خاموش دیکھکر حشمت اور غصّے میں چلانے لگی ۔ "دیکھو تو میاں کی مصیبت پر اس عورت کا دل نہیں پسیجتا ۔ اتنی دیر میاں کی کمائی کھائی ہے تو نے اب میاں پر مصیبت آئی ہے تو ۔۔۔۔۔۔"

وہ خاموش ہو گئی ۔ وہ خاموشی حشمت اور نومان کے لئے مفہوم سے لبریز تھی ۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ انکی نگاہیں ملیں ۔ انکی مسکراہٹیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں ۔ بھویں رمزیہ انداز سے ابھریں اور دفعتاً نومان نے دونوں ہاتھ پھیلا دئے اور وہ ٹٹولتا ہو آگے بڑھا ۔ "اوہ ۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا ۔ کچھ نظر نہیں آتا ۔ پھر دورہ پڑ گیا ہے پھر ۔ منیرہ کہاں ہے ۔ منیرہ کہاں ہے ۔۔" وہ چلّانے لگا ۔

حشمت مسکرائی اور بڑھ کر اسے سنبھالنے لگی ۔

عین اسی وقت دروازہ بجا اور ایک عورت پھلوں کا ایک ٹوکرا اٹھائے اندر داخل ہوئی ۔ بی بی جی ۔ وہ بولی ۔ "یہ پھل شیخ صاحب نے بھیجے ہیں ۔"

"نہیں نہیں" منیرہ کہنے لگی ۔ لیکن حشمت نے اس کی بات کاٹ کر پھلوں کا ٹوکرا پکڑ لیا اور بولی ۔ "جاکر کہنا بی بی جی کہتی تھیں بڑی مہربانی ہے آپ کی اور ہاں"، وہ اس کے قریب جاکر رازدارانہ انداز میں کہنے لگی ۔ "ان سے کہنا بی بی جی کہتی تھیں ۔ پھر اس کی آواز مدھم پڑ گئی ۔ اور وہ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی ۔

جب شیخ صاحب کی نوکرانی جانے لگی تو حشمت نے گویا پھر اسے تاکید کی ۔ "کہنا فوری ضرورت پڑ گئی ہے ۔ قرضہ کے طور پر چاہیئں ۔ ہم جلد ادا کر دیں گے ۔"

منیرہ نے سنا تو اس کا دل ڈوب گیا ۔ اس نے منّت بھری نگاہوں سے نومان کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنی بانہوں سے فضا کو یوں ٹٹول رہا تھا جیسے آنکھوں

کے علاوہ اس کے کان بھی بیکار ہو چکے ہوں ۔

"نہیں نہیں" منیرہ چلائی ۔" نہیں نہیں ۔ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

حشمت منیرہ کی طرف دیکھکر مسکرائی ۔ اچھا تو ٹھہر میں تیرے ساتھ چلتی ہوں ۔" وہ شیخ صاحب کی نوکرانی سے بولی ۔ "میں خود سمجھا دونگی انہیں ۔" اور وہ خود شیخ صاحب کی نوکرانی کے ساتھ چل پڑی ۔ اور منیرہ کی دبی دبی کراہ حشمت کی باتوں میں دب کر رہ گئی ۔

اس رات جب بستر میں منہ چھپائے منیرہ رو رہی تھی تو اس نے قریب ہی اندھیرے میں قدموں کی چاپ سنی اور پھر چپکے سے کوئی اس کے بستر میں گھس آیا ۔ وہ تڑپ کر بولی "آپ ہیں ۔"

دو اجنبی بازوؤں نے اسے تھام لیا ۔ منیرہ کی چیخ نکل گئی ۔

منیرہ کی چیخ پر شور مچ گیا ۔ "کون ہے ۔ کون ہے" ۔ نومان بآواز بلند بولا ۔

"کوئی بھی تو نہیں ۔" حشمت کے دانت صحن کے اندھیرے میں چمکے ۔

"تم تو خوامخواہ چلّانے لگتے ہو ۔"

"منیرہ سو گئی ہے کیا "

"دیر ہوئی ۔" حشمت بولی ۔

"اچھا ہوا سو گئی ۔" وہ بولا ۔ "بہت اچھا ہوا ۔" وہ گنگنانے لگا ۔

"سوئے گی نہیں تو اور کیا کرے گی ۔" حشمت کی آواز میں بلا کی طنز تھی ۔ اور پھر ہنسنے لگی ۔

"اچھا ہوا کہ سو گئی ۔" منیرہ کے کانوں میں وہ الفاظ گونجتے رہے ۔ اسکے ہونٹ بند ہو گئے ۔ اجنبی اسکے قریب تر ہوتا جا رہا تھا ۔ اور قریب اور قریب ۔

ہاں ہر ہفتے رات کے بارہ بجے ۔ میں اسکے اور قریب ہو جاتا ہوں اور قریب اور وہ اندھا آ کر اپنی لوری سے اُسے تھپکتا ہے ۔

سو گئی منیرہ ۔ اچھا کیا سو گئی ۔ سو جاؤ اور حشمت کے سفید دانت اخروٹی اندھیرے میں چمکتے ہیں اور وہ میرے دئے ہوئے نوٹوں کو گنتی ہے ۔

میرا جی چاہتا ہے کہ میں دودھ کے پیسے اس کسبی کے منہ پر مار کر بھاگ جاؤں ۔ لیکن اس شدید خواہش کے باوجود میں اسکا منہ تکتا رہتا ہوں اور عیش و نشاط کی محفل سجانے کی بجائے ہم دونوں غم کھاتے ہیں ۔ منیرہ اپنے اندھے خاوند کا اور میں منیرہ کا ۔

ہاں میں پھر کبھی واقعات قلمبند نہیں کرونگا ۔ واقعات سے افسانے ہی اچھے ہوتے ہیں ۔

............○............

گھر کی عزت

اس رات تو وقت گویا بالکل ہی تھم گیا تھا ۔

وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی چھت کو گھور رہی تھی ۔ پاس ہی میز پر اخبار میں لپٹا ہوا ایک پارسل پڑا تھا ۔ جسمیں اسکی سفید پھولوں والی چکن ساٹن کی سرخ قمیض اور خط ملفوف تھے ۔ اسے وہ قمیض بے حد پیاری تھی اور وہ خطوط تو اس نے صرف اس لئے رکھ لئے تھے کہ وہ انہیں پیچھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی ۔ اس نے ان خطوط کو جلانے کی کوشش بھی کی مگر آگ میں ڈالنے کی ہمت نہ پڑی ۔ اسلئے اس نے انہیں پارسل میں لپیٹ لیا تھا ۔ اس بات کو اپنے آپ سے تسلیم کیے بغیر اس پر سوچنے کے بغیر کہ وہ جا رہی ہے ۔ اس نے وہ مختصر سی تیاری کر لی تھی ۔ اور پھر چپ چاپ لیٹ گئی تھی ۔

نہ جانے کیوں غیر از معمول اس روز اس نے تمام کھڑکیاں سرشام ہی بند کر لی تھیں ۔ اسے باہر دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ۔ سوچنے سے بھی تو ڈر لگتا تھا اسے اس روز ۔ لیکن یہ حقیقت بار بار اسکے ذہن میں گھس آتی ۔ اور وہ پھر سے چھت کی شہتیریوں کو گننے میں مصروف ہو جاتی ۔

اس روز اسکی نگاہیں دھندلائی ہوئی تھیں ۔ مگر قوتِ سامعہ بے حد تیز ہو رہی تھی ۔ شام کے وقت بازار میں بھیڑ کا شور تھا ۔ پھر جب اندھیرا ہو گیا تو آمدورفت کم ہوتی گئی ۔ پھر دوکانیں بند ہو رہی تھیں ، گھروں کے صدر دروازے بند ہو رہے تھے ۔ پھر کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا اور دُور رات کے چوکیدار کی آواز گونجنے لگی ۔ اسکے باوجود گھڑی صرف گیارہ بجا رہی تھی ۔ وقت گویا رینگ رہا تھا ۔ چھت سے بھٹک کر اسکی نگاہ میز پر پڑے ہوئے پارسل پر جا رکتی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی ۔ اس پارسل کی طرف دیکھنا اسکے لئے بے حد تکلیف دہ تھا ۔

وہ یہ سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہے ۔ اسمیں اس قدر جرأت نہ تھی کہ حقیقت سے آنکھ ملا سکے ۔ وہ پارسل بھی تو اُس نے یوں بنایا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو ۔ جیسے وہ اخبار میں چیزیں لپیٹنے کی مشق کر رہی ہو ۔ جبھی تو اس پارسل کو دیکھکر وہ گھبرا جاتی تھی ۔ پارسل سے نگاہ چراتی تو اسکی نگاہ دیوار پر ٹنگے ہوئے کیلنڈر پر جا پڑتی ۔ جسمیں ایک گلیکسو بے بی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا ۔ اسے دیکھکر وہ محسوس کرتی جیسے وہ بچہ منتیں کر رہا ہو ۔ "مجھے بچا لو" ۔

اس احساس پر انجانے میں اسکے بازو بچے کو گود میں لینے کے لئے اٹھتے ۔ پھر وہ آپ ہی آپ شرما جاتی اور از سرِ نو لیٹ کر چھت کو گھورنا شروع کر دیتی ۔ واقعی اس رات وقت کٹنے میں نہ آ رہا تھا ۔

کہاوت ہے زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وقت کٹنے میں نہیں آتا ۔ مرزا عبداللہ کے گھر میں یہ کہاوت اور حقیقت دونوں بیک وقت ظہور پذیر ہوئیں ۔ نیچے دالان میں مرزا عبداللہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتے ۔ "بیگم زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی" ۔ اور پھر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ۔ اور بیگم ہاتھ مل کر کہتی ۔ "ہائے کسے معلوم تھا کہ زمانہ یوں بدل جائے گا" ۔

اسی مکان کے چوبارے میں انکی اکلوتی بیٹی ریحانہ جسے پیار سے گھر میں ہے نا کہا جاتا تھا ۔ اکتا کر ناول کو بند کر دیتی ۔ "ہائے وقت نہیں کٹتا" کہہ کر خطرناک انداز سے کھڑکی کی طرف بڑھتی تا کہ وقت کاٹنے کی کوشش کرے ۔

ہے نا کو تانک جھانک سے خصوصی دلچسپی تھی مگر اس نے وقت کاٹنے کے لئے جملہ چیزوں کو آزما دیکھا تھا ۔ پہلے ناول پڑھنے میں وقت کاٹنے کی کوشش کی ۔ لیکن وہ تو الٹا اکساتے تھے ۔ پھر اس نے پڑوسنوں سے خوش گپیوں کو آزمایا ۔ مگر جلد ہی وہ خوش گپیاں محض گپیاں رہ جاتیں ۔ اور گول گپوں کی طرح کھوکھلی محسوس ہوتیں ۔ پھر اس نے سوئی کے کام میں وقت کاٹنے کی کوشش کی لیکن وقت کی بجائے سوئی انگلی کاٹ دیتی ۔ اور پھر اس پر پانی ڈالنے کے لئے اسے کھڑکی میں رکھی ہوئی صراحی کی طرف بھاگنا پڑتا ۔ یوں بار

بار کھڑکی کیطرف بھاگنے سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ کھڑکی میں ہی کھڑی رہے ۔ انہی وجوہات کی بنا پر اس نے وقت کاٹنے کے لئے کھڑکی کو اپنا لیا تھا ۔

اور کھڑکی میں رکھا ہی کیا تھا ۔ بس یہی نا کہ نیچے بازار چلتا تھا اور راہ گیر اسے دیکھکر ٹھٹھکتے اور اپنی چال بھول جاتے اور چلنے کی بجائے ٹھوکریں کھانا شروع کر دیتے ۔ جیسے کہ اپنی چال بھولنے سے ہو جاتا ہے ۔ اُن کی اچھی بھلی شکلیں بدل جاتیں ۔ جیسے کارٹون ہوں ۔ آنکھیں ابل آتیں ۔ گال پھول جاتے ۔ باچھیں کھل جاتیں ۔ کسی کو احساس ہوتا کہ اسکی مونچھیں گری ہوئی ہیں اور وہ انہیں مروڑنے لگتا ۔ کسی کو محسوس ہوتا کہ اسکی چھاتی اندر کو دھنسی ہوئی ہے ۔ اور وہ لقا کبوتر بن جاتا ۔ کوئی ٹائی سنوارتا ۔ کوئی گانے لگتا ۔ مختصر یہ کہ اسکے صرف کھڑکی میں جا کھڑے ہونے سے گویا نظامِ عالم ہی درہم برہم ہو جاتا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ جب نظامِ عالم ہی درہم برہم ہو جائے تو وقت کے نہ کٹنے کا سوال ہی نہیں رہتا ۔ یہ احساس کہ کھڑکی میں صرف کھڑی ہو کر وہ نظامِ عالم درہم برہم کر سکتی ہے اور اتنی بڑی ٹریفک کو کنٹرول کر سکتی ہے انسان کو زمان و مکان پر حاوی کر دیتا ہے ۔

نیچے دالان میں مرزا عبداللہ اور انکی بیگم کے باز بار "توبہ زمانہ کتنی جلدی بدل جاتا ہے" کہنے کے باوجود انکا وقت کٹنے میں نہیں آتا تھا ۔ وقت کاٹنے کے لئے انکے پاس کوئی کھڑکی بھی تو نہ تھی ۔ اور ہوتی بھی تو نظامِ عالم بدلنے کی ہر کسی میں طاقت تو نہیں ہوتی ۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر الٹا وہ جھینپ جاتے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے ۔ اِس لئے انھوں نے ایک خیالی کھڑکی بنا رکھی تھی ۔ جو انکے ماضی میں کھلتی تھی اور جس سے انکے "جب" کی روشنی اور دھوپ آتی اور انہیں گرم رکھتی ۔ لیکن جب بھی انکی توجہ "اب" کے سرد ویرانے کی طرف منعطف ہو جاتی تو انہیں دکھ ہوتا اور وہ ہاتھ مل کر کہتے "توبہ زمانہ کتنی جلدی بدل جاتا ہے" در حقیقت انہیں وقت کے متعلق شکایت نہ تھی ۔ انہیں تو شکوہ تھا کہ وہ سنہرا "جب" یوں آناً فاناً بدل گیا ۔ بات بھی صحیح تھی ۔ جب وہ کانپور کے ایک بہت بڑے سوداگر تھے ۔ انکی موٹر پارٹس کی دوکان شہر بھر میں مشہور

تھی ۔ برادری میں انکی حیثیت ایسی تھی کہ کوئی بھی کسی معاملے میں انہیں نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا ۔ چاہے بات شادی بیاہ کے متعلق ہو یا لین دین کے قضیے کے متعلق ۔ فیصلے کے لئے لوگ چپ چاپ مرزا عبداللہ کے سر کی طرف دیکھتے کہ وہ اثبات میں ہلتا ہے یا نفی میں ۔ کیونکہ مرزا صاحب کو زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہ تھی ۔ مختصر یہ کہ جب انکے سر ہلانے میں وہی طاقت تھی جو اب ہے نا کے کھڑکی میں کھڑے ہونے میں تھی ۔

مرزا عبداللہ کا "اب" حقیقتاً ایک سرد ویرانے سے کم نہ تھا ۔ انہیں تقسیم کے ایک سال بعد اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا ۔ اس لئے نہیں کہ اُنہیں ترکِ وطن سے دلچسپی تھی بلکہ اس لئے کہ شورش پسندوں نے انکی دوکان کو آگ لگا دی ۔ اسطرح انکی تمام تر پونجی ملبے کا ڈھیر ہو کر رہ گئی تھی ۔ اسکے علاوہ انکا گھر لوٹ لیا گیا تھا ۔ اسطرح وہ پاکستان آنے پر مجبور کر دئے گئے تھے ۔

پاکستان میں پہنچ کر انہوں نے اپنی گذشتہ عظمت کے سارٹیفکیٹ پیش کئے ۔ اپنی جائداد کی فہرستیں مرتب کیں ۔ در آمد بر آمد کے نقشے دکھائے لیکن بات نہ بنی اور وہ ایک معمولی سے رہائشی مکان کے علاوہ کوئی خصوصی الاٹ منٹ حاصل نہ کر سکے ۔ حتیٰ کہ جو کچھ تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور گھر کی چیزیں فروخت کرنا پڑیں آخر وہ مایوس ہو گئے اور مجبوراً انہیں ایک موٹر سٹور میں ایک معمولی سی آسامی پر کام کرنا پڑا ۔

میاں کی نسبت بیگم کے لئے یہ تبدیلی زیادہ ناقابل برداشت تھی ۔ میاں تو جب بھی لکھ پتی ہونے کے باوجود موٹے کپڑے پہنا کرتے تھے اور پانچوں وقت کی نماز ادا کیا کرتے تھے اور چلتے تو گردن جھکا کر ۔ انکی امارت اور عظمت کا اظہار صرف انکی کھنکار سے ہوتا تھا ۔

"اہم اہم" وہ دوکان میں داخل ہوتے وقت کھنکارتے ۔ انکی کھنکار سن کر جملہ ملازمین اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کھڑے ہو جاتے ۔ اور پھر دن بھر کام یوں آپ ہی آپ چلتا جیسے کسی نے مشین کو گریز لگا دی ہو ۔ گھر میں بھی انکی کھنکار فوری نتائج پیدا کیا کرتی تھی ۔ اگرچہ اسکا بیگم اور بیٹی پر

مختلف اثر ہوتا تھا ۔

میاں کی آمد کا اعلان سُن کر بیگم کے مُنہ پر خوشی کی ایک کرن طلوع ہو جاتی ۔ گالوں پر دو بیر بہوٹیاں رینگنے لگتیں ۔ اور دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانوں پر گر جاتا اور گردن کا ہار اور قمیض کا فیتوں والا کالر تنگے ہو جاتے تھے ۔ اسکے برعکس باپ کی کھنکار سُن کر ہے نا کے منہ پر کھیلتی ہوئی خوشی کی کرن غروب ہو جاتی ۔ گالوں پر بیٹھی ہوئی بیر بہوٹیاں نہ جانے کہاں چھپ جاتیں ۔ اور وہ شانوں پر ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو سر اور پیشانی پر لپیٹ کر یوں بیٹھ جاتی جیسے مصالحے کی بنی ہوئی گڑیا ہو ۔

ان دنوں میاں کے برعکس بیگم نہ تو نماز پڑھتی تھی اور نہ گردن جھکا کر چلتی تھی ۔ گردن تو بلکہ کچھ زیادہ ہی اکڑی رہتی تھی اور کپڑوں کے متعلق تو کچھ پوچھئے ہی نہیں جتنے میاں کے سادے ہوتے تھے اتنے ہی بیگم کے بھڑکیلے ۔ جس قدر میاں کم گو تھے اسی قدر بیگم متکلم تھیں ۔ بات بھی ٹھیک تھی ۔ میاں کی حکومت تو صرف ملازمین اور برادری والوں پر چلتی تھی ۔ میاں کا وہی سر جس کی جنبش پر باہر فیصلے ہوتے تھے گھر میں آکر بیگم کے سامنے جھک جاتا تھا ۔

ترک وطن کے بعد کچھ دیر تک تو بیگم اسی امید میں رہی کہ ابھی کوئی معجزہ رونما ہو گا اور اسکی گذشتہ عظمت لوٹ آئیگی ۔ پھر مایوس ہو کر اسکی گردن جھک گئی اور وہ ہاتھ میں تسبیح پکڑ کر جائے نماز پر جا بیٹھی ۔

زمانہ بدلنے کی وجہ سے سب سے زیادہ تبدیلی ہے نا کے متعلق رونما ہوئی ۔ اگرچہ ہے نا کو احساس نہیں ہوا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے ۔ کیونکہ اسکے لئے تو زندگی اب بھی بے حد دلچسپ تھی ۔

چھ سال پہلے کانپور میں وہ ایک لکھ پتی کی اکلوتی بیٹی تھی اور ایک لکھ پتی کے گھر کی عزّت تھی ۔ یعنی گھر کی عزّت کا تمام تر دارومدار اسکی حرکات و سکنات پر تھا ۔ اگر اسکے سر سے دوپٹہ سرک جاتا تو گھر کی عزت خطرے میں پڑ جاتی اور

ماں سر سے ڈھلکے ہوئے دوپٹے سمیت اس پر جھپٹتی ۔ "اے ہے بیٹی کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا ۔ گھر کی عزت کا کچھ خیال کر" ۔ اگر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی تو گھر کی عزت کو خطرہ لاحق ہو جاتا اور باپ کی "اہم ۔۔۔" سے میز پر پڑا ہوا گلاس جل ترنگ کی طرح بجنے لگتا ۔ اگر وہ بازار یا گلی میں برقع اٹھا لیتی تو گھر کی عزّت تباہ ہو جاتی ۔ بیچاری کو گھر کی عزّت سے جان بچانی مشکل ہو گئی تھی ۔

گھر کی عزت تو وہ واقعی تھی ۔ ان دنوں بڑے بڑے معزز خاندانوں میں لوگ زیرِ لب اسکا نام لیا کرتے تھے ۔ ہر کسی کی آرزو تھی کہ مرزا صاحب کی بیٹی اسکی بہو بنے ۔ اگرچہ پیغام بھیجنے کی کسی کو جرأت نہ پڑتی تھی ۔ ادھر اپنے گھر میں اسکے بیاہ کا کبھی تذکرہ ہی نہیں ہوا تھا ۔ اتنی جلدی کی ضرورت ہی کیا تھی ۔ جب بہت سے امیدوار ہوں تو جلدی کی ضرورت نہیں ہوتی ۔

گھر کی عزّت ہونے کا احساس اگرچہ بڑی اہمیت کا باعث ہوتا ہے ۔ لیکن اسکے ساتھ اتنی پابندیاں تھیں جو اسکی جان کا روگ بنی ہوئی تھیں ۔ یہ درست تھا کہ ان دنوں ریحانہ کو پہننے کے لئے خوبصورت کپڑے دستیاب تھے اور کھانے کو لذیذ کھانے ملتے تھے ۔ مگر کھانے کا کیا ہے کھا لیا جائے تو اچھے اور برے میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا ۔ البتہ خوبصورت کپڑے اسے بڑے اچھے لگتے تھے ۔ مگر انہیں پہن کر اندر بیٹھ رہنا ۔ ایسے کپڑوں کا کیا فائدہ ۔ اور دوپٹہ اگر سر پر ماتھے تک لپیٹ لیا جائے تو پھر چاہے وہ ریشمی ہوں یا سادہ دونوں میں چنداں فرق نہیں رہتا ۔ اس نے کئی بار آزما دیکھا تھا کہ سادہ کپڑے بھی اثر پیدا کرنے میں کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے ۔ وہ تو جینا چاہتی تھی ۔ اور عنفوانِ شباب میں جینا اچھے کھانوں اور کپڑوں کا محتاج نہیں ہوتا ۔ ہے نا کو تو سانس لینے میں بھی لذت حاصل ہوتی تھی ۔ چلنے میں لطف آتا تھا ۔ دوپٹہ گرانے اور اسے سنبھالنے میں راحت محسوس ہوتی تھی اور آنکھوں میں مسکرانے سے تو نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ اس لئے اسے ان بندشوں پر غصہ آتا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ اگر وہ گھر کی عزّت نہ ہوتی تو کتنا مزا ہوتا ۔

پاکستان میں پہنچنے کے بعد جب تک ریحانہ کے ماں باپ کو اس معجزے

کے رونما ہونے کی امید رہی ۔ اسپر وہ پرانی پابندیاں عائد رہیں ۔ اگرچہ اب وہ لکھ پتّی کی بیٹی نہ تھی ۔ اب لوگ مرزا عبداللہ کے سر کی جنبش کی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ چاہے وہ اثبات میں ہلتا یا نفی میں ۔ بلکہ اب تو لوگ انہیں عبداللہ کہتے تھے ۔ خالی عبداللہ ۔

پھر جب وہ امید کی کرن گُل ہو گئی تو ایک روز جب وہ کھڑکی میں کھڑی تھی تو ماں حسب معمول آگ بگولہ ہو کر اس پر جھپٹی ۔ "بیٹی تجھے گھر کی ۔۔۔۔۔" دفعتاً وہ رک گئی ۔ نہ جانے گھر کی کس بیبسی نے چاروں کونوں سے نکل کر اس سے کیا کہا ۔ گھبرا کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر اسکی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک آیا اور وہ سر جھکائے جائے نماز کی طرف بھاگی ۔ اسکے بعد ماں نے کبھی اسے کچھ کہنے کی کوشش نہ کی ۔ ایسے موقع پر کچھ کہنے کی بجائے وہ منہ موڑ لیتی ۔

انہی دنوں دونوں میاں بیوی اکثر اکیلے بیٹھ کر ریحانہ کی باتیں کیا کرتے ۔ ریحانہ نے انکی باتیں نہ سنی تھیں۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ اسی کی باتیں کرتے ہیں ۔ وہ بار بار اس کی طرف دیکھتے اور پھر ٹھنڈی آہیں بھرتے اور جب کبھی وہ قریب جاتی تو وہ خاموش ہو جاتے اور پھر یوں پاؤں سے سر تک اُسے دیکھتے جیسے بہت ہی بڑی ہو گئی ہو ۔ بڑی تو واقعی ہو چکی تھی مگر ایسا بھی کیا کہ اس بات پر لمبی آہیں بھری جائیں ۔ آخر سبھی لڑکیاں بڑی ہو جایا کرتی ہیں ۔ اسمیں اچنبھے کی کیا بات تھی ۔ اسکی طرف دیکھکر یوں مظلوم صورت بنا لینا اور آہیں بھرنا جیسے وہ بڑی مصیبت ہو جو ان کے سر آ پڑی ہو ۔

پھر ماں کے بعد اس روز باپ اُسے کھڑکی میں کھڑی دیکھکر نہ جانے کیا کہنے والا تھا کہ بیگم جائے نماز سے چیل کی طرح ان پر جھپٹی اور پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر دالان میں لے گئی اور دیر تک اُسکی غصے بھری آواز سنائی دیتی رہی تھی ۔ وہ انہیں ڈانٹ رہی تھی ۔ اب اسے کیوں تنگ کر رہے ہو کس برتے پر ۔ اب کیا کوئی صورت ہے کوئی امید ہے ۔ پھر کیوں اُسے ستا رہے ہو ۔ دیر تک وہ یوں ہی بولتی رہی تھی ۔ لیکن ریحانہ کو اچھی طرح سمجھ میں نہ آیا تھا وہ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں ۔ اس روز کے بعد اسکے ابّا کی گردن بالکل ہی لٹک گئی ۔ انکی وہ

کھنکار تو عرصہ دراز سے ختم ہو چکی تھی ۔

پھر ایک روز ماں نے اُسے بلا کر برسبیل تذکرہ کہا ۔ بیٹی تم چوبارے کو اپنا کمرہ بنا لو ۔ یہاں کوٹھڑی میں رستہ ہے اور تم نے پڑھنا بھی ہوا ۔ یہاں تمہاری پڑھائی میں حرج ہوتا ہے ۔ بے نا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ۔ چوبارے میں تو ایک نہیں چار کھڑکیاں تھیں اور وہ چاروں بازار میں کھلتی تھیں اور پھر پڑھائی میں حرج ۔ امّی تو ہمیشہ سے پڑھائی کے خلاف رہی تھی ۔ ان دنوں بھی وہ اسکے پڑھنے کے خلاف تھی ۔ جب وہ باقاعدہ سکول میں پڑھتی تھی ۔ اور اب ۔ اب تو اسکی پڑھائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ دسویں کا پرائیویٹ امتحان دینا تو اب ایک بہانہ ہی رہ گیا تھا ۔ وہ کتابیں تو پرانی ہو چکی تھیں ۔ اور نئی کتابیں خریدنے کی استطاعت ہی کسے تھی ۔

چوبارے میں ٹھکانہ کر لینے کے بعد اسکے شکوک از سر نو عود کر آئے ۔ آخر اسے چوبارے میں بھیجنے سے اُن کا مقصد کیا تھا ۔ کئی ایک دن انہی شکوک کی وجہ سے وہ کھڑکی میں بھی کھڑی نہ ہوئی تھی ۔ بلکہ اسی بات کی وجہ سے اُسے کھڑکی میں کھڑے ہونے کے خلاف بغض ہو گیا تھا ۔ اُسے غصّہ آتا ۔ کیوں جی کیا اب میں گھر کی عزّت نہیں رہی ۔ کیا لکھ پتی کی بیٹی ہی گھر کی عزّت ہوتی ہے ۔ کیا غربت میں گھر کی عزّت نہیں رہتی ۔ تو پھر اب وہ مجھے کیوں نہیں کچھ کہتے ۔ اب یہ آزادی کیوں ۔ لیکن آخر وہ لڑکی تھی اور جوان لڑکیوں کا کھڑکیوں کے خلاف غصہ دیر تک نہیں رہتا ۔ آپ جانتے ہیں کھڑکیاں اپنا وجود منوائے بغیر نہیں رہتیں ۔ اور عنفوانِ شباب میں ان سے سرکشی نہیں ہو سکتی ۔ تو مختصر یہ کہ چند ہی دنوں کے بعد ان کھڑکیوں نے اسے رام کر لیا ۔

ویسے ان کھڑکیوں میں رکھا ہی کیا تھا ان دنوں ۔ ٹریفک کو کنٹرول کرنا تو اس نے کافی دیر کے بعد سیکھا تھا ۔ ان دنوں تو راہ گیروں کے قافلے کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا ۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ کھڑکی میں کھڑے ہونے سے اسکا مقصد کیا ہے ۔ اسے خیال بھی نہ تھا کہ جلد ہی وہ وہاں کھڑی ہو کر ٹریفک کو کنٹرول کرنا سیکھ جائیگی ۔ ان دنوں تو اسکا مطلب صرف وقت کاٹنا تھا ۔ اب

اگر لوگ چلنے کی بجائے ٹھوکریں کھانے کو ترجیح دیتے ہوں تو اسمیں اسکا کیا قصور ۔ اور جب لوگ خوامخواہ ٹھوکریں کھانے لگیں تو انہیں دیکھکر کوئی مسکرائے نہ تو کیا رو دے ۔ وہ ٹھوکریں کھانے والے تو خیر ٹھوکریں کھا کر چلے جاتے تھے مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ پاس ہی ملحقہ چوبارے میں جو بازار میں کچھ بڑھ کر بنا ہوا تھا ۔ کوئی بیچارہ بیٹھ کر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے ۔

وہ لڑکا اونچا لمبا اور بھرے جسم کا ہونے کے باوجود یوں معصوم اور بے ضرر دکھائی دیتا تھا اور وہ یوں چھپ چھپ کر اُسے دیکھا کرتا تھا کہ جب ریحانہ نے پہلی مرتبہ اُسے دیکھا تو ایک ساعت کے لئے وہ سمجھی کہ گلیکسو فوڈ کا اشتہار لگا ہے ۔ چار ایک دن کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ واقعی وہ گلیکسو بے بی ہے ۔ اسی لئے تو اس پر ابھی تک کھڑکی میں آنے کی بندش عائد ہے ۔ جس سے وہ خود آزاد ہو چکی تھی ۔ اسی لئے ہے نا نے اسے کبھی درخوراعتنا نہ سمجھا تھا ۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یوں چھپ چھپ کر دیکھنے والے معصوم صورت بڑے خطرناک ہوتے ہیں ۔ کیونکہ وہ لسوڑیوں کی طرح چپک جاتے ہیں اور پھر انہیں جھٹک کر دامن سے اتارنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

پھر وہ بھی اسکی طرف دیکھنے لگی ۔ لیکن یہ دیکھنا درحقیقت دیکھنا نہ تھا کیونکہ وہ اسے دیکھے بغیر دکھائی دئے جاتا تھا ۔ وہ اسے یوں دیکھتی تھی جیسے آپ راہ چلتے ہوئے دائیں بائیں کی طرف دیکھے بغیر چلے جاتے ہیں ۔ مگر دائیں بائیں کی دوکانیں مبہم طور پر آپ کو دکھائی دیتی رہتی ہیں ۔

ہے نا کو اس گلیکسو بے بی کو دیکھنے سے چنداں دلچسپی نہ تھی ۔ ہوتی بھی کیسے وہ تو اسے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے مصالحے سے بنا ہوا گُڈّا ہو ۔

لیکن جب کوئی گلیکسو بے بی صبح و شام بے بسی سے آپکی طرف دیکھے تو ترس آنے لگتا ہے ۔ ریحانہ کی اس بے بی سے دلچسپی درحقیقت محض ترس کے احساس پر مبنی تھی ۔

پھر ایک روز جب رات کے وقت وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی تو دھم سے ایک پتھر کھڑکی کی راہ سے اندر آگیا ۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی ۔ بتی جلائی ۔ روشنی

میں اس نے دیکھا کہ کاغذ کا ایک بڑا سا گولا فرش پر پڑا ہے ۔ پہلے تو اس نے پاؤں سے اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا ۔ پھر تاگا توڑ کر اُسے کھولا ۔ وہ پہلا محبت نامہ تھا جو اُس نے موصول کیا تھا ۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ خط ایک موٹا سا گیلا آنسو ہو ۔ خط پڑھکر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ۔ نیچے بازار میں کوئی نہ تھا ۔ پنواڑی کی دوکان پر صرف ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا ۔ پھر دفعتاً اسکی نگاہ ملحقہ چوبارے پر جا پڑی ۔ ٹیبل لیمپ کی مدھم روشنی میں گلیکسو بے بی یوں دانت نکال رہا تھا جیسے اس نے دودھ پینا چھوڑ کر کھانا شروع کر دیا ہو اور دانت دکھا کر وہ اس تبدیلی کا ثبوت دے رہا ہو ۔

پہلی مرتبہ خط پڑھ کر وہ ہنس پڑی تھی ۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اسکا پھر جی چاہا کہ ان مضحکہ خیز باتوں پر ہنسے اور اُس نے وہ خط پھر سے پڑھا ۔ محبّت بھرے خطوں کو آپ جانتے ہی ہیں ۔ چاہے کوئی ان پر ہنسے یا غصے سے آگ بھبھوکا ہو جائے انکے سحر سے بچ نکلنا مشکل ہوتا ہے ۔ محبت بھرے خطوط مکڑی کی طرح جال بنتے رہتے ہیں ۔ چاہے اُن پر کوئی ہنستا ہی رہے ۔ پھر جب ان کا جال مضبوط ہو جاتا ہے تو وہ رسی کھینچ لیتے ہیں اور ہنسی آنسوؤں میں بدل جاتی ہے ۔ ریحانہ ان محبت ناموں پر ہنستی رہی لیکن ساتھ ہی رات کے وقت ہر آہٹ پر چونک کر فرش پر کاغذ کے گولوں کی تلاش بھی کرتی رہی ۔

ہر تازہ خط پڑھنے کے بعد اسکی ہنسی میں تمسخر کا عنصر کم تر ہو جاتا تھا اور خالص ہنسی ہونٹوں سے نکل کر جسم کے بند بند میں بھر جاتی اور اسکا جی چاہتا کہ سارے گھر میں ناچتی پھرے ۔

ایک روز جب وہ ایک تازہ خط کے زیرِ اثر ناچتے ناچتے دالان سے ملحقہ کمرے میں پہنچی تو امّی کی بات سُن کر اسکے اوسان خطا ہو گئے ۔ "دیکھنے میں تو لڑکا شریف معلوم ہوتا ہے مگر ـ ـ ـ ـ " وہ خاموش ہو گئی ۔ "کالج میں پڑھتا ہے ۔ باپ زمیندار ہے" ۔ اسکے ابا کہہ رہے تھے ۔

"کھاتے پیتے ہیں نا" ۔

"ہاں جائداد والے ہیں" ۔

"اچھا ۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔۔"

"ہے نا کی ماں" اسکے ابا نے پوچھا ۔ "آخر بات کیا ہے"۔

"بات کیا ہونی تھی ویسے ہی پوچھا تھا ۔ پڑوسیوں کے متعلق معلوم کر لینا اچھا ہی ہوتا ہے"۔

وہ خاموش ہو گئے ۔ ریحانہ سوچ میں پڑ گئی ۔ وہ کس کی بات کر رہے تھے ۔ وہ شریف پڑوسی کون تھا ۔ اس روز دیر تک وہ اسی ادھیڑبُن میں لگی رہی لیکن اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔

پھر اسے خوامخواہ شک پڑنے لگے ۔ رات کو لیٹے لیٹے وہ محسوس کرتی جیسے کوئی دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ رہا ہو ۔ کسی وقت دروازے کے شیشے کے پیچھے کوئی کھڑا ہوا دکھائی دیتا ۔ شاید امّی چھپ کر اُسے دیکھ رہی ہے ۔ اُسے خیال آتا ۔ دو ایک مرتبہ تو اُس نے دروازہ کھول کر دیکھا بھی تھا مگر وہاں کوئی نہ تھا اور وہ اپنے شکوک پر ہنس پڑی تھی ۔

اسے اس قسم کے شکوک کی طرف پوری توجہ دینے کی فرصت ہی کب تھی ۔ چاہے وہ اس کاغذ کے گولوں کے کھیل پر ہنسا ہی کرتی تھی ۔ پھر بھی وہ کھیل اسے رات دن مصروف رکھتا تھا ۔

پہلے تو اپنے خطوط میں گلیکسو بے بی رو رو کر بازو اٹھاتا رہا ۔ پھر دفعتاً اس نے رونا چھوڑ کر دھمکیاں دینا شروع کر دیا ۔ "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا" ۔ اس دھمکی پر وہ اور بھی ہنسی ۔ زندہ نہیں رہ سکتے تو میں کیا کروں ۔ اسکے بعد جلد ہی معاملہ سنگین ہوگیا اور وہ ڈر گئی ۔ لکھا تھا ۔ "میں کچھ کھا کر مر جاؤں گا" ۔ ریحانہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر مرجانے کی بات ہی کیا تھی ۔ خواہ مخواہ مرنے پر مچل جانا ۔

پھر اس نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی ایک تاریخ مقرر کر دی ۔ "اگر تم آج رات میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہو گی تو کل مجھے زندہ نہ پاؤ گی ۔ میں رات کے دو بجے تک تمہارے گھر کے دروازے پر تمہارا انتظار کرونگا" ۔

خط پڑھتے ہی اسکے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

کیا کرے ۔ کوئی سہیلی بھی تو نہ تھی ۔ جس سے وہ دل کی بات کہتی ۔ کیا وہ چلی جائے گھر چھوڑ کر چلی جائے ۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا تھا ۔ ایک اجنبی کے ساتھ چلے جاناماں باپ کو چھوڑ کر چلے جانا ۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ۔ پھر اسے خیال آتا کہ کل وہ مرا پڑا ہو گا ۔ اور اسکے سامنے اسکی لاش آ جاتی ۔ "بیچارا" ۔ اسکے منہ سے نکل جاتا ۔ نہیں نہیں وہ نہیں مرے گا ۔ خواہ مخواہ ۔ میں اسے مرنے نہ دوں گی ۔ لیکن لیکن اُسے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ کس جھمیلے میں ڈالدیا تھا اُس نے خواہ مخواہ ۔

سارا دن وہ مضطرب رہی تھی ۔ شام کے وقت اس نے صندوق کھولا اور اپنی ایک ایک چیز نکال کر دیکھی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اُس میں تھا ہی کیا ۔ صرف چکن ساٹن کی سُرخ قمیض اور وہ خطوط جو اس نے ریشمیں رومال میں باندھ کر رکھے ہوئے تھے ۔ اُس نے ان جانے میں وہ خطوط اور قمیض نکال کر ایک اخبار میں لپیٹ لئے تھے اور پھر چارپائی پر لیٹ گئی تھی ۔

ٹن ۔۔۔۔ گھڑی نے ساڑھے گیارہ بجائے ۔

وہ چونک پڑی ۔ ساڑھے گیارہ ۔ پارسل کی طرف دیکھکر وہ گھبرا گئی ۔ معاً اسے خیال آیا کہ کوئی نیچے صدر دروازے پر کھڑا اُس کا انتظار کر رہا ہے ۔ اس خیال پر وہ از سرِ نو گھبرا گئی ۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا ۔ کچھ بھی نہیں ۔ کچھ بھی نہیں ۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی ۔ ہونا کیا ہے ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ اور وہ لیٹ گئی ۔ اسکی آنکھوں کے سامنے عجیب تصویریں متحرک تھیں ۔ ایک طرف ماں کھڑی پیار سے اسے دیکھ رہی تھی ۔ بیٹی تم جا رہی ہو ۔ دوسری طرف ایک لاش پڑی تھی اور مردہ اسے کہہ رہا تھا میں نے کہا نہ تھا تم مجھے زندہ نہ پاؤ گی ۔

وہ گھبرا کر اٹھی ۔ کیا کروں میں ۔ وہ سوچنے لگی ۔ کیا کروں ۔ دفعتاً اُسے خیال آیا نیچے چل کر دیکھوں تو کیا امی سو رہی ہے ۔ نہ جانے کیوں اس نے محسوس کیا جیسے وہ امی کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو ۔

دالان سے ملحقہ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دیکھا کہ درمیانی دروازہ کھُلا ہے ۔ ماں جائے نماز پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے ۔ نہ جانے امّی کیا پڑھتی رہتی ہے ۔ نہ جانے کیا دعائیں مانگتی رہتی ہے ۔ وہ سوچنے لگی ۔

عین اسوقت ماں نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک دعا مانگتی رہی ۔ ریحانہ واپس آنے کے لئے تیار تھی ۔ جب ماں آپ ہی بآواز بلند بولنے لگی ۔ یااللہ تو ہی اسکا محافظ ہے ۔ یا اللہ تیرے سوا اب کوئی آسرا نہیں ۔ کوئی امید نہیں ۔ تو ہی میری بچّی کے مستقبل کو سنوارنے والا ہے ۔ یااللہ میری اور کوئی خواہش نہیں ۔ میری بچّی ۔ میری بچّی" ۔ ماں کی ہچکی نکل گئی ۔

ریحانہ کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ۔ ماں کو اُس سے اِس قدر محبت تھی ۔ اس قدر ۔ وہ اندھادھند ماں کی طرف بھاگی اور اسکی گود میں گر کر رونے لگی ۔ امّی ۔ امّی ۔ مجھے معاف کر دو امّی ۔ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گی ۔ کبھی نہ جاؤں گی ۔

"ہائیں" ۔ بڑھیا نے مڑ کر اسکی طرف دیکھا ۔ "کیا کہا تُو نے" ۔

بڑھیا کا چہرا حیرانی اور دُکھ سے بھیانک ہو رہا تھا ۔

............○............

جادو گرنی

موسم سرما کی کہر بار صبح کے دھندلکے میں گاڑی فرّاٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی ۔ پٹڑی کی دونوں جانب سر سبز کھیت دھند کی چادر اوڑھے پڑے تھے ۔ ریل کے ڈبے میں چند ایک مسافر لحافوں اور کمبلوں میں گٹھڑیوں کی طرح لپٹے چپ چاپ اونگھ رہے تھے ۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھا اپنے خیالات میں کھویا ہؤا تھا ۔ ساجد کا وہ تار جس کی وجہ سے میں لاہور جا رہا تھا ۔ ابھی تک میری واسکٹ کی جیب میں تھا ۔ تار کا مضمون کس قدر مختصر اور مبہم تھا ۔ "فوراً پہنچو ، معاملہ اہم ہے ۔" اِس پیغام کے ابہام اور اختصار کی وجہ سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا ۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ جانے ساجد پر کیا افتاد آ پڑی ہے ۔

سام پور کے مختصر سے گاؤں میں ساجد کے تار نے ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا جب بوڑھا ڈاکیہ اپنے جھُریوں دار ہاتھ میں تار تھامے ہوئے بڑے بازار میں پہنچا تو سب کی نگاہیں اس بادامی لفافے پر جم کر رہ گئیں ۔ اور تمام چوک میں سناٹا سا چھا گیا ۔ پھر چودھری وڈھیرا چلّا کر بولا ۔ "بابا رحیما اللہ ہم سب پر رحم کرے ۔ یہ کیا مصیبت ہے ۔ کون مر گیا ہے ۔ یہ بم کس کے سر پر گراؤ گے ۔" چودھری وڈھیرا نے ایک ہی سانس میں کئی ایک سوالات کر دیئے اور بابا رحیما چُپ چاپ لفافے کو گھورتا رہا مگر منہ سے کچھ نہ بولا ۔

چودھری وڈھیرا کے مہرِ سکوت توڑنے پر سبھی کچھ نہ کچھ بولنے لگے اور تار کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں پھیل گئی ۔ عورتیں گھروں سے باہر نکل کر دہلیزوں پر آکھڑی ہوئیں ۔ بہن سنا تُو نے تار آیا ہے ۔ ہائے میں مر گئی تار آیا ہے ؟ محلے کی چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا اور پھر دوپٹہ سنبھال کر چل پڑی ۔ اے سُنا تم نے ۔

اِس طرح یہ خبر رحیما کے آنے سے پہلے ہی ہمارے گھر پہنچ گئی اور جب بابا رحیما ہماری گلی میں داخل ہُوا تو میں پہلے ہی دروازے پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا ۔

بابا رحیما کے ساتھ گاؤں کے بہت سے لوگ تھے ۔ تار کھولنے پر جب انہیں معلوم ہُوا کہ کوئی بھی نہیں مرا تو وہ مایوس ہو کر چلے گئے ۔ لیکن تار کے مضمون کو پڑھ کر میں فکر میں پڑ گیا کسی کی بیماری یا موت کی خبر مجھے اِس قدر پریشان نہ کر سکتی تھی ۔ جس قدر انجانے خطرے کا احساس اور پھر خطرہ بھی وہ جس کی نوعیت کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو ۔ میں گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ آخر کیا ہو سکتا ہے جسے ساجد نے اس قدر اہم سمجھا ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ بیمار نہیں ۔ صحت کے متعلق کچھ ہوتا تو وہ اس کی وضاحت کر دیتا ۔ کسی جھمیلے میں نہ پڑ گیا ہو ۔ لیکن نہیں ساجد سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی وہ طبعاً اِس بات کا اہل نہیں ۔ پھر ؟ جوں جوں میں سوچتا بات اور بھی پُراسرار ہوتی جاتی ۔ حتّٰی کہ میں گھبرا گیا اور پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے میں نے بات کا رُخ بدل دیا ۔ کالج میں کوئی چھوٹا موٹا واقعہ ہوگیا ہو گا ۔ جس کی وجہ سے ساجد نے گھبرا کر تار دیدیا ہے ۔ اِس خیال سے مجھے قدرے اطمینان ہوا اور مَیں نے بڑھ کر ساجد کے والدین کو تسلی دینی شروع کی ۔ جو مجھ سے کہیں زیادہ پریشان تھے ۔ ساجد کے والد عجیب قسم کے وہم کھا رہے تھے ۔ اور اس کی والدہ رو رہی تھی جیسے جیسے مَیں ان کو تسلی دیتا ۔ ویسے ویسے خود میرے دل میں نئے نئے خدشات پیدا ہو جاتے اور مجھے بے چین کر دیتے ۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی میں اسی سوچ میں کھویا ہُوا تھا ۔ لیکن جتنا بھی میں سوچتا بات اُلجھتی جاتی ۔ اِن دنوں ساجد تھرڈایر میں تھا ۔ اس کی عمر انیس کے لگ بھگ ہوگی ۔ اگرچہ اس کے بھرے ہُوئے جسم کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا تھا ۔ جیسے وہ عمر میں بڑا ہو ۔ وہ طبعاً شرمیلا اور ڈرپوک تھا اِس لئے اس کا کالج کے لڑکوں کے ساتھ مل کر کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کا امکان قرینِ قیاس نہ تھا ۔

گاڑی سے اُتر کر میں ٹانگے میں سوار ہوگیا اور پیرروڈ پر کالج کے گردو نواح

میں فرنڈز لاج تلاش کرنے لگا ۔ جہاں ساجد اپنے چند ایک دوستوں کے ساتھ رہتا تھا ۔

فرنڈز لاج کو تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دقّت نہ ہوئی ۔ چونکہ اس کی عمارت کالج کی گراؤنڈ ہی میں واقع تھی ۔ ۹ بجے کے قریب میں لاج میں پہنچ گیا ۔ لاج ایک مختصر سی چار منزلہ عمارت تھی ۔ جس کی زیریں منزل میں دوکانیں اور سٹور تھے ۔ دوسری اور تیسری منزل میں لڑکے رہتے تھے ۔ ایک تنگ سے زینے سے ہوتے ہُوئے میں باورچی خانے میں پہنچ گیا ۔ جہاں ایک بوڑھا نوکر چولھے کے سامنے بیٹھا اونگھ رہا تھا ۔ اس نے اپنے رعشہ زدہ ہاتھ راکھ کے ڈھیر میں چند سلگتی ہوئی چنگاریوں پر پھیلا رکھے تھے ۔

"السلام علیکم ۔" میں نے چلّا کر کہا ۔ "بابا ساجد کہاں ملیں گے ۔"

بوڑھے نے سر اُٹھایا اور آنکھیں جھپکانے لگا ۔ اس کے ماتھے کی تیوریاں سمٹیں موٹے موٹے لٹکتے ہوئے ہونٹوں پر ایک احمقانہ مسکراہٹ نمودار ہونے لگی ۔ "ج ۔ ج ، جناب" وہ گھبرا کر بولا "بابو جی تو خالج گئے ہیں ۔"

"کب آئیں گے ؟"

"آتے جاتے ہی رہتے ہیں ، وہ سب یہ پاس ہی خالج ہے ۔ ابھی آجائیں یا گھنٹے دو گھنٹے کے بعد کیا معلوم ۔"

مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر کہنے لگا ۔ "بیٹھ جائیں آپ میں کرسی لائے دیتا ہوں ۔" لیکن اس کے باوجود اُس نے اُٹھنے کی کوشش نہ کی ۔ بلکہ ویسے ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا ۔ "یہاں نہیں تو کوٹھے پر جا بیٹھئے دھوپ میں ۔ سب بابو کوٹھے پر جا کر ہی بیٹھتے ہیں ۔"

"لاج میں کوئی ہے بھی اِس وقت ۔"

"معلوم نہیں" ۔ اس نے نہایت بے تعلقی سے کہا اور پھر گھٹنوں میں سر دے کر یوں بیٹھ گیا جیسے کچھ اور کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ ہو ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بوڑھے سے ساجد کے متعلق جملہ معلومات حاصل کروں ۔ وہ بیمار تو

نہیں ۔ پریشان تو نہیں ۔ لیکن اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بے حسی اور اس کے یوں آنکھیں جھپکانے اور کھوئی کھوئی نظروں سے گھورنے سے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ۔ اس سے پوچھنے کا کیا فائدہ ۔ مَیں نے سوچا وہ بیچارا تو خُود کھویا ہوا نظر آتا ہے ۔ وہ میری تسلی کیا کر سکے گا ۔ مَیں نے باورچیخانے سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔ کمروں کے تمام دروازے مقفّل تھے اور لاج سنسنان پڑا تھا ۔ یہ دیکھ کر بادلِ ناخواستہ میں زینے پر چڑھنے لگا اور چھت پر جا پہنچا ۔

کوٹھے پر چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پردے تھے ۔ شمال کی طرف ایک مختصر سی برساتی بنی تھی ۔ جس کی تین دیواریں تھیں ۔ اور گلی کی طرف ایک کھڑکی کھلتی تھی ۔

کوٹھے پر کوئی نہ تھا فقط دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور ایک پُرانی میز پڑی تھی ۔ کرسیوں کو دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا ۔ ظاہر تھا کہ لاج والے آکر دھوپ میں بیٹھنے کے عادی تھے ۔ وہ بڈھا ٹھیک ہی کہتا تھا ۔ مَیں نے سوچا ۔

وقت کاٹنے کے خیال سے میں نے گردونواح کا جائزہ لینا شروع کر دیا ۔ لاج کی عمارت کا عقبی حِصہ کالج کی گراؤنڈ کے عین ملحق تھا ۔ چھت سے کالج کی وسیع عمارات اور میدان کے سوا کچھ اور دکھائی نہ دیتا تھا ۔ میدان اور برآمدوں میں لڑکوں کی ٹولیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں ۔ اُن کے قہقہوں اور نعروں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں ۔ برآمدے کی پرلی جانب زینے کے پاس لڑکے قطار بنائے کھڑے تھے ۔ کالج کی عمارت سے پرے بورڈنگ کے برآمدے میں چند لڑکے احساسِ فراغت سے یُوں کھڑے تھے جیسے زندگی کی تگ و دو سے اُنہیں کوئی تعلق نہ ہو ۔ قریب ہی جمنیزیم میں چند ایک جھولا جھول رہے تھے ۔ کالج کے منظر سے اکتا کر مَیں برساتی میں داخل ہوگیا ۔ اور شمالی دیوار کی کھڑکی کھول کر کھڑا ہوگیا ۔

اُس طرف منظر قطعی طور پر مختلف تھا ۔ چھوٹے بڑے اُونچے نیچے مکانات یہاں وہاں کھڑے تھے ۔ چھتیں عورتوں اور بچّوں سے بھری ہوئی تھیں ۔ کوئی بال سکھا رہی تھی ۔ کوئی کپڑے دھو رہی تھی اور کوئی چپ چاپ دُھوپ میں بیٹھی

تھی ۔ دفعتاً سامنے کھڑکی میں ایک لڑکی کا سُتا ہوا پژمردہ چہرا اُبھرا ۔ لیکن اس کے خدوخال میں بلا کی دلکشی تھی ۔ اس کو دیکھتے ہی مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل میں چٹکی لے لی ہو ۔ مَیں بے چین سا ہوگیا ۔ میرے دل میں اس پر جان نثار کرنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی ۔ درحقیقت یہ میرا قصور نہ تھا ۔ اس کے چہرے پر کچھ اسی قسم کے تاثرات تھے کہ خواہ مخواہ اس کی مدد کو اُٹھ دوڑنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی ۔ اس کے چہرے پر بے انتہا مایوسی ملال اور بے کسی چھائی ہوئی تھی ۔ اس کی جُھکی جھکی پُرنم آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپ سے رحم کی اپیل کر رہی ہوں کہ میں بے کس ہوں لاچار ہوں ۔ اس ماحول میں گھٹ گھٹ کر مری جا رہی ہوں ۔ مجھے چھڑا لو اس مصیبت سے ۔ مجھے بھگا کے لے جاؤ ۔ کہیں لے جاؤ ۔ مگر لے ضرور جاؤ ۔

اسے دیکھ کر خود بخود اسے بچانے کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا ۔

اس نازنین نے پہلے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور مسکرا دی ۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب جادو تھا ۔ اُس کی نگاہوں کو دیکھ کر تو اس کی خاطر جان قربان کرنے کو دل چاہتا تھا ۔ لیکن مسکراہٹ کو دیکھ کر دل میں امنگوں کا دریا امنڈ آتا تھا اور اس کی خاطر زندہ رہنے اور زندگی کا لطف اٹھانے کی خواہش بیدار ہو جاتی تھی ۔

مسکرا کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی اور چھت پر جا کر اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگی ۔ لیکن اس کے انداز میں بے نیازی نہیں بلکہ نمائش اور بناوٹ کی جھلک تھی ۔ وہ اِس چھوٹی سی لڑکی کے پیچھے بھاگتی ۔ جھپٹ کر اُسے پکڑ لیتی ۔ اس کے لمبے لمبے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھر جاتے پھر وہ کھڑی ہو کر انہیں ٹھیک کرتی ۔ سر پر دوپٹہ ڈال لیتی ۔ اور مڑ کر میری طرف دیکھتی اور اسی انداز سے مسکرا دیتی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ مجھے لبھانے کے لئے کر رہی ہو ۔ اس لئے کہ وہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا جو اس کی ادائیں دیکھ رہا ہو ۔

میں حیرت سے اُس کی طرف تکے جا رہا تھا ۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو ایک منٹ قبل اس قدر سنجیدہ اور غمگین نظر آ رہی تھی ۔ اور جس کی نگاہوں میں اِس قدر مظلومیّت تھی کہ اس کی مدد کو اُٹھ دوڑنے کو دل چاہتا تھا ۔ میں نے اس پر ایک بار پھر نظر ڈالی ۔ ہاں یہ وہی لڑکی تھی بالکل وہی ۔ فریبِ نظر نہ تھا ۔

میں بے حس و حرکت بیٹھا اس کی اداؤں کو دیکھتا رہا ۔ نہ معلوم کتنی دیر تک ۔ پھر زینے سے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں نے چونک کر جلدی سے کھڑکی بند کر دی ۔ اور کرسی وہاں سے ہٹا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے مجھے اس کھڑکی سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو ۔

ایک لمبا چوڑا خوبرو نوجوان کنجیوں کی زنجیر کو گھماتا اور کوئی فلمی گانا گنگناتا ہوا کوٹھے پر آگیا ۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکا ۔ پھر آگے بڑھ کر کہنے لگا ۔

"نووارد معلوم ہوتے ہیں آپ ۔"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا ۔

"کون سے ابر میں داخل ہوئے ہیں ۔" اُس نے اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا ۔

میں تو ساجد کا چچا زاد بھائی ہوں ۔ اس سے ملنے آیا ہوں ۔" میں نے جوابدیا ۔

"اچھا ۔ اچھا ۔" اس نے گردن کو جھٹکا دے کر کہا ۔ "میں سمجھ گیا ۔ تم اس کے گاؤں سے آئے ہو ۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا ۔ "ساجد کا کیا حال ہے ۔"

"تمہارا مطلب" اس نے حیرت زدہ ہو کر میری طرف دیکھا ۔

"نہیں" میں نے گھبرا کر کہا ۔ "میرا مقصد تھا کہ اس پر کوئی مصیبت تو نازل نہیں ہوئی ۔"

"مصیبت" اُس نے طنزاً دہرایا ۔ "اس پر کیا نازل ہو سکتی ہے ۔ وہ تو سیدھا سادہ شریف لڑکا ہے ۔ بھلا ایسے لڑکوں پر کیا مصیبت نازل ہو گی ۔ جو

راہ راست سے انحراف ہی نہیں کرتے ۔"

"اچھا اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو دوسری کُرسی پر تشریف لے جائیے ۔" اس نے مجھ سے کہا ۔

"بہتر جناب ۔" میں نے جواب دیا ۔

"جناب نہیں ۔ آپ مجھے فدا کہہ کر پکار سکتے ہیں ۔" اُس نے جواب دیا ۔

"اچھا فدا صاحب ساجد کی طبیعت تو خراب نہیں ۔"

"طبیعت" اس نے اسی انداز سے دہرایا ۔ "اس کی طبیعت کیا خراب ہو گی ۔ وہ بد پرہیزی کرنی تو جانتا ہی نہیں ۔ اسکا کھانے اور پڑھنے سونے کے علاوہ کوئی دوسرا شغل ہی نہیں ۔"

یہ کہہ کر اُس نے کھڑکی کھول لی اور وہاں کھڑا ہو کر سیٹیاں بجانے لگا ۔ پھر اس نے مکّہ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا ۔ "یہ کیا مصیبت ہے ۔ آج کیا ہو گیا ۔"

"کیا ہو گیا ۔" میں نے پوچھا ۔

"مجھے کیا معلوم کیا ہوا ۔" اس نے برہم ہو کر کہا ۔ لیکن یکایک اسے خیال آگیا ۔ کہ ایک اجنبی کو برہمی دکھانے کا کیا فائدہ ۔ چنانچہ اس نے ذرا سنبھل کر کہا ۔ "وہ ۔ وہ ہے نا ۔ خدا کی قسم وہ جادوگرنی ہے ۔"

"جادوگرنی" میں نے حیرت سے دہرایا ۔

"وہ میری معشوقہ ہے ۔" وہ میری بات سنے بغیر ہی کہتا چلا گیا ۔ "سامنے والے مکان میں رہتی ہے ۔ خدا جانتا ہے بلا کی حسین ہے ۔ اور لطف یہ ہے کہ اس خاکسار کو دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔"

"سچ کہتا ہوں مرتی ہے وہ تو مجھ پر ۔ بہت ہی وفا شعار ہے ۔ مگر نہ معلوم کیا ہو گیا ہے آج ۔۔ آج وہ آئی کیوں نہیں ۔"

وہ عالمِ اضطراب میں چھت پر ٹہلنے لگا اور دل کی دھڑکنوں کو روکنے کی خاطر پھر سے فلمی نغمہ الاپنا شروع کر دیا ۔

"اچھا تو یہ بات ہے ۔" میں نے دل ہی دل میں کہا ۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ

اسی لڑکی کا ذکر کر رہا تھا ۔

"مگر وہ کسی اور شخص کے سامنے نہیں آتی ۔ اسی لئے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ دوسری کرسی پر چلے جاؤ ۔" وہ ٹہلتا ہوا پھر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا ۔ یقین نہیں تو دیکھ لو اس کی کھڑکی آج بند ہے ۔ اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ اس کے انداز میں فخر اور مسرّت کا امتزاج تھا ۔

غالباً یہ سب میرا قصور ہے ۔ "میں نے ندامت سے کہا ۔

"نہیں ۔ نہیں اس میں قصور کا کیا سوال" اس نے نہایت فیاضانہ لہجہ میں کہا ۔

"مگر اس کا حُسن ۔ خدا کی قسم ایمان شکن ہے ۔ مگر اس سے فائدہ ؟ وہ مجھ سے کس قدر دور ہے ۔ وہ میرے قریب تک نہیں آسکتی ۔ میں اُس کے قریب نہیں جا سکتا ۔"

"آہا وہ آگئی ۔" اس نے ایک دم چلاّ کر رومال ہوا میں لہرایا ۔ "میری جان مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤگی ۔ بھلا تم میرے بغیر کیسے زندہ رہ سکتی ہو ۔" اُس نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہنا شروع کیا ۔

"مجھے معلوم ہے تم مجھ پر مرتی ہو ۔" اُس نے اس طرح راز دارانہ انداز میں کہنا شروع کیا ۔ جیسے وہ سن رہی ہو ۔ "میری جان میں بھی تو تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔"

دیر تک وہ وہاں کھڑا اسی طرح عجیب و غریب حرکات کرتا رہا رومال لہراتا اور فلمی گیت گاتا رہا اور میں ہمہ تن حیرت بنا اس کو دیکھتا رہا کچھ دیر بعد کالج کی گھنٹی بجی اور وہ کھڑکی بند کر کے بڑبڑاتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا ۔ "یہ بدبخت بوڑھا جب دل چاہتا ہے گھنٹی بجا دیتا ہے۔کسی روز میں اس کی گردن اڑا دوں گا ۔"

"دیکھا تم نے ۔ اس نے پھر کھڑکی بند کر لی ۔" اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔

"خدا کی قسم وہ میری ہے اور صرف میری ۔ وہ میرے علاوہ کسی کے لئے کھڑکی نہیں کھولتی ۔" یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف چل دیا اور پھر رستے ہی میں مڑ

کر کہنے لگا ۔ یہ وہ امریکہ ہے جس کا کولمبس میں ہوں ۔ سمجھے ۔ کچھ نہیں سمجھے ۔ مگر یہ میرا راز ہے ۔ یہ کسی سے بتانا نہیں ۔" یہ کہہ کر وہ زینے سے نیچے اترنے لگا دو تین سیڑھیاں اُتر کر پھر رُک گیا بولا "ہاں اگر ساجد ملا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا ۔"

اس کے جاتے ہی میں جلدی سے کھڑکی کی طرف بڑھا ۔ اس کے طلسمی چہرے کو دیکھنے کی خواہش میں جسے دیکھتے ہی میں اپنی تمام پریشانیاں بھول گیا تھا ۔ جسے دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میں وہاں کس لئے آیا تھا ۔ مگر کھڑکی بند تھی ۔ میرے دل پر چوٹ سی لگی ۔ میں اس بند کھڑکی کی طرف دیکھتا رہا ۔ اتنے میں قدموں کی آہٹ پھر سنائی دی ۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کی اور دوسری دیوار کی طرف آ کھڑا ہوا ۔ جس میں ایک چھوٹی سی درز تھی ۔ جس میں سے باہر کی ہر چیز نظر آجاتی تھی ۔ لیکن باہر والے مجھے نہ دیکھ سکتے تھے ۔ میں وہاں بیٹھ کر نووارد کی آمد کا انتظار کرنے لگا ۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوٹے قد کا پتلا دُبلا سا شخص بغل میں بہت سی کتابیں دبائے ہوئے داخل ہوا اُس نے جلدی سے کتابیں میز پر پھینکیں ۔ جیب سے رومال نکال کر اپنی عینک کے آئینے صاف کئے اور مسکرا کر کھڑکی کھولنے لگا ۔

"او اوہ ۔" اُس نے گھبرا کر کچھ کہنا چاہا اور دو تین بار جلدی جلدی تھوک نگل کر اپنا کالر ڈھیلا کرنے لگا ۔ "مجھے افسوس ہے ۔" اُس نے بہت دیر کے بعد گلا صاف کر کے کہا ۔ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں ۔"

"نہیں ۔ نہیں ۔ افسوس کی کیا بات ہے ۔ میں ساجد کا چچا زاد بھائی ہوں ۔ اس کا انتظار کر رہا ہوں ۔" میں نے جواب دیا ۔

"اچھا یہ بات ہے ۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا ۔ اور ایک دزدیدہ نگاہ کھڑکی کی طرف ڈالی ۔ کھڑکی کی جانب دیکھنے کے بعد اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار اور بھی نمایاں ہو گئے ۔

"اُف اللہ ۔" اُس نے زیرِ لب کہا ۔

مَیں دیوار کی درز میں سے دیکھنے لگا ۔ وہ لڑکی اسی مظلومانہ انداز سے کھڑکی میں کھڑی تھی اور وہ غریب نوجوان اُسے دیکھ دیکھ کر مضطرب ہوا جا رہا تھا غالباً وہ اپنا راز ایک اجنبی پر افشا کرنے سے ڈرتا تھا ۔ بہر حال وہ بے حد بے چین تھا ہر لمحہ کے بعد اُس پر ایک دزدیدہ نگاہ ڈال دیتا تھا ۔ مجھے اس بے چارے پر بے انتہا رحم آنے لگا ۔ میرا دل چاہا کہ اس کے رستے سے ہٹ جاؤں ۔ مگر جاتا کہاں ۔ پھر میں نے کہا ۔" کیا خوبصورت لڑکی ہے اچھا مشغلہ ہے کیوں تمہارا کیا خیال ہے ؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنی پیشانی پر سے پسینہ پونچھ کر کہا ۔

"نہیں ۔ نہیں تمہارا خیال غلط ہے ۔ وہ ایسی نہیں ہے ۔ میں تو خود ایسی لڑکیوں سے نفرت کرتا ہوں ۔ یہ مشغلہ نہیں ۔"

"پھر کیا ہے"

میں نے پوچھا ۔

"اب چونکہ تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہے ۔" اُس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر ہی کہنا شروع کر دیا ۔ "تو تمہیں بتانے مین کوئی حرج نہیں ۔ وہ تو ایسی پاکباز لڑکی ہے کہ میں اس کی خاطر جان تک قربان کرنے کے لئے تیار ہوں آوارہ لڑکی نہیں شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہے ۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بننا نہیں چاہتی ۔ وہ مجھ سے محبّت کرتی ہے اور صرف مجھ سے ۔ اسی لئے تو میں نے آج تک یہ راز کسی کو نہیں بتایا ۔" اتنا کہہ کر وہ رُک گیا ۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگا ۔ مجھے معلوم تھا کہ لوگ اُسے کھلونا سمجھ کر کھیلنے لگیں گے ۔ اُسے آوارہ لڑکی سمجھیں گے ۔ خدا کے واسطے یہ میرا راز ہے ۔ اس کو راز ہی سمجھنا ۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا ۔

"نہیں ۔ نہیں فِکر نہ کرو ۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گا ۔" میں نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا ۔

"بہت مہربانی ۔ یہ کہہ کر اس نے میز پر سے کتابیں اٹھائیں ۔" اچھا اب

میں جاتا ہوں" اس نے آخری بار کھڑکی کی طرف دیکھا ۔ جھک کر سلام کیا اور نیچے اُتر گیا ۔

ابھی وہ نیچے اُترا ہی تھا کہ زینے سے قدموں کی آواز سنائی دی ۔ نیچے کوئی چلا کر بولا جلدی جاؤ ساجد کوئی شخص اوپر تمہارا انتظار کر رہا ہے ۔"

ساجد کا نام سنتے ہی میں اس لڑکی کو بُھول گیا ۔ جس نے اتنی دیر تک میرے ذہن سے ساجد کے خیال کو دور رکھا تھا ۔ ساجد سے ملنے کے لئے میں زینے کی جانب بڑھا ۔

"ہیلو ساجد ۔" میں اسے دیکھ کر چلّایا ۔

"اچھا تم آگئے ۔" اُس نے جوب دیا ۔ "مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے ۔"

"تم اچھے تو ہو ۔" میں نے بے تابی سے پوچھا ۔

"ہاں بظاہر تو ۔" اُس نے آہ بھر کر جواب دیا ۔

"مگر بات کیا تھی ۔ ہماری تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی تھی تار دیکھ کر" میں نے پریشانی سے کہا

"بتاتا ہوں ۔ تم بیٹھو تو سہی ۔" ساجد نے جواب دیا ۔

میں غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ۔ اس کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا ۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا ۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں ۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں ۔

"اچھا ہوا تم آگئے ۔" اُس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا ۔ "اور سب سے اچھا یہ ہوا کہ تم وقت پر پہنچ گئے ۔"

"مگر بات کیا ہے ۔" میرا اضطراب بڑھ رہا تھا ۔

"بہت ہی خطر ناک معاملہ ہے ۔ اس کا اثر میری تمام زندگی پر پڑے گا ۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں مجھے جیل خانے کا منہ دیکھنا پڑے ۔" اس نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا ۔

"ساجد" میں نے چلّا کر کہا ۔" کیا باتیں کر رہے ہو ۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔" اُس نے اسی انداز سے جواب دیا ۔

"ممکن ہے مجھے کوئی قتل کر دے ۔"

"مگر ہوا کیا ۔" میں نے زور سے چلّا کر کہا ۔

"ناراض نہ ہو ۔ میری فریاد غور سے سنو ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں ایک بہت بڑا جرم کرنے والا ہوں ۔" اُس کے لہجہ میں فریاد کا انداز تھا ۔

"جرم" میں نے حیرت زدہ ہو کر دہرایا ۔

"ہاں لوگ تو اس کو جرم ہی کہیں گے ۔" اس نے مظلومیّت بھرے انداز میں کہا ۔

"مگر قصہ تو بتاؤ میں نے برہم ہو کر کہا ۔

"ناراض مت ہو ۔" اُس نے آہ بھری ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے ۔ جنہیں وہ پینے کی کوشش کر رہا تھا ۔ ناراض نہ ہو باقر ۔ اب تمہارے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ۔"

"لیکن میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں ۔" مَیں نے پوچھا ۔

"اُس نے میرے شانوں پر سر رکھ دیا اور پُھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا ۔

"اُس نے کہلا بھیجا ہے کہ اگر آج رات کو میں اُسے نہ لے گیا تو وہ زہر کھالے گی ۔"

"کون زہر کھا لے گی ۔" مَیں نے پوچھا ۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں ۔ وہ ضرور زہر کھالے گی ۔ وہ میری خاطر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے گی ۔" اُس نے میری بات کا جواب دیئے بغیر اپنی گفتگو جاری رکھی ۔

"نہیں ۔ نہیں ۔" اُس نے ایک دم میرے شانوں پر سے اپنا سر اُٹھا کر کہا ۔ "میں اُسے زہر نہیں کھانے دوں گا ۔ آج رات کو میں ضرور اُسے لے جاؤں گا باقر سچ کہتا ہوں وہ بہت ہی وفا شعار اور پاکباز لڑکی ہے ۔"

"باقر مجھے اس سے محبت ہے ۔" اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھ کر کہا ۔ "وہ گھر کے قید خانے میں میری خاطر اپنی زندگی برباد کر رہی ہے وہ سامنے گھر میں"

اسنے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا ۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی ۔

"ہنسو نہیں ۔" اُس نے کہا ۔ "یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے ۔"

..........○..........

میرا گھر

کاش کہ میں اِسے کہانی کے روپ میں ڈھال سکتا ۔ لیکن کوئی بات بھی ہو جس کی کہانی بن سکے ۔ ایک عام سا واقعہ ، جسے غالباً آپ واقعہ تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے ۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس واقعہ نے مجھ پر اس قدر اثر کیوں کیا ۔

یہ واقعہ میرے گھر سے متعلق ہے ۔ وہ گھر جو میری دوسری شادی سے پہلے مجھ پر محیط و مسلط تھا ۔ آپ جانتے ہیں دوسری شادی ایک عام سی بات ہوتی ہے جس قدر پہلی شادی اہم ہوتی ہے اُسی قدر دوسری شادی غیر اہم ہوتی ہے ۔ جس میں نہ تو والدین کو اشتیاق ہوتا ہے ۔ نہ محلے والوں کو دلچسپی ہوتی ہے اور میری اِس دوسری شادی کی مزید خصوصیّت یہ تھی کہ مجھے خود بھی نہ تو شادی سے دلچسپی تھی نہ آبادی کا شوق تھا ۔ اور نہ ہی بیوی کا انتظار ۔ اس شادی کا مقصد اس مسلّط و محیط ویرانی سے فرار تھا ۔ جس کے بوجھ تلے تین افراد سسک رہے تھے ۔ پانچ سال کا ایک بچّہ ضیا، ساٹھ سال کی بوڑھی اماّں اور اُس کا اکلوتا بیٹا ۔۔۔ میں

یہ ایک چھوٹا سا عام سا گھر تھا ۔ جس کے افراد ماضی کے اذیّت دہ اثرات سے مخلصی پانے کی ناکام جدوجہد میں مصروف تھے ۔ ان افراد کی کیفیت اُن سمندری پرندوں کی سی تھی جو طوفان کے گزر جانے کے بعد دیر تک پہاڑوں کی ویران کھوہوں میں ڈر کے مارے دبکے رہتے ہیں ۔

طوفان گزر چکا تھا اور ڈھیر پور کی اس کھوہ میں ہم تین لٹے پھٹے افراد اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف تھے ۔ ننھا ضیا ہاتھوں میں اپنی ٹھوڑی تھامے اس کچّی اور میلی دیوار کو تکتا رہتا اور بوڑھی ماں چولھے پر مٹی کی ہنڈیا رکھے

دھوئیں کو گھورتی رہتی اور پھر دفعتاً پڑوسی کی کالی بلّی کو دیکھ کر ڈر کر جاگ پڑتی اور اس چھائی ہوئی دہشتناک خاموشی سے چھٹکارا پانے کیلئے اپنے آپ سے کہتی ۔ "ا بھی اجمل نہیں آیا ۔ ابھی اجمل نہیں آیا ۔" اور ننھا ضیا اُس کی بات سنے اور سمجھے بغیر سر ہلاتا ۔ "اونہوں ۔" اور پھر سے وہ دونوں خاموش ہو جاتے ۔ بوڑھی ماں دیوار کو گھورنا شروع کر دیتی ۔ اور ضیا چولھے میں بل کھاتے ہوئے دھوئیں کو دیکھنے میں کھو جاتا اور پھر نہ جانے کیوں دفعتاً گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ۔ "اماں ابّا نہیں آیا ۔" اور بوڑھی ماں اُس کی بات سمجھے بغیر نفی میں سر ہلاتی اور وہ پھر خاموش ہو جاتے ۔

ننھا ضیا ایک کھویا ہوا بچہ تھا ۔ اُسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چیزیں یوں بدل کیوں جاتی ہیں ۔ پہلے وہ امی اور ابّا کے ساتھ رہا کرتا تھا ۔ پھر دفعتاً اس کا ابّا گم ہوگیا اور وہ امی کے ساتھ رہنے لگا ۔ اب اس کی امی نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی ۔ ابّا جانے کہاں سے آگیا تھا اور اب وہ ابّا کے ساتھ رہتا تھا ۔ اب وہ ڈرتا تھا ۔ کہیں ابّا گم نہ ہو جائے اُسے چیزوں پر بھروسہ نہیں رہا تھا ۔ اگر پڑوسی کی سیاہ بلّی دفعتاً سفید روپ بدل لیتی تو بھی وہ حیران نہ ہوتا ۔ اس کے لئے اس دنیا میں کوئی چیز بھی یقینی نہ تھی ۔ ننھے ضیا کی آنکھوں پر ہمیشہ کے لئے حیرانی کا خول چڑھ چکا تھا ۔

بوڑھی ماں اِس طوفان سے بالکل ہی سٹھیا گئی تھی ۔ اُس نے اپنی تمام تر زندگی ویرانے میں گزاری تھی ۔ اِس لئے اس کی امیدیں مجھ پر استوار تھیں ۔ چونکہ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ مگر اس طوفان نے اُس کی امیدوں کی کشتی کو ڈبو دیا تھا اور اب اس کی کیفیت اُس بڈھے ملّاح کی سی تھی جو بیتے ہُوئے طوفانوں کی یاد سے ڈر کر چونکتا رہتا ہے ۔

اُس کھوئے ہوئے بچّے کو دیکھ کر اس سہمی ہوئی بڑھیا کے دُکھ کو محسوس کر کے اُس مسلّط و محیط ویرانی کے بوجھ سے اکتا کر جو اس گزرے ہوئے طوفان کی بپتا کو ہر دم دہراتی رہتی تھی ۔ میں اُٹھ کر بھاگ لیتا اور بے مصرف اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا یا قریشی کے گھر میں جا کر ستار بجانے کی ناکام کوشش کرتا ۔

حتیٰ کہ ستار کے تار وہی داستان دہرانا شروع کر دیتے جو ننھے ضیا کی آنکھوں میں کندہ تھی ۔ جو بوڑھی ماں کے ہاتھوں کی لرزش میں آشکار تھی ۔ پھر میں اپنے گھر کی طرف اُٹھ بھاگتا مجھے دیکھ کر ننھے ضیا کو یقین نہ پڑتا کہ میں آگیا ہوں ۔ بوڑھی ماں کا ہاتھ شدت سے کانپتا اور پھر ساکت ہو جاتا ۔ ضیا چپکے سے میرے قریب آکر کھڑا ہو جاتا اور پھر میری طرف دیکھتا ۔ حتیٰ کہ میں اسے آواز دیتا "ضیا" اور وہ بھاگ کر میری گود میں آ جاتا اور کہتا ۔ "تم ہو ابا" جیسے اُسے میرے ہونے کا یقین نہ ہو ۔

وہ طوفان ، میرا خود ساختہ طوفان تھا ، جس کے تحت مَیں نے پہلی شادی کی تھی میں اور میری پہلی بیوی نے اقربا سوسائٹی اور رسم و قواعد کے خلاف جنگ کی تھی ۔ اور سوسائٹی نے ہم سے انتقام لیا تھا اور اُسے میرے روبرو حریف بنا کر لا کھڑا کیا تھا ۔ جس کے حصول کے لئے میں تمام دُنیا سے بر سر پیکار ہوا تھا ۔ "تم مر جانہ" مَیں نے اسے کچہری میں مدعی کے کٹہرے میں دیکھ کر کہا تھا ۔ "تم "؟ اور پھر میں نے محسوس کیا تھا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو ۔

"ہاں میں ۔" وہ جواب میں للکار کر بولی تھی ۔ "مجھ میں جرأت ہے ۔"
لیکن اُس کی اِس آخری جرأت کی شدت نے خود اس کا بند بند توڑ دیا ۔ اور اس کے بعد چند ہی دنوں میں اُس نے اپنے آپ کو ایک مختصر سی ہچکی سے موت کے حوالے کر دیا ۔

ہاں وہ طوفان گزر چکا تھا اور اپنے عقب میں وہ بھیانک تاثرات چھوڑ گیا تھا ۔ جو بذاتِ خود اس طوفان سے کہیں زیادہ خوفناک تھے ۔ ایک گھٹن ، ایک ذہنی ناسور ایک یاس بھری نقاہت اور ایک خوفناک عالمِ ہراس مہیب چٹانوں کے ایک ویران کنارے پر مر جانا اور میری شادی کی کشتی ٹکڑے ٹکڑے ہوئی پڑی تھی ۔ سمندر کی تھکی ہاری لہروں کے منہ سے اب بھی جھاگ نکل رہا تھا ۔ چٹانوں کے نیچے اس ڈراؤنی کھڈ میں تین زخمی پسماندگان سسک رہے تھے اور اوپر گہرے نیلے اُداس آسمان پر گدھ منڈلا رہے تھے ۔

کیچڑ کی تھپی ہوئی وہ دیوار ننھے ضیا کو گھورتی تھی ۔ گیلی لکڑیوں سے اُٹھتا ہوا دھواں بوڑھی ماں کے سامنے ڈراؤنے روپ بدلتا تھا ۔ اور گھر پر مسلّط و محیط ویرانی خوفناک آواز میں مجھ سے کہتی ۔ "میں ہوں اجمل میں ۔ ہاں مجھ میں جرأت ہے ۔"

اس وقت میرا جی چاہتا کہ بھاگ جاؤں کسی اور گھر میں بھاگ جاؤں جہاں وہ کچی دیوار نہ ہو ۔ وہ دھواں نہ ہو اور وہ خوفناک آواز نہ ہو جسے سن کر میرا دل بیٹھ جاتا تھا ۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ایسی جگہ بھاگ جاؤں ۔ جہاں ننھے ضیا کی نگاہیں پھر سے لوٹ آئیں ۔ جہاں وہ میرا بلاوا سُن کر یہ نہ کہے "تم ہو ابا" جہاں بوڑھی ماں کے ہاتھ نہ کانپیں اور اس کے سر کی وہ دائمی جنبش نہ ہو جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا گویا وہ کہہ رہی ہو ۔ "نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔"

اسی اُمید پر مَیں نے ڈھیر پور میں تین مکان بدلے تھے ۔ مگر ہر جگہ وہ کچی دیوار آکھڑی ہوتی تھی ۔ وہ دھواں آکر بل کھانے لگتا ۔ اور وہ سیاہ بلّی نہ جانے کہاں سے آ موجود ہوتی تھی ۔ جو مجھ سے زیرلب کہتی ۔ "میں ہوں اجمل میں ۔" اور اُس کی آواز سُن کر میری ریڑھ کی ہڈی چٹاخ سے ٹوٹ جاتی اور سر لٹک جاتا ۔

ہم تینوں اس گھر سے نجات پانے کی جدوجہد میں لگے رہتے مگر وہ گھر ہم پر آسمان کی طرح مسلط تھا ۔

چائے کے برتن میز پر رکھ کر بوڑھی ماں میری طرف دیکھتی ۔ "اجمل" وہ ملتجیانہ انداز میں اس کے پاس جا بیٹھا اور ان جانے میں کچھ کہنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا ۔
"اماں" مَیں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا ۔
اماں نے سر اُٹھایا ۔ مَیں خاموش ہوگیا ۔ دیر تک ہم غیر ازمعمول ایک دوسرے کے قریب بیٹھے رہے میں نے پھر کچھ کہنا چاہا... اماں
اماں نے سر اٹھائے بغیر کہا ۔ "ہاں ۔" میں پھر خاموش ہوگیا اور وہ اپنے

کام کاج میں مصروف ہوگئی ۔ حتّٰی کہ سائے لمبے ہو گئے ۔ شام پڑ گئی اور اماں
کی ہنڈیا تیار ہو کر چولہے سے اتار دی گئی ۔ اُس کی جگہ توے نے لے لی ۔

"کیوں اماں ؟" مَیں نے کہا ۔

"ہاں بیٹا ہاں ۔" وہ بولی ۔ اس کی ہاں میں سوالیہ انداز نہ تھا ۔ بلکہ اُس
چھوٹے سے جملے کی حیثیت گویا ایک قطعی فیصلے کی تھی جیسے وہ کہہ رہی ہو ہاں بیٹا
اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ۔

اس روز مَیں نے محسوس کیا جیسے اُس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو ۔ مگر کس
کے سوا چارہ نہ تھا اسے الفاظ میں ہم دونوں میں سے کسی نے نہ کہا تھا ۔ اُس
روز میں نے محسوس کیا جیسے بوڑھی اماں کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ ہو ۔

لیکن دوسری شادی کے لئے یہ باہمی مبہم رضا مندی ہی کافی نہ تھی ۔ سوال
تو یہ تھا کہ کیسے ہو کس سے ہو ۔

ہاں تو اس دوسری شادی کے کوائف عجیب سے تھے ۔ اس کے لئے کوئی
خواہش مند نہ تھا ۔ کوئی بے تاب نہ تھا ۔ اور عملی طور پر اسے ممکن بنانے کے
لئے کوئی کوشش کرنے والا نہ تھا ۔ بوڑھی اماں تو اِس معاملے میں بالکل معذور
تھیں ۔ وہ کس منہ سے جا کر کسی سے سوال کرتیں ۔ اس علاقے میں کون تھا
جو اس طوفانی واقعہ سے واقف نہ تھا ۔ جو ماضی سے شناسا نہ تھا ۔ رہا میں تو
میں تو صرف یہی کر سکتا تھا کہ کسی نا عاقبت اندیش آزاد طبیعت کی لڑکی کو بہلا
پھسلا کر آمادہ کر لیتا ۔ مگر دقّت یہ تھی کہ مجھے اپنے چناؤ پر بھروسہ نہ رہا تھا اور
اب مجھے آزادی پسند طبیعت سے ڈر آتا تھا ۔ جب بھی کسی آزاد عورت کو دیکھتا
تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ کہہ رہی ہو ۔ ہاں مَیں ہوں ۔ مجھ میں جرأت ہے ۔
اور پھر ایک طوفان اٹھتا اور میں اس میں تنکے کی طرح ڈولتا ۔

مختصر یہ کہ میرے گھر کی کیفیت اُس کشتی کی طرح تھی جس کے بادبان تار
تار ہو چکے ہوں ۔ اور چپّو سمندر میں گر چکے ہوں اور لہریں ساکت ہو چکی
ہوں ۔ اور اِس میں ایک بڑھیا اور ایک ادھیڑ عمر کا مرد چپ چاپ بیٹھے تھے ۔
بڑھیا کی نگاہیں آسمان پر لگی ہوئی تھیں اور مرد سر جھکائے ساکت پانی کی طرف دیکھ

رہا تھا ۔ اور ایک ننھا بچہ ان دونوں کی طرف دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ وہ یوں
خاموش کیوں تھے ۔

یونہی دن گزرتے گئے ۔ مگر وقت گزرنے کا نام نہ لیتا تھا ۔

ایک دن جب میں چائے پی رہا تھا تو اماں چپکے سے میرے پاس آئی ۔ اس
کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا ۔ اماں کے ہاتھ میں اخبار ۔ یہ بات غیر از معمول
تھی ۔ مگر اس گھر میں مزید حیران ہونے کی اب گنجائش ہی نہ رہی تھی ۔ وہاں
سبھی ایک عالمِ حیرانی میں وقت کاٹنے کی کوشش میں مصروف تھے ۔ "اجمل"
اماں اخبار آگے بڑھاتے ہوئے بولی ۔

"یہ لو ۔" اخبار مجھے دے کر وہ چلی گئی ۔ لیکن وہ تو پرانا اخبار تھا ایک ماہ پرانا
پھر دفعتاً میری نگاہ اُس بکس پر پڑ گئی جو صفحے کے درمیان میں بنا تھا ۔ "ضرورت
رشتہ ، میرا دل ڈوب گیا ۔

گھنٹے گزر گئے صدیاں گزر گئیں اور میں وہ اخبار سامنے رکھے ہوئے بیٹھا
رہا ۔ حتّٰی کہ اماں کی آواز نے مجھے چونکا دیا ۔ وہ وہیں باورچیخانے میں بیٹھی ہوئی
کہہ رہی تھی ۔ "اجمل بیٹے ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں ماں ۔" میں نے سمجھے بغیر کہہ دیا ۔ "ٹھیک ہے ۔" اور پھر چونک
کر اُس بکس کی عبارت پڑھنے لگا ۔

چند ایک دنوں کے بعد دوسرا اخبار آ گیا ۔ جس میں ایک اور بکس تھا ۔
جس میں ضرورت کے بغیر خالی رشتہ لکھا تھا ۔ بوڑھی اماں نے اُس پرچے کو اُٹھا
لیا اور اُسے اپنی آنکھوں کے قریب لے جا کر یوں سر گھمانے لگی ۔ جیسے وہ کوئی
چابی کی گڑیا ہو پھر وہ اُسے اُٹھا کر باورچیخانے میں لے گئی ۔ ہر بار روٹی کو توے
پر ڈال کر وہ پرچہ اٹھا لیتی اور ان لکیروں پر نگاہ دوڑاتی اور پھر اُسے چوکی پر رکھ
کر روٹی الٹ کر پھر سے پرچے کو اُٹھا لیتی ۔

ایک دن گزر گیا ۔ ایک ہفتہ گزر گیا ۔ لیکن اماں گویا ابھی تک اس مختصر
سے بکس کی عبارت کو ختم نہ کر سکی تھی ۔ حسب معمول وہ پرچہ اُس کے دائیں
ہاتھ چوکی پر پڑا رہتا تھا ۔ ہنڈیا میں مصالحہ ڈال کر وہ اُسے چُولہے پر رکھ دیتی اور

پھر پرچہ اٹھا کر بیٹھ جاتی ۔

دروازے کی ہلکی سی آہٹ سُن کر بھی وہ چلّاتی ۔ "آئی" اور پھر دروازہ کھولتے وقت اُس کا ہاتھ کانپتا ۔ اور وہ دیر تک دروازے کے خلا کو گھورتی رہتی ۔ "خط آئیگا ضرور آئے گا ۔" وہ زیرِلب کہتی یوں اپنے آپ کو تسلیاں دیتی ۔ مجھے تو اب اس بکس کی عبارت مضحکہ خیز معلوم ہونے لگی تھی ۔ جب میں آخری لائن پڑھتا ۔ "شکل و صورت اور ذات پات کی کوئی قید نہیں ۔ لڑکی کی عمر بڑی ہو تو بہتر ہو گا ۔" تو مجھے افسوس ہوتا ۔ جیسے وہ ایک مذاق ہو ۔ جیسے کسی مسخرے نے وہ عبارت لکھی ہو ۔

ایک مہینے کے بعد ایک دن دروازے پر دستک ہوئی ۔ اور ایک نیلا سا لفافہ اندر آ گرا ۔ امّاں نے دوڑ کر لفافہ اٹھا لیا اور مجھے دیدیا ۔ اور میں نے اُسے کھولے بغیر میز پر رکھ دیا ۔ ایک گھنٹہ گزر گیا ۔ دو گھنٹے گزر گئے ۔ مگر وہ میز پر ہی پڑا رہا ۔ میں اُسے گھورتا رہا ۔ مجھے اُسے کھولنے کی ہمت نہ پڑ رہی تھی ۔

اِدھر باورچیخانے میں اماں بڑی شدت سے اس میلے پرچے پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی ۔ اور تنہا ضیا کچی دیوار کی جگہ اس نیلے لفافے کی طرف گھور رہا تھا ۔ پھر دفعتاً اماں کی آواز گونجی ۔ "بیٹے اجمل" اس روز اماں کی آواز میں غصّے کی جھلک تھی ۔

"ہاں اماں ۔" میں چونک کر بولا اور لپک کر میں نے لفافہ اُٹھا لیا ۔ اُسے کھولا ۔ لکھا تھا ۔ مکرمی آپ کا اشتہار نظر سے گزرا ۔ کیا آپ اس مسئلہ کو مناسب طور پر سنجیدہ سمجھتے ہیں یا تفریحاً آپ نے اشتہار دے رکھا ہے ۔ ازراہِ کرم مندرجہ ذیل پتہ پر جواب دیجیے ۔ خیر اندیش ۔

مَیں نے خط پڑھ کر میز پر رکھ دیا اور ازسرِ نو چائے کی کیتلی کو گھورنے لگا ۔

"بیٹے اجمل" اماں کی آواز پھر آئی ۔

مَیں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی ۔ میں نے سر نفی میں ہلا دیا ۔ وہ چپکے سے آگے بڑھی اور کھلا لفافہ اٹھا کر باورچیخانے میں چلی گئی ۔

شام کو جب میں باورچیخانے میں گیا تو دیکھا کہ اماں گھٹنوں کو بازوؤں میں

سمیٹے چوکی پر گٹھڑی بنی ہوئی سیاہ چھت کو گھور رہی ہے اور اس کے پاؤں میں اخبار کا وہ پرچہ جلا پڑا ہے ۔

دفعتاً پڑوس میں قریشی صاحب کی ستار رونے لگی ۔ گویا چلّا چلّا کر مجھے بلا رہی ہو ۔

میں چپ چاپ باہر نکل گیا ۔

دیر تک قریشی ستار بجاتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا ستار اپنا دکھڑا کہتی رہی اور فضا پر ایک پُراسرار سکوت طاری رہا ۔ پھر دفعتاً قریشی نے اپنا ہاتھ روک لیا اور مجھ سے کہنے لگا ۔ "اجمل صاحب آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے ۔"

"اچھا" میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا اور سَر جھکا لیا ۔

"تو ہم کر دیں انتظام ۔" چق کے پیچھے سے آواز آئی ۔ میں نے حیرانی سے چق کی طرف دیکھا ۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے اس آواز میں جرأت کی جھلک ہو ۔

"تمہاری کوئی شرط ہے اِس معاملے میں ۔" قریشی نے پوچھا ۔

"میری" مَیں گھبرا گیا "نہیں تو ۔"

"کوئی بھی نہیں ؟" اُس نے پھر پوچھا ۔

"اونہوں" میں نے سر ہلا دیا ۔

"پھر سوچ لیجئے" اندر سے آواز آئی ۔

"ہاں" میں چونک کر بولا "ایک بات ہے ۔"

"ہے نا ایک بات" اس آواز میں تمسخر کی جھلک تھی ۔ "خوبصورت ہو ۔ ہے نا ۔" آواز آئی ۔

"نہیں" میں نے بمشکل جواب دیا ۔

"جوان ہو" وہ بولی ۔

"نہیں" مَیں نے جواب دیا ۔

مکان پر خاموشی طاری ہو گئی ۔

"اچھا" قریشی بولا "کیا شرط ہے تمہاری"

”وہ مجھے میرے گھر سے بچالے ۔ میرے اپنے گھر سے ۔“

”آپ کے گھر سے“ آواز آئی ”آپ کا تو گھر ہی نہیں فی الحال“

”میرا مطلب ہے وہ مجھے مجھ سے بچالے“

چق کے پیچھے ایک تمسخر بھرا قہقہہ گونجا ۔

”یعنی یعنی“ میں نے وضاحت کرنے کی پھر کوشش کی ”وہ میرے گھر میں نہ رہے بلکہ ہمیں اپنے گھر میں لے جائے ۔ وہ اسے اپنا گھر بنا لے ۔ میرا مطلب ہے ۔

یہ بھی کوئی بات ہے وہ ہنسنے لگی ۔

”ہاں ہاں“ میں نے کہا ۔ ”نہیں نہیں میرا مطلب ہے ۔“ گھبرا کر میں اُٹھ بیٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا ۔ گھر آکر میں بستر پر چپ چاپ لیٹ گیا ۔ بیگم قریشی کیا کہتی ہوگی ۔ مخبوط الحواس شخص ہے ۔ اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے وہ طوفان اور اس کے اثرات وہ کچی دیوار ، وہ بل کھاتا ہوا دھواں ۔ سب خیالی چیزیں تھیں ۔ مضحکہ خیز باتیں جنہیں بیان تک نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ وہ بھلا حقیقی کیسے ہو سکتی تھیں ۔

میں دیوانہ وار اُٹھ بیٹھا ”ہی ہی ہی ہی“ میں نے قہقہہ لگایا ۔ اس مکان میں وہ قہقہہ یوں گونجا جیسے کسی مندر میں اذان کی آواز ہو ”اجمل“ اماں چلاّئی ”ابا“ ضیا رونے لگا ۔

مَیں نے ضیا کو جھڑک دیا اور بوڑھی ماں کو دھکیل کر باہر نکل گیا ۔ معمار کو ساتھ لے کر میں پھر سے گھر میں داخل ہوا ۔

”یہ کچی دیوار گرا دو“ میں نے کہا ”اس کی جگہ پختہ دیوار چن دو ۔ باورچی خانے کی دیواریں سفید کر دو ۔ چٹی سفید ۔ اور یہ کمرہ اس میں ڈس ٹمپر ہو جائے سمجھے سارا گھر گویا یکسر بدل جائے“

سارا گھر یکسر بدل گیا ۔ مگر ننھے ضیا کی نگاہیں اِس سفیدی کی وجہ سے اور بھی دھندلا گئیں ۔ اور بوڑھی اماں کا ہاتھ اور بھی کانپنے لگا ۔ اور مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میرے شانوں کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا ہو ۔ اور وہ سفید دیوار مجھے

یوں دکھائی دینے لگی جیسے پردۂ سیمیں ہو ۔ پھر گزشتہ پانچ سال کے واقعات اس پر ناچنے لگے ۔ ہر چند ساعت کے بعد وہ اک شانِ استغنےٰ سے انگڑائی لے کر دیوار پر مسلّط ہو جاتی ۔ ہاں میں ۔ مجھ میں جرأت ہے ۔ پھر اس دیوار سے بچنے کے لئے میں قریشی کی طرف اُٹھ بھاگتا ۔ لیکن وہاں بھی قریشی کی ستار مجھ پر ہنستی ۔ خوبصورت ہو ؟ جو ان ہو ؟ پھر سوچ لو ۔

ایک روز جب میں قریشی کے پاس بیٹھا ستار سُن رہا تھا تو دفعتاً قریشی نے ستار کو زمین پر رکھ دیا مسکرا کر بولا ”اجمل صاحب آپ کی وہ شرط بہت کڑی ہے معلوم ہے اُس نے آپ کی شرط سُن کر کیا کہا“

”کس نے کہا“ مَیں نے حیرانی سے پوچھا ۔

قریشی نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے اپنی بات جاری رکھی ”پہلے تو وہ غور سے بات سنتی رہی ۔ پھر دفعتاً گھبرا کر چلاّئی ”نہیں نہیں“ اور پھر خاموش ہو کر سر جھکا لیا“ قریشی قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ۔

”سوچ لیجئے ، اجمل صاحب ۔“ اندر سے آواز آئی ۔ ”سوچ لیجئے ۔“

اس شام مَیں نے محسوس کیا جیسے کوئی طوفان از سرِ نو جمع ہو رہا ہو ۔ چاروں طرف بادل اکٹھے ہو رہے تھے سیاہ ڈراؤنے بادل ۔ گھر کی دیواریں حسبِ معمول پردۂ سیمیں بنی ہوئی تھی ۔ اور گزشتہ پانچ سال کے واقعات کا فلم چل رہا تھا ۔

اماں جب وہاں سے واپس آئی تو میں چُپ چاپ اُس کے پاس جا بیٹھا ۔ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے ۔

پھر میں گھبرا گیا میں نے کہا ”اماں“ وہ خاموش بیٹھی دھوئیں کی طرف گھورتی رہی ۔ پھر دفعتاً بولی ”بے کار ہے بے کار ۔ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں“۔

”کیوں اماں“ میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا ۔

بوڑھی اماں نے ایک لمبی آہ بھری اور بولی ”تم نے پہلے بھی تو دیکھا تھا ۔“

”لیکن اماں تو“ میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا ۔

"مَیں" وہ ہنسی جیسے اپنا مضحکہ اڑا رہی ہو ۔

"تو پھر اماں ۔"

"پھر" وہ بولی ، اس کا ہاتھ شدّت سے کانپا اور ساکت ہوگیا ۔ "پھر جو ہونا ہے ، ہو جاتا ہے ۔" وہ خاموش ہو گئی اور ہم دیر تک خاموش بیٹھے رہے ۔

دفعتاً مجھے پھر جوش آیا "لیکن اماں یہ کام کسی کو کرنا ہی ہو گا ۔"

امّاں کا سر کانپنے لگا "نہیں" وہ بولی ۔ "یہ کام کئے نہیں جاتے ہو جاتے ہیں ۔ پہلے بھی ہو گیا تھا اب بھی ہو جائے گا ۔"

"لیکن اماں" میں نے بڑھ کر دونوں شانوں سے اُسے پکڑ لیا ۔ "اماں اگر اب کی بار" میرا گلا خشک ہوگیا ۔

اماں نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر ملتجیانہ انداز سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی ۔

اسی طرح دن گزر گئے ، ہفتے گزر گئے ، مہینے گزر گئے ۔ اور پھر ایک دن اماں مریم کو دونوں بازوؤں سے تھامے ہوئے اندر لے آئی اور چوکی پر بٹھا دیا ۔

مریم کی عمر ابھی چھوٹی ہی تھی ۔ مگر اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں ۔ اس کے ہاتھوں پر نیلی رگیں اُبھری ہوئی تھیں ۔ اُس کا رنگ سانولا تھا ۔ چہرے پر ایک عجیب سی سختی تھی اور آنکھیں یوں کھلی تھیں ۔ جیسے ان میں بند ہونے کی طاقت باقی نہ رہی ہو ۔

وہ چوکی پر یوں بیٹھ رہتی تھی جیسے لکڑی کی بنی ہوئی ہو ۔ اور یوں دیکھا کرتی جیسے آنکھیں بند کرنے کی طاقت کھو دینے پر حیران ہو ۔

مریم کے آنے کے بعد ایک دن گزر گیا ۔ دو دن گزر گئے ۔ ایک ہفتہ گزر گیا ۔ لیکن اس کی آنکھیں اُسی طرح کھلی رہیں ۔ ہونٹ ویسے ہی بند رہے جیسے سلے ہوئے ہوں ۔ اور وہ اُسی طرح چوکی پر بیٹھی رہی ۔

جب میں باہر جانے لگتا تو وہ چوری چوری میری طرف دیکھتی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں واپس ہی نہ آؤں ۔ اس وقت اُس کی آنکھیں اور بھی

کھل جاتیں ۔

مریم کے آنے پر گویا ہمارے گھر کے پرانے کوائف کو اور بھی تقویت مل گئی ۔ وہ چھائی ہوئی خاموشی اور بھی گہری ہو گئی ۔ بے نام سا بوجھ اور بھی بھاری ہوگیا ۔ اُس کی آمد پر مَیں نے محسوس کیا جیسے میرے کفن میں آخری کیل ٹھونک دیا گیا ہو ۔ "امّاں" میں نے امّاں کے پاس بیٹھ کر دبی آواز میں کہا ۔

"اماں" میرا جی چاہتا تھا کہ اماں سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر رو دوں ۔

اماں کا سر کانپنے لگا ۔ اور وہ آسمان پر نگاہیں گاڑے چپ چاپ بیٹھی رہی ۔

اُسے اب بھی آسمان کی طرف تکتے دیکھ کر غصے سے میرا دماغ گھوم گیا ۔ میں دیوانہ وار اُٹھ بیٹھا اور دروازہ کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا ۔

مجھے غصے سے باہر جاتے دیکھ کر مریم کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر نکل آئیں ۔ لیکن مجھے اِن گونگی آنکھوں پر غصّہ آ رہا تھا ۔

سارا دن نہ جانے میں کہاں کہاں گھومتا پھرا ۔ عین اُسی طرح جس طرح دو سال پہلے مرجانہ کے گھر سے نکل کر میں گھومتا پھرا تھا ۔

اشرف مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا "تم" وہ بولا ۔ "تم تو یار نظر ہی نہیں آتے ۔ وہ بولا ۔ "بالکل بدل گئے ہو ۔ کیا بات ہے" "نہیں نہیں" میں چلایا ۔ اشرف میں میں ہوں ۔ اور مجھے مجھ سے بچانے والا کوئی نہیں ہے ، کوئی نہیں ۔ مجھے میرے گھر سے بچاؤ اشرف ۔ میری آنکھوں سے ایک آنسو گر کر اُس کی ہتھیلی پر جا پڑا ۔

"اجمل" وہ چلایا ۔ "تم اجمل ۔" اور میں شرمندہ ہو کر وہاں سے بھاگا ۔ پھر میں اسلم کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا ۔ "میری تمام اُمیدیں اسلم تھا ۔" میری آواز خشک ہو گئی ۔ "وہ میری بیوی وہ تو ایسے معلوم ہوتی ہے میرے اُجڑے ویران گھر میں جیسے بطخ تالاب میں آ گئی ہو ۔"

پھر میں بازاروں میں بھاگتا پھرا اور میرے اردگرد بازار گھومتے رہے ۔ پھر

دفعتاً میں قریشی صاحب کے دروازے پر رُک گیا ۔ مَیں نے غصّے کو دبانے کی کوشش کی ۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں اُسے دبا سکتا ۔ میں نے اپنا سر زور سے قریشی کے دروازے پر دے مارا ۔

"تم ہو اجمل ، آؤ ، آؤ ۔" قریشی نے مجھے اندر گھسیٹ لیا ۔ "کیوں خیریت ہے ۔"

"خیریت مَیں نے کہا ۔ وہ میرے گھر کو کیا بدلے گی ۔" میری آواز میں طنز کی دھار تھی ۔ وہ تو گویا میرے ہی گھر کی ایک فرد ہے ۔"

"اجمل" وہ چلایا ۔ "اجمل تم اس حد تک خود پرست ہو مجھے یہ معلوم نہ تھا ۔"

"خود پرست ؟ میں نے غصّے میں دہرایا ۔

"ہاں" وہ بولا ۔ "تم اتنے خود پسند ہو کہ تمہیں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ اپنے گھر کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ مریم کا بھی ایک گھر ہے اور وہ اپنا گھر اپنے ساتھ لائی ہے ۔"

"اُس کا گھر" میں نے حیرانی سے پوچھا ۔

"ہاں" وہ خاموش ہوگیا ۔ جیسے کسی خیال میں کھوگیا ہو ۔ سات سال گزرے سات سال ..... جب اعظم آباد میں ایک دھوم کی شادی ہو رہی تھی باجے گاجے ، زیور ، سامان اور رونق ۔ مجھے آج تک وہ دھوم یاد ہے ۔ پھر وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور دولہے کی انتظار میں بیٹھی تھی ۔ رات گزر گئی دن چڑھ آیا ۔ دن گزر گیا اور پھر رات پڑ گئی ایک ہفتہ گزر گیا مگر دولہا نہ آیا ۔ پھر وہ منہ چھپا کر اپنے ماں باپ کے گھر میں جا بیٹھی ۔ سات سال وہاں بیٹھی انتظار کرتی رہی یہ ہے مریم کا گھر ۔

"مریم کا گھر ، مریم کا گھر" میرے منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی ۔ پھر میں دیوانوں کی طرح بھاگا ۔ اور چپکے سے دروازہ کھول کر اپنے گھر میں داخل ہوگیا ۔

مریم نے چوری چوری دروازے کی طرف دیکھا ۔ مجھے آتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھر سے اپنے حلقوں میں داخل ہو گئیں ۔

اس روز مَیں نے اُسے پوچھا ۔ "مریم اگر آج سے میں تمہارے گھر میں

رہوں تو ۔" وہ سر جھکا کر بولی ۔ "لیکن میں تو آپ کے گھر میں رہوں گی ۔"

"لیکن مریم" میں نے کہا ۔ "میرا گھر کس قدر ویران ہے ۔"

"نہیں تو" وہ بولی ۔ "آپ جو ہیں ۔" اچھا میں نے کہا ۔" اگر میں بھی تمہارے گھر رہوں ۔ اگر میں تمہارے گھر سے کبھی نہ جاؤں تو ۔"

اُس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا پھر اس کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا تبسم جھلکا ۔ جیسے دور بہت دُور مشرق میں سورج کی ہلکی دودھیا سفیدی انگڑائی لینے لگی ۔ اندھیرے میں ایک کرن لرزی اور مَیں نے محسوس کیا جیسے میں مریم کے گھر میں داخل ہوگیا ہوں ۔ وہ بوجھ میرے شانوں سے اُترنے لگا ۔

"اماں" میں نے بوڑھی ماں کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا اماں مجھے دیکھ کر مصلّے پر جا کھڑی ہوئی ۔

............○............

پردۂ سیمیں

وہ اب بھی وہیں بیٹھا ہے ۔ نیشاپور ملز کے بی بلاک کے کوارٹروں کے سامنے باغیچے میں ۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے ہیں ۔ بال بٹی ہوئی رسّی کے گچھے کی طرح ہو چکے ہیں ۔ آنکھیں پُھول کر بے نور ہو چکی ہیں لیکن وہ دیوار کی طرف یوں دیکھتا رہتا ہے جیسے وہ پردۂ سیمیں ہو ۔ اور پھر وہ آپ ہی آپ بڑ بڑاتا ہے "وہ ہیرو ۔ آ گیا وہ ناچ رہی ہے ۔ ناچ رہی ہے ۔ ناچ رہی ہے"

"داؤ لگا لے ۔ داؤ ۔ ہی ، ہی ، ہی ، ۔" اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے اور پھر آپ ہی ہنس دیتا ہے یا رو پڑتا ہے ۔

کسی کو یاد نہیں رہا کہ وہ کب سے وہاں بیٹھا ہے ، کیوں بیٹھا ہے اور وہ اس دیوار کو سینما کی چادر سمجھنے پر کیوں مصر ہے ۔

پہلے پہل اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر لوگوں میں چرچا ہوا ۔ بلکہ انہوں نے کوشش کی کہ وہ وہاں سے اُٹھ کر گھر چلا جائے ۔ لیکن کوئی بھی اُسے وہاں سے اُٹھا نہ سکا ۔ اور اب وہ سب اس واقعہ کو بُھول چکے ہیں ۔ اب تو وہ یہ بھی بُھول چکے ہیں کہ اس کا نام صمد تھا ۔ البتہ بی بلاک سے جنوب کی طرف دُور ایک چوبارے میں ایک مٹیار عورت جب کبھی کھڑکی میں آ کر بال بناتے ہوئے راہ گیروں کی طرف دیکھ کر آنکھیں مٹکاتی ہے اور اُس کی نگاہ اس دیوانے پر پڑتی ہے تو اس کے ہونٹوں پر تحقیر آمیز مسکراہٹ آ جاتی ہے ۔

صمد کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس کے والد نبی بخش پانچ وقت کے نمازی ہونے کے علاوہ تہجّد گزار بھی تھے ۔

صمد کو ان کے خلاف یہ شکایت تھی کہ وہ نئی تہذیب سے قطعی طور پر بیگانہ تھے اور سر سے پاؤں تک دقیانوسیت میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ اسے اپنے والد

کے خیالات ، برتاؤ ، لباس ۔ حتّی کہ چال ڈھال پر بھی نہ جانے کیوں شرم سی محسوس ہوتی تھی ۔ حالانکہ اڑوسی پڑوسی ، محلے والے اور برادری کے سبھی لوگ ان کی عزّت کیا کرتے تھے ۔ بلکہ ان کی شرافت کے گن گاتے تھے ۔

ممکن ہے کہ نفرت کا یہ جذبہ اُس نے اپنی والدہ سے اخذ کیا ہو ۔ کیونکہ صمد کے علاوہ ایک اُس کی ماں تھی ۔ جسے نبی بخش کی نمازوں پر شکوہ تھا ۔ "بس تمہیں تو صرف نماز پڑھنا ہی آتا ہے ۔" کبھی کبھار غصے میں اس کے مُنہ سے نکل جاتا ۔ جس کے جواب میں نبی بخش گھبرا جاتے اور استغفراللہ پڑھ کر کہتے ۔ "مگر نیک بختے تو میری بات تو سُن ۔" مگر صمد کی ماں نے میاں کی بات کبھی نہ سُنی تھی ۔ اُلٹا وہ کوئی اپنی بات چھیڑ دیتی ۔ اس کا یہ روّیہ دیکھ کر نبی بخش اور بھی گھبرا جاتے اور پھر مسلسل استغفراللہ پڑھتے ہوئے مصلّے پر جا کھڑے ہوتے اور چار رکعت نماز میں صمد کی ماں کی باتیں بُھولنے کی کوشش میں کھو جاتے ۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ صمد کی ماں کی باتوں کی وجہ سے نبی بخش کی نمازیں اور وظیفے طول پکڑتے گئے تھے یا ان کی نمازوں اور وظیفوں کی وجہ سے صمد کی ماں کی باتوں کی دھار تیز ہوتی گئی تھی ۔ بہرحال صمد کی ماں کو یہ غصہ تھا کہ اس کی جوانی میاں کی نمازوں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے ۔ چار ایک بار تو اس نے صاف الفاظ میں یہ بات جتا بھی دی تھی ۔ ویسے کنایتہً تو روز ہی وہ کسی نہ کسی بہانے سے یہ بات سمجھایا کرتی تھی انہیں ۔ اس کے علاوہ ان کے بار بار استغفراللہ پڑھنے پر تو وہ غصّے سے چلّانے لگتی ۔ "بس میں سامنے آ جاؤں تو توبہ کا ورد شروع کر دیتے ہیں کوئی آ جائے تو سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے منہ سوکھتا ہے ۔ پھر میرے سامنے استغفراللہ کیوں ؟ آخر میں بیوی ہوں تمہاری ۔ بیوی کے بھی حقوق ہوتے ہیں کچھ یہ نہیں کہ جب سامنے آئے توبہ کا ورد شروع کر دو ۔ انسان کو دین و دنیا دونوں کا خیال رکھنا چاہئے ۔ لیکن میاں نے تو صرف نمازوں پر زور دے رکھا ہے ۔ باقی اللہ اللہ خیر سلّا ۔"

شائد ماں کی باتوں نے صمد پر اثر کیا ہو ۔ لیکن بلند اقبال نے بھی تو آخر اسی گھر میں صمد کے ساتھ پرورش پائی تھی ۔ وہ بچپن ہی سے ماں کی باتیں سنتی

رہتی تھی ۔ پھر ان باتوں نے اس پر اثر کیوں نہ کیا ؟ الٹا بلند اقبال کے دل میں تو باپ کی محبت جاگزیں تھی ۔ وہ کوئی بچّی نہ تھی ۔ دسویں جماعت میں پڑھا کرتی تھی ۔ تہذیب سے بھی واقف تھی اور فیشن کی بھی دلدادہ تھی ۔ لیکن اس نے کبھی ابّا کے رویّہ یا بات پر شرم محسوس نہ کی تھی ۔

نہ جانے باپ بیٹوں میں خواہ مخواہ کا بُعد کیوں پیدا ہو جاتا ہے وہ آن جانے میں ایک دوسرے سے دُور کیوں ہٹتے جاتے ہیں اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف گونگی شکایات کیوں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ باپ کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ بیٹا سمجھتا نہیں اور بیٹے کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ باپ غلط سمجھتا ہے ۔

نبی بخش بھی صمد کے بارے میں یہی سمجھتے تھے کہ وہ کم عقل ہے ۔ اور سمجھتا نہیں کبھی کبھار جب بھی وہ اسے ڈانٹتے تو کہتے ۔ "بے وقوفا ۔ نا معقولا ۔"

اِدھر صمدان کی ہر بات کو غیر معقول سمجھتا تھا ۔ اس کا خیال تھا کہ ابّا کو کچھ پتہ ہی نہیں وہ تو کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی چکر میں گھوم رہے ہیں ۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے باپ کے علاوہ باقی تمام دنیا ترقی کے راستے پر چل رہی ہے ۔ اِس لئے وہ روش جو ابّا کی ڈگر سے ہٹ کر تھی ۔ ترقی کی راہ پر گامزن تھی ۔ باپ بیٹے کی اس باہمی کشمکش کی وجہ کے متعلق یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ مثلاً تہذیب نو کی برکتوں میں صمد کے خیال میں سب سے بڑی برکت سینما تھی ۔ اس کے برعکس نبی بخش کے خیال کے مطابق تہذیبِ نو کی جُملہ لعنتوں میں سینما سب سے بڑی لعنت تھی ۔ کون جانے کہ صمد کا سینما سے والہانہ شوق نبی بخش کی نفرت کی وجہ سے تھا ۔ یا ان کی نفرت صمد کے والہانہ شوق کا نتیجہ تھی ۔ بہر حال یہ حقیقت تھی کہ صمد کو سینما سے بے حد لگاؤ تھا ۔

اگر اسے ایک مقامی کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کر دیا جاتا ۔ اور گھر سے دُور جا کر اسے سینما دیکھنے کی آزادی مل جاتی تو ممکن ہے کہ یہ چنگاری بڑھ کر شعلہ جوالہ نہ بنتی اور حالات کا دھارا کسی اور رُخ بہتا ۔

اپنے اِس شوق کو پورا کرنے کے لئے ابتدا میں تو صمد نے کالج کی خصوصی میٹنگ ایجاد کر لی ۔ جو عین میٹنی شو کے وقت ہوا کرتی تھی ۔ لیکن میٹنی شو دیکھنا بیکار تھا میٹنی شو میں اگرچہ ریٹا ہیورتھ اسی انداز سے رقص کرتے ہوئے باری باری ملبوسات اتارتی تھی ۔ وہی گیتا بالی اسی انداز سے کمر پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں مٹکاتی ۔ اور وہی پگلی "گوری لاکھ چلے ۔" گاتے ہوئے اشارے کرتی تھی ۔ لیکن صمد کو ایسے محسوس ہوتا جیسے یہ سب دُور پردے پر ہو رہا ہے ۔ گیتا بالی آنکھیں تو مٹکاتی تھی ۔ مگر اس کی طرف دیکھے بغیر ہی ۔ اس کے برعکس رات کے شو میں وہ سب قریب تر آ جاتی تھیں ۔ اِس قدر قریب کہ جب گیتا بالی کہنی چلاتی تو وہ اس کے پہلو میں لگتی ۔ ریٹا تو ہال میں اتر کر ناچتی اور ناچتے ہوئے جان بوجھ کر صمد کے گرد گھومتی اور پگلی یوں اس کی طرف اشارے کرتی جیسے اسی کے انتظار میں دیوانی ہو رہی ہو ۔

صمد نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وقت کو جذبات سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے ۔ اسے اِس سلسلے میں اب تک کوئی تجربہ نہ تھا ۔ اس کی زندگی میں کوئی لڑکی ابھی داخل نہ ہوئی تھی ۔ کالج میں صرف چار ایک لڑکیاں تھیں ۔ وہ سب ایم ۔ اے کی طالبات تھیں اور اس سے اِس قدر دور رہتی تھیں جیسے میٹنی شو کی چادر پر چل پھر رہی ہوں ۔ لبِ بام رومان کا ابھی اُسے موقعہ نہ ملا تھا ۔ اور موقعہ ملتا بھی کیسے ۔ بھلا جس کے والد نمازیں پڑھتے ہوں اور جن کے اڑوس پڑوس والے گن گاتے ہوں ۔ اس کو بھلا کیسے موقعہ ملے ۔ محلے بھر میں اس کی اپنی حیثیت تو تھی ہی نہیں ۔ کیونکہ لوگ اسے صرف ایک شریف باپ کا بیٹا سمجھتے تھے ۔ اس کے بعد لبِ بام رومان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ صمد تو بلکہ یہ سمجھتا تھا کہ محلے کی لڑکیاں اسے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتی ہیں ۔ صرف اس لئے کہ وہ نبی بخش کا بیٹا تھا ۔ اس نے کئی ایک بار آزما دیکھا تھا ۔ رومان سے محرومیّت کی وجہ سے اس کا سینما کا شوق اور بھی بڑھ گیا تھا ۔ لب بام نہ سہی ۔ پردۂ سیمیں پر ہی سہی الٹا پردۂ سیمیں پر تو اور بھی فائدہ تھا ۔ لب بام تو وہ منہ چھپا لیتی ہیں ۔ اور دیکھتی بھی ہیں تو چتون چڑھا کر لیکن پردۂ

سیمیں پر تو وہ اردگرد ناچتی ہیں ۔ اور ناچتے ہُوئے "اک داؤ لگانے" کی دعوت دیتی ہیں ۔

دقّت یہ تھی کہ شام کے شو کے لئے جانا صمد کے لئے بے حد مشکل تھا ۔ نبی بخش کو یہ پسند نہ تھا کہ بچّے رات کو آوارہ پھریں ۔ بہانے تو وہ بنا لیتا ۔ مگر بہانے روز تو نہیں چلتے اور اس کا جی تو روز اس رقاصہ کو دیکھنے کو چاہتا تھا جو اسے "داؤ لگانے" کی دعوت دے ۔ اس سلسلے میں صمد کو سب سے زیادہ غصّہ اس مکان کی بناوٹ پر آتا تھا ۔ جس میں وہ مقیم تھے ۔ اس مکان میں کوئی عقبی دروازہ ہی نہ تھا ۔ جو پچھلی گلی میں کھلتا ہو اور نہ ہی کوئی کھڑکی تھی ۔ جس سے بوقتِ ضرورت کوئی آ جا سکے ۔ رہا صدر دروازہ تو وہ بالکل بیکار تھا ۔ اس کے عین اوپر نیم چھتی تھی ۔ جس میں نبی بخش نمازیں اور وظیفے پڑھا کرتے کیونکہ سوتے تو وہ غالباً تھے ہی نہیں ۔

اس تکلیف کی وجہ سے صمد دل ہی دل میں کڑھتا رہا ۔ پھر ایک روز ماں کے سامنے پُھوٹ کر رو پڑا ۔ "ماں" وہ چلّایا ۔ "میں قید خانے میں نہیں رہ سکتا ۔ اگر یونہی مجھ پر بندشیں لگی رہیں تو میں کسی روز نکل جاؤں گا ۔"

"پاگل تو نہیں ہو گیا تو ۔" ماں بولی ۔ "گھروں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔ یہی کہتے ہیں نا وہ کہ رات کو دیر تک باہر نہ رہا کرو ۔"

"کیوں ۔ میں کیا بچہ ہوں ۔" وہ غصّہ میں بولا ۔

"بچہ نہیں ہے تو اور کیا ہے تو ہماری نظر میں تو تُو ساری عمر ہی بچہ رہے گا ۔"

"تو تم اپنی نظر کا علاج کرو ۔" وہ اُسے گھورنے لگا ۔

"اے ہے ۔" ماں بولی ۔ "تُو تو بس فلاسفہ ہی جھاڑتا رہتا ہے ۔ نہ جانے کالجوں میں فلاسفہ کیوں پڑھاتے ہیں ۔ جس کے پڑھنے سے کوئی گھر کا رہے نہ باہر کا ۔ اچھا علم ہے یہ ۔"

ماں کی بات سُن کر صمد کی ہنسی نکل گئی ۔ "تم تو بالکل فضول ہو ماں ۔" وہ بولا اور پھر پینترہ بدل کر اُس کی منّتیں کرنے لگا ۔ "دیکھو نا ماں ساری دنیا

سینما دیکھتی ہے ۔ کالج کے سارے لڑکے سینما دیکھتے ہیں ان کے والدین تو اُلٹا انہیں ساتھ لے جا کر سینما دکھاتے ہیں ۔ ایک میں ہی بدنصیب ہوں ۔"

"تو دوپہر کو دیکھ لیا کر ۔" اُس کی ماں نے ہاتھ چلا کر کہا ۔

اب وہ اُسے کیسے سمجھاتا کہ دوپہر کے وقت ریٹا ہیورتھ کپڑے اتارتی تو ہے مگر وہ اُترتے نہیں ۔

"وہ تو بس یہی کہتے ہیں نا ۔" ماں بولی ۔ "کہ رات کو گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں ۔"

"انہیں سمجھ ہی کیا ہے ۔" وہ پھر جلال میں آ گیا ۔ "نمازیں پڑھنے کے علاوہ وہ جانتے ہی کیا ہیں ۔ انہیں کسی کے جذبات کا پتہ بھی ہو ۔"

دفعتاً صمد کی ماں کے کچلے ہوئے جذبات اُبھر آئے ۔ وہ جوانی جو نمازوں کی بھینٹ چڑھ چکی تھی ۔ اس کے روبرو آ کھڑی ہوئی ۔ اور اُس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ دونوں مظلوم تھے ۔ اس روز سے اس نے عملی طور پر صمد کی امداد کرنی شروع کر دی ۔

اب صمد خاموشی سے دوسرا شو دیکھ کر اپنی پڑوسن رحمت گوالن کے گھر سے داخل ہو کر ان کی چھت سے پھاند کر اپنے کوٹھے پر پہنچ جاتا ۔ اور چپکے سے اپنی چارپائی پر آ لیٹتا اور نبی بخش کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ گھر سے باہر گیا تھا ۔

صمد کی ماں کو سینما سے چنداں ہمدردی نہ تھی ۔ لیکن نمازوں کے خلاف اُس کے دل میں ایک ڈھکا چھپا بغض تھا ۔ صمد کو سینما دیکھنے میں مدد دے کر دراصل وہ نمازوں کے خلاف انتقام لے رہی تھی ۔

پھر ایک روز سینما ہال میں جب انٹرول میں بتیاں جلیں تو صمد نے دیکھا کہ ریٹا ہیورتھ اس کے پاس بیٹھی ہے ۔ وہ اُسے دیکھ کر ڈر گیا پردۂ سیمیں کی ریٹا ہیورتھ اور چیز تھی ۔ چاہے وہ پردے سے اُتر آتی تھی ۔ مگر پھر بھی وہ پردۂ سیمیں کی ریٹا تھی ۔ اور پردۂ سیمیں کی ریٹاؤں سے اب وہ مانوس ہو چکا تھا ۔ لیکن ہال کی کرسی پر بیٹھی ہوئی ریٹا ۔ اور کرسی بھی وہ جس کا ایک بازو اس کی اپنی کرسی کے بازو سے مشترک تھا ۔

یہ جیتی جاگتی ریٹا پردۂ سیمیں کی ریٹا کی طرح نہ تھی ۔ اس کا جسم ویسا خوبصورت نہ تھا ۔ لیکن وہ کسی قدر گرم تھا ۔ وہ اس کی حدّت کو دُور سے محسوس کر رہا تھا ۔ نہ تو ہال کی یہ ریٹا رقص کر رہی تھی ۔ اور نہ کپڑے اتار رہی تھی ۔ مگر اُس نے محسوس کیا ۔ گویا اُن کپڑوں کے باوجود وہ ننگی تھی ۔ اس قدر ننگی جس قدر ریٹا کپڑے اتارنے کے باوجود نہ ہوتی تھی ۔ صمد کو پسینہ آگیا ۔ گھبرا کر اُس نے منہ موڑ لیا اور یوں بے تعلق ہونے کی کوشش کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ۔ لیکن اس بے تعلقی کے باوجود وہ محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے ایک ڈھکی چھپی آنکھ کے کونے سے ایک تاریک شعاع اس کو کرید رہی ہے ۔

انٹرول کے اختتام پر صمد نے اطمینان کا سانس لیا ۔ لیکن جلد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ اس اندھیرے کی نوعیّت کچھ اور ہی تھی ۔ انٹرول سے پہلے کے اندھیرے کی طرح وہ گرم اور بوجھل ہوگیا تھا ۔ سارے ہال میں ایک بوجھل موجودگی چھا رہی تھی ۔ اور وہ تاریک کرن اسے "داؤ لگانے" پر اُکسا رہی تھی ۔ اِس اندھیرے سے تو انٹرول کی روشنی ہی اچھی تھی ۔

فلم ختم ہونے پر جب وہ ہال سے نکلا تو وہ اس کے قریب آکر رُک گئی ۔ "مہربانی سے مجھے ایک تانگا تو لا دیں ۔" وہ بولی ۔ "مجھے کِلٹر روڈ جانا ہے" اس کی آواز سن کر وہ چونکا اور اُسے اِس قدر قریب دیکھ کر گھبرا گیا ۔ "اوہ اوہ" وہ بولا ۔ "میرا مطلب ہے ضرور ۔ کیوں نہیں ابھی لایا میں تانگا ۔" اور اس قرب سے بچنے کے لئے بھاگا ۔ صمد کی اس گھبراہٹ پر وہ مسکرا رہی تھی ۔ اس مسکراہٹ میں عزم تھا ۔

جب وہ تانگا لے آیا تو وہ بولی ۔ "آئیے نا آپ بھی تو ادھر ہی جائیں گے ۔ آئی وِل گوِ یُو اے لفٹ ۔" اس کا جی چاہتا تھا کہ انکار کر کے بھاگ جائے ۔ لیکن اس کے "پلی ۔ ای ۔ ای ۔ ای ۔ ز ۔" میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ اسے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۔

مسز ڈیوڈ کے گھر پہنچ کر وہ حیران رہ گیا ۔ وہ سب یوں ہنس کھیل رہے تھے جیسے پکنک پر آئے ہوئے ہوں ۔ صمد نے محسوس کیا جیسے ایک رنگین منظر

پردۂ سیمیں سے اتر کر اس برآمدے میں آگیا ہو ۔ گھر کے تمام کردار وہی تھے جو وہ سینما کی چادر پر دیکھا کرتا تھا ۔ لڑکیاں اِسی طرح سینے تانے آنکھیں مٹکا رہی تھیں ۔ نوجوان نے ان پر یوں آنکھیں گاڑ رکھی تھیں جیسے مکھی گڑ پر پنجے گاڑ دیتی ہے ۔ بوڑھا اُنہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا اور ان سب کے درمیان مسز ڈیوڈ کھڑی گویا اپنا آپ اس کے حوالے کئے جا رہی تھی ۔ اس کے قدموں میں ایک اونچا لمبا کتّا اس سے لاڈ پیار کر رہا تھا ۔ سامنے اونچی لمبی کتابی چہرے والی حسینہ تصویر بنی کھڑی تھی ۔ باغیچے میں پھول لہلہا رہے تھے ۔ دودکش کے اوپر دھواں ناچ رہا تھا ۔ انگیٹھی پر کیتلی گا رہی تھی ۔

جلد ہی وہ خود اس رنگین منظر کا ایک حِصّہ بن گیا ۔ وہ سب اس کے ساتھ یوں گھُل مِل گئے جیسے برسوں کے پُرانے ساتھی ہوں ۔ لڑکیاں ایسی نگاہوں سے صمد کی طرف دیکھنے لگیں جیسے وہ اس سے بے حد مانوس ہوں ۔ جیسے وہ عرصۂ دراز سے اُسے جانتی ہوں ۔ وہ پورے طور صورت حالات سے واقف معلوم ہوتی تھیں ۔ انہیں اچھی طرح احساس تھا کہ جب ممی کو کوئی شخص تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑنے آئے تو اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور اس سے کس انداز سے پیش آنا چاہیئے ۔ یہاں تک کہ صمد نے خود محسوس کیا کہ وہ پہلا اجنبی نہ تھا جو مسز ڈیوڈ کو تانگے میں بٹھا کر گھر چھوڑنے آیا ہو ۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا کیرم کھیلتا رہا ۔ پھر سب کافی پیتے ہوئے لطیفے سناتے رہے ۔ جب وہ گھر جانے لگا تو مسز ڈیوڈ قریب آگئی ۔ "چلئے آپ کو سڑک تک چھوڑ آؤں ۔" وہ بولی ۔

جب وہ سڑک پر پہنچے اور مسز ڈیوڈ نے "گڈنائٹ" کہا تو دفعتاً اس کی آنکھیں صمد کی آنکھوں میں گھس گئیں اور ہونٹ بٹوہ سے بن گئے اور صمد نے دیکھا کہ وہ ننگی ہے اور اس کے منہ سے بھبھاکے اٹھ رہے ہیں ۔ اس گونگے تقاضے سے گھبرا کر وہ بھاگا ۔

اس روز سے اس کا شوق پردۂ سیمیں سے ہٹ کر اس زندہ تماشے پر منتقل ہوگیا ۔ جو روز اس الف لیلائی کوارٹر کے فراخ برآمدے میں کھیلا جاتا تھا ۔ جب بھی وہ وہاں جاتا تو اس کے گرد اِک بھیڑ لگ جاتی ۔ لڑکیاں ہنس ہنس کر اس کی

توجہ اپنانے کی کوشش کرتیں ۔ ڈالی کے گالوں کے گڑھے بھنور بن جاتے ۔ ننّھی ہاتھ چلا چلا کر اپنے سڈول بازوؤں کی نمائش کرتی ۔ سمیرا خاموش مسکراہٹ اور نیلگوں آنکھوں سے اسے جذب کر لیتی ۔ جانی اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ۔ جیک اس کے قدموں میں بیٹھ کر دم ہلاتا اور مسز ڈیوڈ کی وہ ننگی نگاہ ، وہ بھبھاکا ، جو روز بہ روز اُسے قریب کھینچے آنے پر مجبور کئے جا رہا تھا ۔

صمد کو اس پر اسرار قرب کے احساس سے دلچسپی نہ تھی ۔ اُلٹا وہ تو کشش محسوس کرنے کے باوجود اس سے خائف تھا ۔ اس کے باوجود اگر وہ وہاں جاتا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ڈیوڈ خاندان سے واقفیت کے بعد اس نے محسوس کیا تھا جیسے وہ دفعتاً ویرانے سے نکل کر آبادی میں آگیا ہو ۔ فرشتوں کی نگری سے نکل کر انسانوں کی بستی میں آ پہنچا ہو ۔ جہاں نہ کوئی باپ تھا اور نہ بیٹا ۔ نہ کوئی بزرگ تھا اور نہ چھوٹا ۔ جہاں سب انسان تھے ۔ دوست ۔ فرد تھے ۔ جہاں باپ بیٹے کا سگرٹ سلگاتا تھا ۔ بیٹی ماں کے حسن کا تذکرہ کرتی تھی ۔ جوان کزن ماں کے پاس کھڑا ہو کر حریصانہ نگاہوں سے اس کی بیٹی کو دیکھتا تھا ۔ کتنی آزادی تھی وہاں ۔ کتنی رنگین اور حسین تھی زندگی ۔

آزادی کے اس دھارے نے صمد کو کھینچ لیا ۔ اُس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس انوکھی لذّت سے مدہوش ہو کر بہنے لگا ۔ اور بہتے بہتے اس دلدل میں جا پھنسا جو آزادی کے دھارے کا واحد خطرہ ہے ۔ فاصلے کو ردّ کرنے والی وہ تاریک کرن اس کے قریب ہوتی گئی ۔ اور قریب اور قریب ۔ حتّٰی کہ ایک روز وہ اس کے پہلو سے طلوع ہو گئی اور پھر چاروں طرف شنگرفی چھینٹے اڑنے لگے اور ایک خونیں دھندلکے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ۔

مسز ڈیوڈ کا قرب حاصل کرنے کے بعد وہ نمازیں پڑھنے والا بوڑھا بالکل ہی بے معنی ہو کر رہ گیا ۔ یہی نہیں ۔ وہ بڑھیا جس نے اپنی جوانی نمازوں کی بھینٹ چڑھا دی تھی ۔ وہ بھی اس کے ذہن سے اُتر گئی ۔ اور وہ گھر جس میں اُس نے پرورش پائی تھی بالکل ویرانہ ہو کر رہ گیا ۔

مانا کہ حقائق کا احاطہ عام طور پر مشاہدے اور مطالعہ سے ہوتا ہے لیکن

گاہے گاہے وہ "انا" کی عمیق ترین گہرائیوں سے چنگاری کی طرح اڑتا ہے ذہن میں ایک روشنی سے جھلکتی ہے ۔ جس کے زیر اثر انسان جزیرے کے گرد گھومے بغیر محسوس کرتا ہے کہ وہ خطۂ زمین میں جزیرہ ہے ۔

نبی بخش نے بھی مصلّے پر کھڑے کھڑے محسوس کیا کہ صمد دُور چلا گیا ہے ۔ ان کا یہ احساس شدید تر ہوتا گیا ۔ اس کے بعد انہوں نے نیم چھتی سے اترنا چھوڑ دیا تاکہ صمد کے سامنے جانے کا موقعہ ہی نہ ملے اور اگر کبھی کبھار باپ بیٹے کا آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ جھکا لیتے جیسے اس سے شرمسار ہوں ۔ پھر یہ احساسِ شرمساری گویا ان کی چھاتی پر بیٹھ گیا اور ان کی چھاتی کھانسی سے بجنے لگی ۔ ان کی ٹانگیں لرزنے لگیں ۔ کمر دوہری ہو گئی گویا ٹوٹ گئی ہو ۔

اِدھر صمد کی ماں نے محسوس کیا کہ صمد زندگی کی شاہراہ پر جا نکلا ہے ۔ اس روز جب وہ آزادی کے دھارے میں بہتا پہلی مرتبہ اس جزیرے سے ٹکرایا تھا ۔ اس روز ماں نے اس کی طرف دیکھا اور بولی ۔ "صمد تو" اور پھر وہ دانتوں میں انگلی دبا کر بیٹھ گئی ۔

اسے دانتوں میں انگلی دبائے بیٹھا دیکھ کر نبی بخش ہنس پڑے اور کھانستے ہوئے بولے "اب انگلیاں کاٹنے سے کیا فائدہ ۔" وہ پہلا روز تھا کہ صمد کی ماں میاں کی بات سُن کر خاموش بیٹھی رہی تھی ۔ صمد کی ماں ، وہ بولے ۔ اب صمد کی شادی کر دو چاہے کچھ بھی ہو ۔ ہمارے سر سے یہ فرض اتر جائے ۔ تم اس سے بات تو کرو ۔"

انہیں دنوں حالات نے پھر پلٹا کھایا اور تار کے ذریعہ مسٹر ڈیوڈ کی تبدیلی ہو گئی اور دو دن کے اندر اندر ڈیوڈ خاندان وہ شہر چھوڑ کر چلا گیا ۔ صمد کا خیال تھا کہ مسز ڈیوڈ اس سے جدا ہوتے آبدیدہ ہو جائے گی ۔ مگر آبدیدہ ہونا ڈیوڈ فیملی کا مسلک نہ تھا ۔ وہ سب جینے اور ہنسنے کے شیدائی تھے ۔ وہ ہر بات پر ہنسنے کے عادی تھے ۔ اس کے علاوہ اس دوران میں ایک اور اجنبی نوجوان مسٹر سعید مسز ڈیوڈ کو سینما سے گھر تک لا چکا تھا ۔

صمد ان کے جانے پر پہلے تو بہت سٹ پٹایا پھر وہ مسز ڈیوڈ کے قدموں

پر سر رکھ کر دیر تک پُھوٹ پھوٹ کر روتا رہا ۔ اور وہ اسے تھپک تھپک کر یوں دلاسا دیتی رہی ۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو ۔ ان کے جانے کے بعد ایک بار پھر منظر بدلا اور زندہ تصاویر سے محروم ہو کر اسے پھر سے پردۂ سیمیں کا سہارا لینا پڑا ۔ لیکن اب وہ تصویریں اسے بے معنی دکھائی دیتی تھیں ۔ اگر ان میں کوئی جاذبیت تھی تو صرف اس لئے کہ وہ اسے بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلاتی تھیں ۔

ایک دن ماں نے صمد سے بیاہ کی بات چھیڑ دی ۔ "اب تمہارا امتحان بھی ہو چکا صمد ۔" وہ بولی ۔ "اب تیری شادی کا فرض ہمارے سر سے اُتر جائے ہماری زندگی کا کیا بھروسہ ہے بیٹا ۔"

جواب میں صمد نے غصے بھری نگاہ ماں پر ڈالی مگر منہ سے کچھ نہ بولا ۔

اس کے دو روز کے بعد ماں کی چیخ سُن کر جب وہ دوڑا دوڑا نیم چھتی میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے والد بیہوش پڑے ہیں اور ماں پلنگ کا پایہ پکڑے دیوانوں کی طرح انکی طرف دیکھ رہی ہے ۔

نبی بخش کی اس ناگاہ بیماری پر محلے کے لوگ جمع ہو گئے ۔ ڈاکٹر حکیم بلائے گئے ۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد سر جھکا لیا ۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھنے کے بعد مرض کی بات کرنے کی بجائے اعمال حسنہ کے متعلق مسائل چھیڑ دیئے ۔ دو گھنٹے کے بعد نبی بخش نے آنکھ کھولی ۔ آنکھ کھولتے ہی انہوں نے صمد کو بلا کر پاس بٹھا لیا پھر قدیر علی کو جلدی کرنے کا اشارہ کیا اور وہ روتے ہوئے باہر نکل گئے ۔

جب وہ واپس لوٹے تو ان کے ساتھ برقعہ میں لپٹی ہوئی ان کی بیٹی فرحت تھی ۔ انہیں دیکھ کر نبی بخش نے اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گئے ۔

"بیٹا" انہوں نے رُک رُک کر بڑی تکلیف سے کہا ۔ "میری آخری خواہش ہے ۔" نقاہت کی وجہ سے وہ خاموش ہو گئے اور مولوی تمیزالدین کو اشارہ کیا ۔ پیشتر اس کے کہ صمد کی سمجھ میں کوئی بات آتی یا وہ کوئی جواب دیتا ۔ مولوی صاحب نے نکاح خوانی شروع کر دی ۔

نکاح کی مختصر رسم کے بعد نبی بخش کی حالت اور بھی بگڑ گئی اور شام سے

پہلے ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں ۔

میاں کے انتقال پر صمد کی ماں پُھوٹ پُھوٹ کر روئی ۔ جوانی تو شوہر کی نمازوں کی بھینٹ چڑھ گئی تھی ۔ اب رہی سہی زندگی ان کی موت کی وجہ سے تباہ ہو گئی ۔

باپ کی موت کے بعد صمد کی تمام تر توجہ تلاش معاش پر مرکوز ہو کر رہ گئی اور وہ نوکری کے لئے مارا مارا پھرنے لگا ۔ ماں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی ۔ لیکن صمد کے اسرار پر وہ چند روز کے لئے نیشاپور جانے پر رضا مند ہو گئی ۔ اور وہ سب نیشاپور پہنچ گئے ۔ یہاں اسے مل کے بی کلاس کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر مل گیا ۔

اس کی ماں اور بہنوں نے صرف چند روز صمد کے پاس قیام کیا ۔ پھر وہ واپس آگئیں ۔ "نیشاپور کیا دور ہے بیٹا ۔" ماں نے الوداع کہتے ہوئے اُسے تسلّی دی ۔ "جب جی چاہے گا آ کر تجھ سے مل جایا کریں گی تو گھبرا نہیں ۔"

ماں کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ صمد نے محسوس کیا کہ وہ اس کا اپنا گھر تھا اور فرحت اس کی اپنی بیوی اور اس کے دل میں اپنے گھر کو سنوارنے اور سجانے کا جذبہ جو اب تک دل میں دبا پڑا تھا عود کر آیا ۔

صمد کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کا گھر پردۂ سیمیں کے گھروں کا سا ہو اور اس کے گھر میں وہی زندگی اور ہما ہمی رہے ۔ جو مسز ڈیوڈ کے برآمدے میں ہوتی تھی ۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کی اپنی بیوی ہنس ہنس کر آنکھیں مٹکائے اور دو چوٹیاں سارے گھر میں اڑتی رہیں ۔ اس کے گالوں میں بھی لزا کے سے گڑھے پڑے رہیں اور وہ بھی اس نگاہ سے دیکھے جو فاصلے کو ردّ کر دیتی ہے اور پہلی تنخواہ مِلتے ہی صمد نے پاؤڈر ، سُرخی ، صابون ، کاجل ، سکارا اور جانے کن کن چیزوں کا فرحت کے سامنے لا کر ڈھیر لگا دیا ۔ فرحت یہ سکارا ہے ۔ مژگاں پر لگانے کا لوشن ، یہ بلیک سٹک بھویں بنانے کے لئے ہے ۔ اس شانپو سے بال دھوئے جاتے ہیں ۔ یہ کریم ۔ چہرے پر نہیں ملا کرتے ۔ یہ سلیپر نہ پہنو اِس طرح پاؤں فلیٹ ہو جائیں گے اور یہ برقعہ لاحول ولاقوت ۔

چھوڑو اس حماقت کو اور یہ قمیض بالکل بیکار ہے ۔ مَیں تمہیں فراک پہناؤں گا اور غرارہ تو تمہیں بہت اچھا لگے گا ۔ اب دیکھو میری طرف ۔ اونہوں ڈارلنگ یوں نہیں "مجھے نہیں آتا ۔" فرحت ہنس کر کہتی ۔

دراصل فرحت کو سبھی کچھ آتا تھا ۔ اسے ہنسنا بھی آتا تھا ۔ آنکھیں مٹکانا بھی آتا تھا اور وہ نگاہ ِوہ اس نگاہ کو بھی جانتی تھی ۔ اگرچہ وہ گاؤں میں پلی تھی ۔ اگرچہ وہ قدیر علی زمیندار کی بیٹی تھی ۔ لیکن ازلی طور پر اس میں وہ چنگاری موجود تھی جو آگ لگا سکتی ہے ازلی طور پر اس کی نسائیت میں دہار موجود تھی ۔ لیکن ماحول ، حیا اور احساسِ ناموس نے اس پر ایک دبیز پردہ ڈال رکھا تھا ۔ وہ سمجھتی تھی کہ خاوند حیا کو سب سے بڑا وصف سمجھتے ہیں ۔ اِس لئے وہ اِس چنگاری کو دبائے بیٹھی رہتی اور اس کی دھار سے خود زخمی ہونے کے باوجود اُف کئے بغیر آنکھیں جھکا لیتی ۔ دراصل اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ صمد سچ کہہ رہا ہے وہ اُسے مذاق سمجھتی رہی ۔ بلکہ اُلٹا اس کی جھجک اور بڑھ گئی ۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس کا خاوند پردۂ سیمیں پر پل کر جوان ہوا ہے ۔

صمد نے سب سے پہلے فرحت کا پردہ اتروایا ۔ پھر اُس نے اپنے دوستوں کو باری باری گھر بلایا تا کہ ان کا اپنی بیوی سے تعارف کروائے ۔ پھر وہ اُسے بازار شاپنگ کے لئے لے گیا ۔ شام کو وہ دونوں اکٹھے سیر کرنے کے لئے جاتے اور واپسی پر کسی نہ کسی دوست کو وزٹ کرتے یا سینما چلے جاتے ۔

ہال میں بیٹھے ہوئے صمد کا جی چاہتا کہ فرحت کی آنکھ کے کونے سے وہی تاریک شعاع نکل کر اسے کریدے اور اندھیرے میں اس کا گرم ہاتھ بڑھ کر صمد کا ہاتھ پکڑ لے اور گونگی زبان میں وہی باتیں دہرائے جو مسز ڈیوڈ کا ہاتھ کیا کرتا تھا ۔ دراصل صمد اس جائز تعلق سے ناجائز تعلق کی لذّت حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ لیکن فرحت اس اہم تفصیل سے واقف نہ ہوئی ۔ اِس لئے وہ برقعہ اتارنے کے باوجود آنکھیں جھکاکے چلتی رہی اور صمد کے دوستوں سے ملنے کے باوجود اس نے انہیں قرب کا احساس نہ دیا ۔ اور سینما ہال میں بیٹھنے کےباوجود اس کا انداز گھریلو ہی رہا ۔ اس کے دل میں تحریک تو ہوتی مگر وہ اسے دبا دیتی اور اپنی آگ میں

آپ ہی جلتی رہتی ۔

کچھ مدت تو صمد کو امید رہی کہ فرحت وہی بن جائے گی جو وہ اسے بنانا چاہتا تھا لیکن پھر وہ مایوس ہونے لگا ۔ اور ایک روز مایوسی اس قدر مسلّط ہو گئی کہ وہ گھر سے نکل بھاگا ۔ اور اپنی مایوسی بھولنے کے لئے اکیلا سینما ہال میں جا بیٹھا ۔ اتفاق سے اس روز مسز جوزف بھی اپنے خاوند کی بے وفائی بھولنے وہاں آئی ہوئی تھیں ۔ اگرچہ مسز جوزف کا رنگ سانولا اور نقوش عامیانہ تھے ۔ لیکن وہ ابھی جوان تھی ۔ اُس کی آنکھ کی سیاہ کرن دھنس جانے والی تھی ۔ اس کی مسکراہٹ اثبات آلود تھی ۔ اور اُس کے ہاتھ بے حد گرم تھے ۔

صمد کو ایک بار پھر گویا مسز ڈیوڈ مل گئی ۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسز جوزف گھر میں اکیلی رہتی تھیں اور مسٹر جوزف اپنے مشاغل کے باوجود بیگم کو اکیلے میں کسی سے مِلنے کی اجازت نہیں دیتے تھے ۔ یہ اور بھی خوب تھا کیونکہ اس طرح ان کے تعلق میں چوری چھپے کی کلی لگنے سے مزید دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ رات کے اندھیرے میں ملنے لگے ۔

مسٹر جوزف بھی صمد کی طرح اس مِل میں سپروائزر تھے اور اسی بلاک میں ان کا مکان دوسرے سِرے پر واقع تھا ۔ اِس بلاک کے تمام فلیٹ بالکل ایک سے بنے ہوئے تھے اور چونکہ کمپنی نے انہیں فرنش کیا تھا اِس لئے ان مکانات کا سازوسامان بھی بالکل ایک سا تھا ۔ یہ فلیٹ دوسری منزل پر تھے ۔ پہلی منزل میں مِل کے سٹور تھے جو ہمیشہ بند رہتے تھے ۔ فلیٹ کی سیڑھیاں باغیچے کے سامنے سے اوپر کو جاتی تھیں ۔ اور اوپر ہر فلیٹ میں ایک ڈرائنگ روم ، بیڈ روم ، کچن ، صحن ، برآمدہ ، باتھ روم اور ایک چھوٹا سا گسٹ روم تھا ۔ اِس چھوٹے کمرے سے براہِ راست بغلی سیڑھیاں نیچے اُترتی تھیں ۔ جو ایک مختصر سی ڈیوڑھی کے باہر باغیچے کی طرف کھُلتی تھی ۔ تاکہ مہمانوں کی آمدورفت گھر والوں کے لئے باعث دقت نہ ہو ۔ جب مسٹر جوزف کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی تو صمد کو مسز جوزف کا پیغام مِل جاتا ۔ گسٹ روم کی بغلی سیڑھیوں کا نچلا دروازہ کھلا رکھا جاتا تاکہ صمد چپکے سے ادھر سے داخل ہو کر اپنی محبوبہ سے جا ملے جو آدھی رات تک

اس کے انتظار میں بیٹھی نٹنگ کرتی رہتی تھی ۔

ملاقات کا یہ انتظام نہایت تسلّی بخش تھا ۔ اگر کبھی مسٹر جوزف ناگاہ آبھی جاتے تو کال بیل بجتے ہی صمد چپکے سے دبے پاؤں بغلی راستے سے نیچے اُتر آتا اور بیگم گھبراہٹ کے بغیر دروازہ کھولتے ہوئے مسکرا کر استقبال کرتی ۔

پھر کچھ دیر کے بعد وہ اس قدر نڈر ہو گئے کہ ملاقات کے بعد وہ دونوں اسی بستر پر سو جاتے ۔ حتّٰی کہ صبح سویرے جوزف کال بیل بجاتا ۔ مسز جوزف گھنٹی سُن کر اُٹھ بیٹھتی ۔ "وہ مل سے آگئے ۔" وہ کہتی اور صمد جلدی سے پھدک کر اُٹھ بیٹھتا اور چپکے سے بغلی زینے سے نیچے اتر جاتا اور مسز جوزف میاں کے لئے دروازہ کھول دیتی ۔

فرحت کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ صمد اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے مگر وہ خاموش رہی جب خاوند راتیں گھر سے باہر گذارنی شروع کر دے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور جب بات واضح ہو جائے تو پھر بات کرنے کا فائدہ ۔

صمد کو بھی مل میں نائٹ ڈیوٹی دینی پڑتی تھی ۔ نائٹ ڈیوٹی کے دوران میں اسے راتیں مل میں گذارنی پڑتیں ۔ لیکن اب دن کی ڈیوٹی کے دوران میں بھی وہ راتیں باہر ہی کاٹتا اور ڈبل ڈیوٹی یا سینما کا بہانہ بنا دیتا ۔ مگر فرحت عورت تھی ۔ اور اس قسم کے بہانے عورت سے نہیں چلتے ۔

صمد کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر فرحت نے پہلی مرتبہ شدّت سے محسوس کیا کہ اس کا اپنا ضبط جسے وہ وصف سمجھی تھی ۔ اس کی تباہی کا باعث ہوا ہے ۔ یہ محسوس کر کے دفعتاً وہ چھلکنے لگی ۔ اور اس نے وہ دبا ہوا شعلہ عریاں کر دیا ۔

لیکن بات ہاتھ سے نکل چکی تھی ۔ فرحت نے سنگار ، لباس اور عریانی سب آزما دیکھا ۔ لیکن وہ صمد کو واپس نہ لا سکی پھر اس کے دل میں ایک خوفناک عزم پیدا ہوگیا ۔ چھ مہینے گزر گئے ۔

کال بیل زور سے بجی ۔ وہ دونوں جاگ پڑے ۔ اندھیرے میں قریب سے وہ بولی ۔ "وہ دفتر سے آگئے ۔" حسبِ معمول صمد پھدک کر اٹھا ۔ چمٹ کر الوداعی بوسہ لیا ۔ اور پھر چپکے سے ملحقہ کمرے میں داخل ہوگیا ۔ اور حسب

معمول اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا بغلی زینے سے نیچے پہنچا ۔ بیرونی دروازہ آہستہ سے کھولا اور باہر نکل گیا ۔

ٹارچ کی روشنی صمد پر پڑی ۔ دو سائے اس کی طرف بڑھے ۔ گھبرا کر وہ پیچھے ہٹا ۔

"اے ہے" اس کی ماں چلّائی ۔ کب سے ہم اللہ ماری یہ تمہاری گھنٹی بجا رہی ہیں ۔ تم دونوں گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے ہو ۔ "اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیا دیکھ رہا ہے ۔ چل نا اوپر ۔ ہمیں تو ریل کے سفر نے چُور کر دیا چل ۔"

ٹارچ کی روشنی صدر دروازے پر پڑی ۔

اپنی نیم پلیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں ۔ گھپ اندھیرا اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا ۔ پھر ایک بھیانک خاموشی ۔ وہ اب وہیں بیٹھا ہے ۔

کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے ۔ کیوں وہاں بیٹھا ہے اور اس فلیٹ کو پردۂ سیمیں سمجھنے پر کیوں مصر ہے ۔ البتہ دور ۔ اس بدنام چوبارے کی کھڑکی سے وہ مٹیار عورت اس دیوانے کی طرف دیکھ کر یوں تحقیر سے ہونٹ نکال دیتی ہے جیسے وہ اس کے راز سے واقف ہو ۔

.... O ....

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور ۔ باہتمام عبدالسّلام پرنٹر اور پبلشر